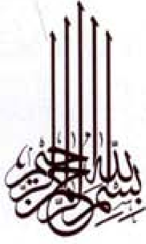


دُنیا اور
اس کی حقیقت

ہارُون یحییٰ

اسلامک ریسرچ سینٹر
پاکستان



دُنیا اور اس کی حقیقت

وَ مَا الْحَیٰوۃُ الدُّنْیَآ اِلَّا لَعِبٌ وَّ لَھْوٌ ط
وَلَلدَّارُ الْاٰخِرَۃُ خَیْرٌ لِّلَّذِیْنَ یَتَّقُوْنَ ط اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ o

دنیا کی زندگی تو ایک کھیل اور ایک تماشا ہے۔ حقیقت میں آخرت ہی کا مقام اُن لوگوں کیلئے بہتر ہے جو زیاں کاری سے بچنا چاہتے ہیں۔ پھر کیا تم لوگ عقل سے کام نہ لوگے؟ (سورۃ الانعام:32)

دُنیا اور اس کی حقیقت

مصنّف : ہارُون یحییٰ
مترجم : ڈاکٹر تصدق حسین راجا
نظرثانی : سعود عثمانی

اسلامک ریسرچ سینٹر۔ پاکستان

دُنیا اور اس کی حقیقت

اشاعت اوّل: جمادی الاولی ۱۴۲۳ھ اگست ۲۰۰۲ء
باہتمام : اشرف برادران سلّمہم الرحمٰن
قیمت : -/۴۳۵ روپے



واحد تقسیم کار ادارۂ اسلامیات
☆ دینا ناتھ مینشن، مال روڈ، لاہور۔
فون: ۷۳۵۳۲۵۵۔ ۷۲۴۴۲۱۲ فیکس: ۹۲-۴۲-۷۳۲۴۷۸۵
☆ ۱۹۰۔ انار کلی، لاہور۔
فون: ۷۳۵۳۲۵۵-۷۲۴۳۹۹۱
☆ موہن روڈ چوک اُردو بازار کراچی۔
فون: ۷۷۲۲۴۰۱
E-mail: idara@brain.net.pk
E-mail: islamiat@lcci.org.pk

ملنے کے پتے
ادارۃ المعارف، دار العلوم، کراچی نمبر ۱۴
مکتبہ دار العلوم، دار العلوم، کراچی نمبر ۱۴
دار الاشاعت، اُردو بازار کراچی نمبر ۱
بیت القرآن، اُردو بازار، کراچی نمبر ۱
بیت العلوم، نابھہ روڈ، انار کلی، لاہور۔

کچھ مصنف کے بارے میں

اس کتاب کے مصنف نے اپنے قلمی نام ہارون یحییٰ کے استعمال کے ساتھ بہت سی سیاسی اور مذہبی کتب لکھیں جو زیور طباعت سے آراستہ ہو کر قارئین تک پہنچ چکی ہیں۔ اس کا زیادہ کام اس مادہ پرستانہ عالمی نقطۂ نظر سے متعلق ہے جو عالمی تاریخ وسیاسیات پر اثر انداز ہوا ہے۔ (اس قلمی نام کی تشکیل دو ناموں کو ملا کر ہوئی ہے ''ہارون'' (Aaron) اور ''یحییٰ'' (John)۔ یہ دونوں نام ان دو پیغمبرانِ خدا کی یاد تازہ کرتے ہیں جنہوں نے کفر وشرک کے خلاف جنگ لڑی)۔

ہارون یحییٰ کی دیگر تصانیف میں ''یہودیت اور فری میسنری''۔ ''فری میسنری اور سرمایہ داری'' ''ابلیس کا مذہب: فری میسنری''۔ ''یہوداہ کے بیٹے اور فری میسنز''۔ ''نیا میسنی نظام'' ''بوسنیا میں خفیہ ہاتھ''۔ ''مکمل تباہی کا جھانسہ''۔ ''دہشت گردی کے واقعات کے پیچھے''۔ ''اسرائیل ......ایک کردی پتا''۔ ''ترکی کے لئے قومی حکمت عملی''۔ ''تباہ شدہ اقوام''۔ ''عقل والوں کے لئے''۔ ''خلیہ۔ ایک نشانی''۔ ''نظام مامونیت۔ ایک نشانی''۔ ''انسانی آنکھ۔ ایک نشانی''۔ ''مکڑی۔ ایک نشانی''۔ ''مچھر۔ ایک نشانی''۔ ''چیونٹی۔ ایک نشانی''۔ ''حیات دنیا کی حقیقت''۔

مصنف نے کچھ کتابچے بھی لکھے جن کے نام یہ ہیں:

''رازہائے ایٹم''۔ ''نظریۂ ارتقاء کی موت''۔ ''حقیقت تخلیق''۔ ''مادے کی موت''۔ ''ارتقاء پسندوں کی فاش غلطیاں اوّل''۔ ''ارتقاء پسندوں کی فاش غلطیاں دوئم''۔ ''ارتقاء کی خورد حیاتیاتی موت''۔ ''نظریۂ ارتقاء کی موت بیس سوالات میں''۔ ''ڈارونیت: تاریخ حیاتیات میں سب سے بڑا فریب''۔

مصنف کے دیگر تصنیفی کام کے قرآنی موضوعات درج ذیل ہیں:

''سچائی کے بارے میں جو کبھی سوچا گیا''۔ ''اللہ کے لئے وقف''۔ ''جہالت کے معاشرے سے ترک تعلق''۔ ''جنت''۔ ''نظریۂ ارتقاء''۔ ''قرآن اور اخلاق حسنہ پر مبنی اقدار''۔ ''قرآنی علم''۔ ''قرآن کا اشاریہ''۔ ''اللہ کی خاطر ہجرت''۔ ''قرآن اور منافقین کا کردار''۔ ''منافقین کے راز''۔ ''اللہ کی صفات''۔ ''قرآن میں پیغام کی ترسیل اور اس پر حجت''۔ ''قرآن کے اساسی نظریات''۔ ''قرآن کی روشنی میں جوابات''۔ ''حیات بعد از ممات اور جہنم''۔ ''پیغمبروں کی جدوجہد''۔ ''انسان کا کھلا دشمن: ابلیس''۔ ''بت پرستی''۔ ''جاہل کا مذہب''۔ ''ابلیس کا غرور وتکبر''۔ ''قرآن اور نماز''۔ ''قرآن اور انسان کا باطن''۔ ''یوم حشر''۔ ''مت بھولئے''۔ ''قرآن کے فیصلے جو نظر انداز کئے گئے''۔

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ط

جو تتلیوں کے پروں پر بھی پھول کاڑھتا ہے
یہ لوگ کہتے ہیں اس کی کوئی نشانی نہیں

عہدِ موجود خواب اور خبر کی یکجائی کا بلکہ صحیح تر معنوں میں انسان کی بے خبری کے اعتراف کا دور ہے۔ بیسویں صدی اور بالخصوص اس کے آخری ربع میں انسان کی تیز رفتار علمی پیش قدمی اور وسیع ہوتی ہوئی معلومات نے انسان کی لاعلمی کو مزید اجاگر کر دیا ہے۔ گزرتا ہوا ہر پل ان کڑیوں کو باہم مربوط کر رہا ہے جو ایک عظیم ڈیزائنر اور لازوال خالق کی نشان دہی کرتی ہیں۔ ایک عظیم معمے (JIGSAW PUZZLE) کی طرح معلومات کے ٹکڑے اس تصویر میں اپنی اپنی جگہ تیزی سے بیٹھ رہے ہیں جو خاک کے حقیر ترین ذرّے کے باطن سے لے کر کہکشاؤں کے پیچیدہ نظام تک کو محیط ہے۔ جدید ترین سائنسی اکتشافات وایجادات ہر آن خالق کائنات کی نشانیوں کو انسان کے سامنے پیش کر رہی ہیں۔ کھلتی ہوئی ہر پرت اور اترتا ہوا ہر غلاف اس بات کا اعلان کرتا ہے کہ یہ بے مثال نظام اس سے کہیں عمیق اور کہیں پیچیدہ ہے جتنا انسان ابتدا سے سمجھتا تھا۔ اس حیرت سرا میں کھلنے والا ہر دروازہ ایک نئے جہان کی خبر دیتا ہے اور اس اعتراف کے بنا کوئی چارہ نہیں کہ انسان ابھی اس جہان کی صرف دہلیز پر کھڑا ہے۔

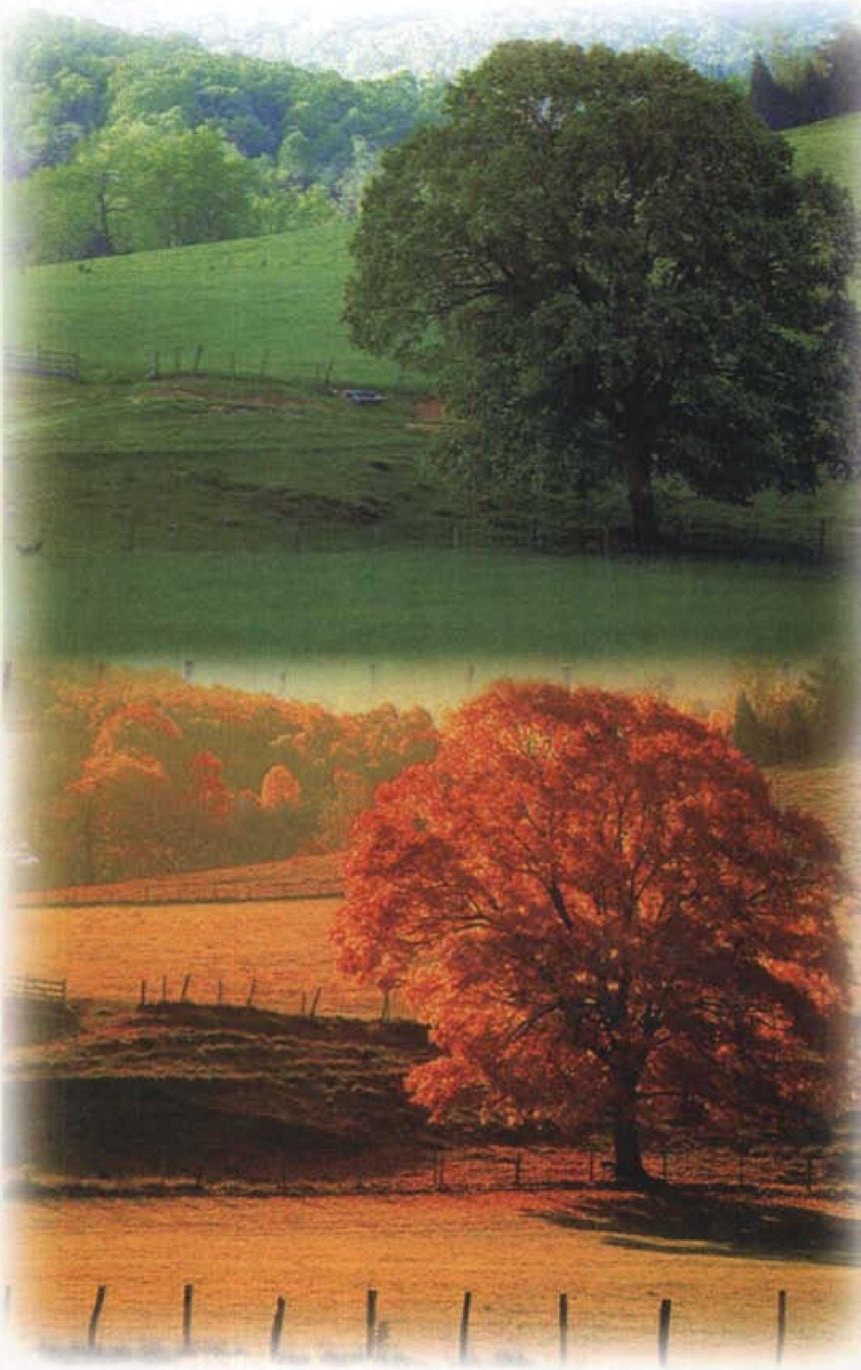
"دُنیا اور اس کی حقیقت" (The Truth of the Life of this World) اسی حیرت سرا کی طرف کھلنے والا ایک دریچہ ہے۔ اپنے موضوع پر یہ انتہائی خوبصورت اور بے مثل کتاب ہمارے ادارے سے شائع ہونے والی ہارون یحییٰ کی پانچویں کتاب ہے۔ اردو زبان میں ان موضوعات پر جو کام اب تک ہوا تھا وہ یا تو ان حضرات کی تحریروں پر مبنی تھا جو سائنسی علوم سے براہ راست استفادہ نہیں کر سکتے تھے یا سائنس کے ان معتقدات پر مشتمل تھا جنہیں خود سائنس چھوڑ کر یا ان کی بنیاد پر عمارت استوار

کر کے آگے بڑھ چکی ہے۔ ایسے میں ہارون یحییٰ کی یہ تصانیف اسلامی کتب کی دنیا میں ایسا وقیع اضافہ ہیں جن کی مثال کم از کم اردو ذخیرے میں دستیاب نہیں ہے۔ ان کتب کی خصوصیات میں مصنف کا مضبوط عقیدہ، طریقہء استدلال، جدید ترین علوم تک رسائی اور پر تاثیر اندازِ بیان وہ عناصر ہیں جنہوں نے ان کتب کو غیر معمولی حیثیت دے دی ہے۔

ہمیں خوشی ہے کہ مصنف کی جانب سے خصوصی اجازت کے بعد ہمیں ان کتب کے اردو، انگریزی ایڈیشن پاکستان میں طبع کرنے کی سعادت حاصل ہو رہی ہے۔ ہماری بھرپور کوشش رہی ہے کہ یہ کتب بین الاقوامی معیار طباعت پر شائع کی جا سکیں اور الحمدللہ ترجمے، کاغذ، طباعت اور جلد بندی کے شعبوں میں یہ کاوش نمایاں طور پر کامیاب نظر آتی ہے۔ یہ معیار اسلامی کتب میں پہلی بار حاصل کیا گیا ہے اور ہمیں اس میدان میں اوّلیت کا شرف حاصل کرنے کی بے حد مسرت ہے۔ ان کتب میں جدید طرزِ تفہیم اور موضوع کے تقاضوں کو مدنظر رکھتے ہوئے مصنف نے جابجا تصویروں، نقشوں اور خاکوں کے ذریعے بات واضح کی ہے۔ یہ انداز یقیناً موضوع تک کامل رسائی میں مفید اور مددگار ہوتا ہے۔ ان تصاویر وغیرہ میں سے جو بے جان اشیاء پر مشتمل ہیں، ان سب کو موجودہ اردو ایڈیشن میں برقرار رکھا گیا ہے۔ دیگر تصاویر وغیرہ کے بارے میں کئی ایک صاحب الرّائے حضرات سے متعدّد بار مشوروں کے بعد یہ صورت اختیار کی گئی ہے کہ جو تصاویر ناگزیر نہیں تھیں (مثلاً سائنس دانوں کی تصاویر) انہیں شامل نہیں کیا گیا اور جن تصاویر کے بارے میں یہ محسوس ہوا کہ ان کی عدم موجودگی میں کتاب کی افادیت متاثر ہوگی اور بات سمجھنے میں مشکل پیش آئے گی انہیں شامل رکھا گیا۔ چونکہ اس کا مقصد صرف حقائق کو درست طور پر سمجھنا اور سمجھانا ہے اس لئے امید ہے کہ اسے اسی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے گا۔

ہماری دلی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مصنف، مترجم اور ناشرین کی اس کوشش کو قبول اور مقبول فرمائے اور اس میں موجود کوتاہیوں سے درگزر فرمائے۔ آمین

ناشرین



فہرست

تعارف



یہ خاتون اب ستر کی دہائی میں داخل ہو چکی ہے۔ کیا آپ نے کبھی اس بات پر غور کیا ہے کہ کوئی شخص اس کی زندگی کے بارے میں اسکی عمر سے کس طرح اندازہ لگا سکتا ہے؟

اگر اس خاتون کو اپنی زندگی کے بارے میں کوئی بات یاد ہے تو یقیناً یہ کہا جا سکے گا کہ یہ زندگی تو بس "عارضی زندگی" تھی۔ بہت جلد گزر جانے والی زندگی......

وہ تو اسی قدر کہہ سکے گی کہ اس کی زندگی "طویل" نہیں تھی جیسا کہ وہ اوائل عمر میں سمجھتی تھی۔ غالباً یہ تو اس نے کبھی سوچا ہی نہ تھا کہ ایک روز وہ اتنی بوڑھی ہو جائے گی۔ مگر اب یہ حقیقت اس پر واضح ہو چکی ہے کہ اس کی زندگی کے ستر برس پیچھے رہ گئے ہیں۔ زندگی کے ابتدائی ایام میں تو غالباً اس نے یہ کبھی خیال نہ کیا تھا کہ اس کی جوانی اور جوانی کی آرزوئیں اسقدر تیزی سے گزر جائیں گی۔

اگر اس خاتون سے بڑھاپے کے دنوں میں کہا جائے کہ وہ اپنی داستانِ زندگی سنائے تو طویل زندگی کی یادوں کا تذکرہ پانچ چھ گھنٹوں کی گفتگو سے زیادہ نہ ہوگا۔ جسے وہ "ستر سالہ طویل زندگی" کہتی ہے اس سے جو یادوں کی صورت بچ گیا ہے وہ یہی کچھ نکلے گا۔

انسانی ذہن میں جو عمر کے ساتھ ساتھ تھکا ماندہ محسوس کرنے لگتا ہے بہت سے سوالات اُبھرتے ہیں۔ یہ سب کے سب اہم سوالات ہوتے ہیں جن پر غور کیا جانا چاہئے اور زندگی کے تمام پہلوؤں کو سمجھنے کیلئے ان کا صحیح صحیح جواب دینا لازمی ہو جاتا ہے۔ مثلاً یہ سوال کہ "یہ زندگی جو اسقدر تیزی کے ساتھ گزر جاتی ہے اس کا مقصد کیا ہے؟ عمر سے متعلق مجھے جتنے مسائل بھی درپیش

ہیں، میں ان کے ساتھ مثبت کیوں رہوں؟ مستقبل میرے لئے کیا لائے گا؟''

ان سوالات کے ممکنہ جوابات کو دو بڑی قسموں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے؟ وہ جوابات جو اللہ کو ماننے والے انسانوں کی طرف سے دیئے جاتے ہیں اور وہ جو اللہ کو نہ ماننے والوں یعنی کافروں کی طرف سے دیئے جاتے ہیں۔

ایک فرد جو اللہ پر یقین نہیں رکھتا' جواب دے گا: ''میں نے اپنی پوری زندگی بیکار مشاغل کی نذر کر دی۔ میں اپنی عمر کے ستر برس پیچھے چھوڑ آیا ہوں مگر سچ پوچھو تو آج تک میں یہ نہ سمجھ سکا کہ میں کس مقصد کیلئے زندہ رہا۔ جب تک میں بچہ تھا میری زندگی کا مرکز میرے والدین تھے۔ مجھے ان کی محبت اور شفقت میں خوشی و مسرت ملتی تھی۔ پھر جب میں ایک جوان عورت تھی تو میں نے اپنی پوری زندگی شوہر اور بچوں کیلئے وقف کئے رکھی۔ اس دوران میں نے اپنے لئے بہت سے اہداف مقرر کر لئے تھے۔ مگر جس وقت تک میں نے انہیں حاصل کیا ان میں سے ہر ایک گزر جانے والا وہم و خیال ثابت ہوا۔

میں جب اپنی کامیابی پر خوشیاں منا چکی تو میں دوسرے اہداف کی طرف بڑھی اور ان اہداف نے مجھے اسقدر مصروف رکھا کہ میں زندگی کے حقیقی معنوں کے بارے میں سوچ بھی نہ سکی۔ اب جبکہ میری عمر ستر برس ہو چکی ہے اور میں ضعیف العمر ہو گئی ہوں تو میں یہ جاننے کی کوشش کرتی ہوں کہ میری گذشتہ زندگی کا مقصد کیا تھا؟ کیا میں ان لوگوں کیلئے زندہ رہی جن کی آج بڑی مدھم مدھم سی یادیں باقی رہ گئی ہیں؟ کیا میں اپنے والدین کیلئے زندہ رہی؟ کیا میں اپنے شوہر کیلئے زندہ رہی جسے میں مدت ہوئی کھو چکی ہوں؟ یا میں اپنے ان بچوں کیلئے زندہ رہی جن کو آج میں کبھی کبھار دیکھ لیتی ہوں کیونکہ وہ اپنے اپنے بیوی بچوں کے ساتھ زندگی گزار رہے ہیں؟ میں پریشان ہو جاتی ہوں میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا............ صرف ایک ہی واحد سچائی میرے سامنے ہے اور وہ یہ کہ میں اپنے آپ کو موت کے قریب تر پاتی ہوں' جلد ہی ایک روز میں مر جاؤں گی اور پھر میں لوگوں کے ذہنوں میں ایک بھولی بسری یاد بن کر رہ جاؤں گی۔ اسکے بعد کیا ہوگا؟ سچ پوچھو تو میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتی۔ مگر اس کا تصور ہی مجھے خوفزدہ کرنے کیلئے کافی ہے''۔

اس قسم کی مایوسی سے یہ خاتون کیوں دوچار ہوئی اس کا یقیناً ایک سبب ہے۔ ایسا محض اسلئے ہے کہ یہ خاتون نہیں جانتی کہ یہ کائنات' اس میں موجود تمام جاندار اور انسان کوئی نہ کوئی مقصد لئے

پیدا ہوئے ہیں۔ یہ مقاصد اس حقیقت سے پیوستہ ہیں کہ ہر شے کی تخلیق کی گئی ہے ایک دانا وذہین فرد دیکھ سکتا ہے کہ اس لامحدود کائنات کی جزئیات تک میں ایک منصوبہ بندی، کاریگری اور حکمت و دانائی کی جھلک نظر آتی ہے یہ اُسے ایک خالق کائنات پر ایمان لے آنے پر مجبور کر دیتی ہے۔

اس سے وہ یہ نتیجہ بھی اخذ کرتا ہے کہ اس دنیا کے تمام جاندار خود بخود کسی کی سوچی سمجھی تدبیر کے بغیر وجود میں نہیں آ گئے اور یہ سب کے سب کوئی نہ کوئی مقصد پورا کرتے ہیں۔ بنی نوع انسان کے لئے آخری کتاب ہدایت قرآن حکیم کی صورت میں نازل ہوئی، جسمیں اللہ نے ہمیں بار بار وہ مقصد حیات یاد دلایا ہے جسے ہم بھول جاتے ہیں۔ اس سے ہمارے ذہن میں یہ بات واضح ہو جاتی ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہوتا ہے:

وَ هُوَ الَّذِىْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِىْ سِتَّةِ اَيَّامٍ وَّكَانَ عَرْشُهٗ عَلَى الْمَآءِ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ط

''اور وہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دن میں پیدا کیا۔ جب کہ اس سے پہلے اس کا عرش پانی پر تھا۔ تا کہ تم کو آزما کر دیکھے تم میں کون بہتر عمل کرنے والا ہے''۔ (سورۃ ھود: 7)

اس قرآنی آیت سے انسانی زندگی کا مقصد مومنوں کو پوری طرح سمجھ میں آ جاتا ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ اس دنیا کی زندگی میں ان کا خالق و مالک انہیں مختلف آزمائشوں اور امتحانات میں سے گزارتا ہے۔ اس لئے وہ یہ اُمید رکھتے ہیں کہ وہ اپنے پروردگار کی ان آزمائشوں پر پورا اُتر کر جنت حاصل کریں گے اور یوں ان کا اللہ ان پر راضی ہوگا۔

تاہم اس کی مزید وضاحت کے لیے ایک اور بات قابل غور ہے: وہ لوگ جو اللہ کو مانتے ہیں ضروری نہیں کہ وہ اس پر صدقِ دل سے ایمان بھی رکھتے ہوں، وہ اللہ پر یقین نہیں رکھتے۔ آج بہت سے لوگ ایسے ہیں جو یہ تسلیم کرتے ہیں کہ یہ کائنات اللہ نے تخلیق کی ہے، مگر انہوں نے یہ کبھی سوچا نہیں کہ اس حقیقت کا ان کی زندگیوں پر کیا اثر مرتب ہوتا ہے۔ اسی لئے وہ اس طرح زندگی نہیں گزارتے جس طرح ان کو گزارنی چاہئے۔ جس بات کو عموماً یہ لوگ سچائی تصور کرتے ہیں وہ یہ ہے کہ اللہ نے ابتداءً اس کائنات کو تخلیق کیا، مگر پھر وہ یہ یقین کر لیتے ہیں کہ اس خالق کائنات نے اس دنیا کو اس کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا تھا۔ اس غلط فہمی کے بارے میں اللہ نے قرآن حکیم میں یوں ارشاد فرمایا:

وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ ؕ قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ ؕ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ○

''اگر تم ان سے پوچھو کہ آسمانوں اور زمین کو کس نے پیدا کیا ہے؟ تو یہ ضرور کہیں گے کہ اللہ نے۔ کہو الحمدللہ۔ مگر ان میں سے اکثر لوگ جانتے ہیں''۔ (سورۃ لقمٰن:25)

وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَهُمْ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ فَاَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ ○

''اور اگر تم ان سے یہ پوچھو کہ انہیں کس نے پیدا کیا ہے؟ تو یہ خود کہیں گے کہ اللہ نے۔ پھر کہاں سے یہ دھوکہ کھا رہے ہیں؟'' (سورۃ الزخرف:87)

اس غلط فہمی کی وجہ سے لوگ اپنی زندگیوں کو اس حقیقت کے مطابق ڈھال نہیں سکتے کہ ان کا ایک خالق ہے۔ اسی وجہ سے ہر فرد اپنے اپنے ذاتی اصول اور اخلاقی اقدار ایک خاص ثقافت' برادری اور خاندان کے اندر وضع کر لیتا ہے۔ اور پھر تا دم مرگ یہی اصول ''رہنمائے حیات'' کے طور پر ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ جو لوگ اپنی وضع کردہ اقدار سے چمٹے رہتے ہیں انہیں یہ خوش فہمی لاحق رہتی ہے کہ ان کے غلط افعال کی عارضی سی سزا ان کو دوزخ میں مل جائے گی اور پھر وہ اس مختصر سے عذاب کے بعد ہمیشہ کیلئے جنت میں رہیں گے دنیا کی زندگی ختم ہونے پر جو المناک سزا ملنی ہے اس کے خوف سے ایسی ذہنیت کے لوگ آزاد ہو جاتے ہیں۔ دوسری طرف کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو اس مسئلے پر کبھی غور و فکر کرتے ہی نہیں۔ وہ دراصل آخرت سے بالکل بیگانہ ہو کر ''اس دنیا کی زندگی پر ساری توجہ دیتے ہیں''۔

مگر مذکورہ بالا بات بالکل غلط ہے اور جو وہ سوچتے ہیں حقیقت بالکل اس کے برعکس ہے۔ ایسے لوگ جو ظاہر کرتے ہیں کہ وہ اللہ کی موجودگی سے بے خبر ہیں انہیں بے حد مایوسی کا سامنا کرنا پڑے گا۔ قرآن حکیم میں ایسے لوگوں کی نشان دہی یوں کی گئی ہے:

يَعْلَمُوْنَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ ۖ وَهُمْ عَنِ الْاٰخِرَةِ هُمْ غٰفِلُوْنَ ○

''لوگ دنیا کی زندگی کا بس ظاہری پہلو جانتے ہیں اور آخرت سے وہ خود ہی غافل ہیں''۔ (سورۃ الروم : 7)

یقیناً یہ لوگ اس دنیا کی حقیقت اور مقصد کے بارے میں بہت کم سوجھ بوجھ رکھتے ہیں اور

انہوں نے یہ کبھی نہیں خیال کیا کہ اس دنیا کی زندگی دائمی اور ابدی نہیں ہے۔

اس زندگی کے مختصر ہونے کے بارے میں کچھ باتیں اور کچھ جملے لوگوں کی زبان پر رہتے ہیں۔ مثلاً انہیں یہ کہتے اکثر سنا گیا کہ ''اس سے قبل کہ تمہاری زندگی ختم ہو جائے' اس سے خوب فائدہ اُٹھالو''۔ ''زندگی مختصر ہے''۔ ''کسی کو ہمیشہ زندہ نہیں رہنا''۔ اس طرح کے جملوں سے اس دنیا کی زندگی کی نوعیت کھلتی ہے مگر پھر بھی آخرت سے زیادہ وابستگی اس دنیا کی زندگی کے ساتھ ظاہر کی جاتی ہے۔ ان باتوں سے یہ حقیقت ظاہر ہوتی ہے کہ لوگوں کا زندگی اور موت کے بارے میں عمومی رویہ کیا ہے۔ جب زندگی سے اسقدر لگاؤ اور محبت ہو جائے تو پھر موت سے متعلق گفتگو میں ہمیشہ مزاحیہ رنگ شامل ہو جاتا ہے یا پھر اس موضوع کی سنجیدگی سے ہٹنے کیلئے دوسرے موضوعات چھیڑ دیئے جاتے ہیں۔ ایسا جان بوجھ کر کیا جاتا ہے تاکہ اسقدر اہم موضوع کو شعوری کوشش سے نہایت غیر اہم بنا دیا جائے۔

فنا یقیناً ایک ایسا سنجیدہ موضوع ہے جس پر غور وفکر کیا جانا چاہئے۔ مگر اپنی زندگی کے اس لمحے تک ہوسکتا ہے ایک فرد اس حقیقت کی اہمیت ہی سے بے خبر ہو۔ تاہم اب اگر اسے اس بات کا احساس ہو ہی گیا ہے تو اسے اپنی زندگی اور اپنی توقعات پر از سرنو غور کرنا چاہئے۔ اللہ سے توبہ کا خواستگار ہونے کیلئے اب بھی تاخیر نہیں ہوئی ہے بشرطیکہ انسان اپنے تمام اعمال کا جائزہ لے کر ان کی نئے سرے سے سمت بندی کرلے اور بقیہ زندگی اللہ کی اطاعت و بندگی میں گزار دے۔ زندگی مختصر ہے' انسانی روح کو دوام حاصل ہے۔ اس مختصر عرصے میں کسی شخص کو بھی اپنے عارضی جذبات کو اپنے اُوپر حاوی نہیں ہونے دینا چاہئے۔ اسے چاہئے کہ وہ طمع وحرص سے دور رہے اور ان تمام چیزوں سے بھی دور رہنے کی کوشش کرے جن سے اس دنیا سے اس کا تعلق ورشتہ مضبوط ہوتا ہو۔ یہ یقیناً حماقت ونادانی کی بات ہوگی کہ اس دنیا کے عارضی عیش وآرام اور خوشیوں کی خاطر آخرت کی دائمی ومستقل زندگی کو نظر انداز کر دیا جائے۔

تاہم منکرین خدا نے اللہ کو بھلا کر تمام زندگی گزار دی کیونکہ وہ اس حقیقت کو سمجھ نہ پائے تھے۔ مزید یہ کہ وہ بھی جانتے ہیں کہ ان خواہشات کو حاصل کرنا ناممکن ہے۔ ایسے لوگ ہمیشہ گہری بے سکونی اور بے اطمینانی کا شکار رہتے ہیں اور جو کچھ ان کے پاس ہے اس سے بھی زیادہ حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ ان لوگوں کی آرزوؤں اور تمناؤں کی کوئی حد نہیں ہوتی۔ مگر یہ دنیا ایک ایسا موزوں

میدان نہیں ہے جس میں ان آرزوؤں کی تسکین کے سامان تلاش کئے جائیں۔

اس دنیا کی کسی شے کو دوام و ہمیشگی حاصل نہیں ہے۔ زمانہ دنوں کے خلاف کام کرتا ہے' جو اچھا ہے اس کے خلاف بھی اور جو نیا ہے اس کے خلاف بھی۔ جونہی موٹر کار کا ایک ماڈل پرانا ہو جاتا ہے نیا ماڈل تیار کر لیا جاتا ہے' تاکہ اس نئے ماڈل کی کار کو مارکیٹ میں لایا جا سکے۔ اسی طرح دوسروں کے عالیشان محلات یا ایسے رئیسانہ گھروں کو دیکھ کر جن میں مکینوں سے زیادہ کمرے ہوں اور جن کی تنصیبات پر سونے کا ملمع چڑھا ہوا ہو' ایک شخص اپنے لئے بھی ایسے ہی محلات اور گھروں کی خواہش کر سکتا ہے۔ اس کے نتیجے میں وہ شخص اپنے گھر میں دلچسپی لینا چھوڑ دیتا ہے' اس کے لئے یہ ممکن نہیں رہ جاتا کہ وہ ان محلات کو رشک بھری نظروں سے نہ دیکھے۔

خواہشات کی اس دوڑ میں پھر جو حاصل ہو چکا ہوا سے کوئی اہمیت نہیں دی جاتی اور نئی اور بہتر چیزوں کی کبھی نہ ختم ہونے والی تلاش شروع ہو جاتی ہے۔ پرانی چیزوں کو تعریف و تحسین آمیز نظروں سے دیکھنا ختم ہو جاتا ہے اور ساری توقعات کسی نئی شے سے وابستہ کر لی جاتی ہیں۔ یہ وہ برائی کے دائرے ہیں جن سے تاریخ میں ہر کہیں لوگوں کا واسطہ رہا ہے۔ مگر ایک دانا و بینا شخص کو ایک لمحے کیلئے رُک کر اپنے آپ سے یہ سوال ضرور پوچھنا چاہئے: ''وہ عارضی خواہشات کے پیچھے کیوں سرگرداں ہیں اور کیا ایسی تلاش سے اب تک اسے کوئی فائدہ حاصل ہوا ہے''؟ بالآخر اسے یہ نتیجہ نکالنا چاہئے کہ ''اس نقطہ نظر کے ساتھ ایک بنیادی مسئلہ ہے''۔ پھر بھی ایسے لوگ جن میں استدلال کی کمی ہوتی ہے اپنے ان خوابوں کا تعاقب کرتے رہتے ہیں جن کو وہ حاصل نہیں کر سکتے۔

تاہم کوئی بھی نہیں جانتا کہ آئندہ چند گھنٹوں میں کیا ہونے والا ہے: کسی بھی وقت کوئی بھی کسی حادثے کا شکار ہو سکتا ہے' شدید زخمی ہو سکتا ہے اُسکے جسمانی معذوری سے دوچار ہونے کا امکان ہو سکتا ہے۔ مزید یہ کہ وقت ایک انسان کی موت تک الٹی گنتی کے ساتھ اُڑتا جاتا ہے۔ ہر نئی صبح اس کیلئے پہلے سے مقدر کئے ہوئے دن کو قریب تر لاتی جاتی ہے موت یقیناً اس دنیا کی تمام خواہشات اور آرزوؤں کو ختم کر دیتی ہے۔ مٹی میں دفن ہو جانے کے بعد نہ مال و دولت نہ ہی عہدہ و منصب ساتھ جاتا ہے۔ ہماری ہر وہ شے جس کے بارے میں ہم زندگی میں کنجوس اور بخیل ہوتے ہیں' جس میں ہمارا جسم بھی شامل ہے' غائب ہو کر مٹی میں مل جائے گا۔ کوئی غریب ہو کہ امیر' خوبصورت ہو کہ بدصورت یکساں طور پر ایک روز ایک سادہ سے کفن میں لپٹا ہوا اس دنیا سے

رخصت ہو جاتا ہے (اور ایسا بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ دریا و سمندر کے پانیوں میں ہلاک ہونے والوں کو چند گز کا یہ کفن بھی نصیب نہ ہوا اور ان کے جسم مچھلیوں اور دیگر آبی جانوروں کی خوراک بن گئے)

ہمارا یہ ایمان ہے کہ دنیا کی زندگی کی حقیقت اصل انسانی زندگی کی نوعیت کے بارے میں وضاحت پیش کرتی ہے۔ یہ زندگی مختصر اور پرفریب زندگی ہے جس میں دنیاوی آرزوئیں بڑی دلکش اور خوش آئند نظر آتی ہیں جبکہ حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے۔

یہ کتاب آپ کو زندگی اور اس کی تمام حقیقتوں کے سمجھنے میں مدد دے گی اور اگر آپ ایسا چاہتے ہیں تو یہ مقاصد زندگی پر از سر نو غور کرنے میں بھی معاون ثابت ہوگی۔

اللہ نے مومنین پر یہ فرض کر دیا ہے کہ وہ دوسروں کو ان حقائق کے بارے میں متنبہ کریں اور ان سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ اس ذات باری تعالیٰ کی مرضی و منشاء کے مطابق زندگی گزاریں جیسا کہ درج ذیل آیت میں ارشاد ہوتا ہے:

اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ فَلَا تَغُرَّنَّكُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا

''فی الواقع اللہ کا وعدہ سچا ہے پس یہ دنیا کی زندگی تمہیں دھوکے میں نہ ڈالے''

(سورۃ لقمٰن:33)



دُنیا کی زندگی

ہماری یہ کائنات ایک جامع ومکمل نظم وترتیب کے ساتھ تخلیق کی گئی ہے۔ لاتعداد ستارے اور کہکشائیں اپنے اپنے محوروں میں گردش کرتے ہیں مگر پھر بھی ان میں مکمل ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔ ایسی کہکشائیں جن میں تقریباً 300 بلین ستارے ہوتے ہیں ایک دوسرے کے اندر سے تیرتی ہوئی گزرتی ہیں اور دیکھنے والوں کی نظریں دنگ رہ جاتی ہیں کہ اس قدر بڑی منتقلی کے دوران کوئی تصادم نہیں ہوتا۔ ایسی ترتیب اور نظم کو حسن اتفاق یا انطباق کا نام نہیں دیا جاسکتا۔ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ کائنات میں چیزوں کی رفتار انسانی تصور کی حدود سے بھی ماورا ہوتی ہے۔ جب ہم زمین پر مروجہ پیمائشوں کے ساتھ موازنہ کرتے ہیں تو باہر کے خلاء کی طبعی جہات کئی گنا زیادہ ہوتی ہیں۔ ستارے اور سیارے جن کی کمیت کئی کئی بلین یا ٹریلین ٹن ہوتی ہے اور وہ کہکشائیں جن کا ادراک صرف ریاضیاتی فارمولوں کے ذریعے کیا جاسکتا ہے' سب ناقابل یقین حد رفتار کے ساتھ اپنے اپنے راستوں پر خلاء میں گردش کرتے ہیں۔

مثال کے طور پر زمین اپنے محور پر اس طرح گردش کرتی ہے کہ اس کی سطح پر جو نقطے ہیں وہ تقریباً 1,670 کلومیٹر فی گھنٹے کی اوسط رفتار کے ساتھ حرکت کرتے ہیں۔ سورج کے گرد زمین کی محوری اوسط خطی گردش 108,000 کلومیٹر فی گھنٹہ ہے۔ یہ اعداد وشمار ہماری اس زمین کے حساب سے ہیں۔ جب نظام شمسی کے پار ہمارا آمنا سامنا بے حد وحساب بڑے ستاروں اور سیاروں سے ہوتا ہے تو ہم ان کی جہات کا معائنہ کرسکتے ہیں۔ کائنات کے اندر جب نظام اپنے سائز میں بڑھتے ہیں تو رفتاریں بھی بڑھ جاتی ہیں۔ نظام شمسی کہکشاں کے مرکز کے گرد

720,000 کلومیٹر فی گھنٹے کی رفتار سے گردش کرتا ہے۔ خود کہکشاں جس میں 200 بلین ستارے ہوتے ہیں کی رفتار 950,000 کلومیٹر فی گھنٹہ ہوتی ہے۔ یہ مسلسل حرکت ناقابل ادراک ہے۔ یہ زمین جس پر ہم رہتے ہیں اپنے نظام شمسی سمیت ہر برس گذشتہ سال کے محل وقوع کی نسبت 500 ملین کلومیٹر دور ہٹ جاتی ہے۔

اس ساری غیر نامیاتی حرکت کے اندر ایک ناقابل یقین توازن پایا جاتا ہے اور اس سے پتہ چلتا ہے کہ اس زمین پر زندگی ایک بڑے نازک توازن کی بنیاد پر قائم ہے۔ اجرامِ فلکی اگر اپنے محور پر ذرہ برابر بھی ادھر اُدھر ہو جائیں تو اس کے نتائج بے حد خطرناک نکل سکتے ہیں۔ کچھ تو اسقدر نقصان دہ ہو سکتے تھے کہ اس کرۂ ارض پر زندگی ناممکن بن جاتی۔ ایسے نظام جن میں توازن اور نہایت تیز رفتار، دونوں پائے جاتے ہوں ان میں بہت بڑے حادثات کسی بھی وقت پیش آ سکتے ہیں۔ تاہم یہ ایک حقیقت ہے کہ ہم اس سیارے پر اپنی زندگیاں ایک معمول کے مطابق گزار رہے ہیں جس کی وجہ سے ہم یہ بھول جاتے ہیں کہ اس کائنات میں مجموعی طور پر کیا کیا خطرات موجود ہیں۔ اس کائنات کا وہ نظم و ترتیب جس میں برائے نام تصادم ہمارے علم میں ہیں ہمیں یہ سوچنے کی دعوت دیتے ہیں کہ ہمارے اِردگرد ایک جامع و مکمل مستحکم اور محفوظ ماحول موجود ہے۔

لوگ ایسی باتوں پر زیادہ غور و خوض نہیں کرتے۔ اس لئے وہ اس کرۂ ارض پر زندگی کو ممکن بنانے والے اس غیر معمولی جالے کا ادراک نہیں کرتے جو باہم جڑی ہوئی صورت حال سے بنتا ہے اور نہ ہی انہوں نے کبھی یہ سوچنے کی کوشش کی کہ ان کی زندگیوں کا اصل مقصد کسقدر اہم ہے۔ یہ لوگ تو اس پر بھی غور و فکر کئے بغیر زندگی گزار دیتے ہیں کہ یہ وسیع اور نازک توازن کیسے پیدا ہوا۔

تاہم انسان کو سوچنے اور غور و فکر کرنے کی صلاحیت بخشی گئی ہے انسان جب تک اپنے گرد و پیش پر پوری دانائی اور عقلمندی کے ساتھ غور نہیں کرے گا اسے حقیقت نظر نہیں آئے گی، نہ ہی اُسے یہ ہلکا سا تصور بھی ہو سکے گا کہ یہ دنیا کیوں تخلیق کی گئی ہے اور وہ کون سی ہستی ہے جو اس عظیم ترتیب و نظم کو اس قدر جامع و مکمل آہنگ و توازن کے ساتھ برقرار رکھے ہوئے ہے۔

ایسا فرد جو ان سوالات پر غور کرتا ہے اور ان کی اہمیت تک رسائی حاصل کر لیتا ہے ایک ناگزیر حقیقت کھل کر اس کے سامنے آ جاتی ہے: یہ کائنات جس میں ہم زندہ ہیں اسے ایک خالق نے تخلیق کیا ہے اور اس خالق کی موجودگی اور اس کی صفات ہر شے میں جلوہ گر ہیں۔ یہ کرۂ ارض

پوری کائنات میں ایک چھوٹے سے نقطے کی حیثیت رکھتا ہے جسے ایک خاص مقصد کیلئے تخلیق کیا گیا ہے۔ ہماری زندگیوں کے سفر میں کچھ بھی تو بلا مقصد واقع نہیں ہوتا۔ اُس خالق نے جو اپنی صفات' قوت و طاقت اور دانائی کا پوری کائنات میں بھرپور مظاہرہ کر رہا ہے انسان کو پیدا کرنے کے بعد یوں ہی تو نہیں چھوڑ دیا بلکہ اس نے تو اسے ایک اہم مقصد اور فریضہ سونپا ہے۔ اس کرۂ ارض پر انسان کو کیوں تخلیق کیا گیا۔ اللہ نے قرآن حکیم میں اس کا بیان یوں فرمایا ہے:

وَهُوَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرُ o نِ الَّذِیْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَیٰوةَ لِیَبْلُوَكُمْ اَیُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلاً ط وَهُوَ الْعَزِیْزُ الْغَفُوْرُ o

''اور وہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے جس نے موت اور زندگی کو ایجاد کیا تاکہ تم لوگوں کو آزما کر دیکھے کہ تم میں سے کون بہتر عمل کرنے والا ہے۔ اور وہ زبردست بھی ہے اور درگزر فرمانے والا بھی''۔ (سورۃ الملک: 1-2)

اِنَّا خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ اَمْشَاجٍ صلے نَّبْتَلِیْهِ فَجَعَلْنٰهُ سَمِیْعًا بَصِیْرًا o

''ہم نے انسان کو نطفہ مخلوط سے پیدا کیا تاکہ اسے آزمائیں تو ہم نے اس کو سُنتا دیکھتا بنایا''۔ (سورۃ الدھر: 2)

قرآن حکیم میں اللہ نے اس بات کی مزید وضاحت فرمادی ہے کہ کوئی شے بھی بلا مقصد تخلیق نہیں کی گئی ہے:

وَمَا خَلَقْنَا السَّمَآءَ وَالْاَرْضَ وَمَا بَیْنَهُمَا لٰعِبِیْنَ o لَوْ اَرَدْنَآ اَنْ نَّتَّخِذَ لَهْوًا لَّا تَّخَذْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّآ صلے اِنْ كُنَّا فٰعِلِیْنَ o

''اور ہم نے آسمانوں اور زمین کو اور جو کچھ ان میں ہے کچھ کھیل کے طور پر نہیں بنایا ہے۔ اگر ہم کوئی کھلونا بنانا چاہتے اور بس یہی کچھ ہمیں کرنا ہوتا تو اپنے ہی پاس سے کر لیتے''۔

(سورۃ الانبیآء: 16-17)

دُنیا کا راز

انسان کی تخلیق کے مقصد کا ذکر قرآن حکیم میں ایک جگہ اور اس طرح آیا ہے:

اِنَّا جَعَلْنَا مَا عَلَی الْاَرْضِ زِیْنَةً لَّهَا لِنَبْلُوَهُمْ اَیُّهُمْ اَحْسَنُ عَمَلاً o

''واقعہ یہ ہے کہ یہ جو کچھ سروسامان بھی زمین پر ہے اس کو ہم نے زمین کی زینت بنایا ہے۔ تاکہ ان لوگوں کو آزمائیں کہ ان میں کون بہتر عمل کرنے والا ہے''۔ (سورۃ الکھف: 7)

ایسا کرنے میں اللہ انسان سے یہ توقع رکھتا ہے کہ وہ زندگی بھر اس کا مطیع و فرمانبردار بندہ

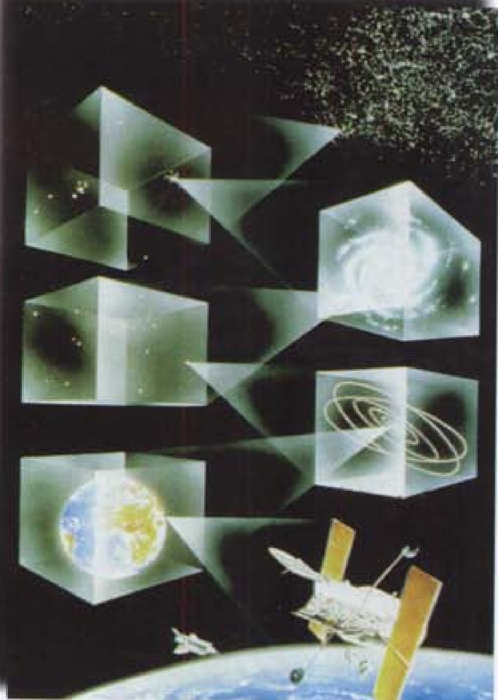
بن کر رہے۔ دوسرے الفاظ میں یہ دنیا ایک ایسی جگہ ہے جس میں وہ لوگ جو اللہ کا خوف دلوں میں رکھتے ہیں اور وہ جو اللہ کے نافرمان اور ناشکرگزار بندے ہیں' ایک دوسرے سے الگ الگ پہچانے جاسکیں۔ نیکی و بدی' جامع و بے نقص اور نقص دار اس ترتیب میں ساتھ ساتھ ہیں۔ انسان کی مختلف طریقوں سے آزمائش کی جاتی ہے۔ آخر میں مومنین کو منکرین حق سے علیحدہ کردیا جائے گا اور اوّل الذکر جنت میں داخل کر دیئے جائینگے۔ قرآن پاک میں اس کا ذکر یوں ہوا:

وَلَقَدْ فَتَنَّا الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَلَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَلَيَعْلَمَنَّ الْكٰذِبِيْنَ۝

''ہم ان سب لوگوں کی آزمائش کر چکے ہیں۔ جو ان سے پہلے گزرے ہیں اللہ کو تو ضرور یہ دیکھنا ہے کہ سچے کون ہیں اور جھوٹے کون'' (سورۃ العنکبوت:3)

اس آزمائش کی روح تک پہنچنے کیلئے انسان کو اس بات کی ضرورت ہے کہ وہ اپنے خالق کے بارے میں گہرا علم رکھتا ہو' جو خود اور اس کی صفات ہر اس شے سے جھلکتی ہیں جو اس دنیا میں موجود ہے۔ وہ خالق ہے' مطلق طاقت وقوت اور علم و دانائی کا سرچشمہ۔

یہ تصویر نظام شمسی میں زمین کے محل وقوع کو ظاہر کرتی ہے' اس سے کہکشاں میں نظام شمسی کے محل وقوع کا بھی پتہ چلتا ہے اور سب سے آخر میں ہماری کہکشاں کے اس کائنات میں محل وقوع کے بارے میں بھی بتاتی ہے۔





هُوَ اللّٰهُ الْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ لَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى ط يُسَبِّحُ لَهُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ج وَ هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ٥

''وہ اللہ ہی ہے جو تخلیق کا منصوبہ بنانے والا اور اس کو نافذ کرنے والا اور اس کے مطابق صورت گری کرنے والا ہے۔ اس کیلئے بہترین نام ہیں۔ ہر چیز جو آسمانوں اور زمین میں ہے اس کی تسبیح کر رہی ہے اور وہ زبردست اور حکیم ہے''۔ (سورۃ الحشر: 24)

اللہ نے انسان کو مٹی کے گارے سے تخلیق کیا اور پھر اسے بہت سے خدوخال بخشے اور اس پر بیشمار عنایات فرمائیں۔ کوئی بھی انسان از خود دیکھنے، سننے، چلنے پھرنے یا سانس لینے کے اوصاف حاصل نہیں کر سکتا۔ مزید یہ کہ اس کی پیدائش سے قبل یہ ساری صفات جو پیچیدہ و مکمل نظاموں پر مشتمل تھیں اس کے جسم میں اس وقت ڈال دی گئی تھیں جب وہ رحم مادر میں تھا۔ اور ایسا اس وقت ہوا جب اسے رحم مادر سے باہر کی دنیا کے ادراک کی کوئی صلاحیت حاصل نہ تھی۔

یہ ساری صفات دینے کے بعد انسان سے توقع یہ کی گئی کہ وہ اللہ کا مطیع و فرمانبردار بندہ بن کر رہے گا۔ تاہم جیسا کہ اللہ نے قرآن پاک میں ارشاد فرمایا کہ لوگوں کی اکثریت گنہگار و






خلاء سے کرۂ ارض پر نظر دوڑائی جائے تو کوئی بھی انسان جسے یہ دعویٰ ہو کہ اسے دنیا میں اعلیٰ مقام حاصل ہے، یقیناً یہ دیکھ لے گا کہ اسے تو وسیع و عریض دنیا میں اپنا وجود قائم رکھنے کیلئے ایک بہت چھوٹی سی جگہ حاصل ہے۔

فرض کیجئے کہ اس دنیا میں لوگ اپنے مقام و مرتبے کی بنیاد پر اپنا طرز زندگی دوسروں سے مختلف بنا لیتے ہیں۔ تاہم کوئی بہت مالدار ہو یا غریب، جوان ہو کہ بوڑھا، تعلیم یافتہ ہو کہ اَن پڑھ، اس وسیع کائنات میں جہاں کئی بلین ستاروں کا سمندر ٹھاٹھیں مارتا ہو، اسے بلا کسی امتیاز کے بہت محدود اور تھوڑی سی جگہ ملتی ہے۔

خطاکاروں پر مشتمل ہوتی ہے جو اپنے خالق کی ''ناشکرگزار'' ہو۔ اسلئے کہ یہ اللہ کے حضور سر تسلیم خم کرنے سے انکار کر دیتی ہے۔ ان کے خیال میں یہ زندگی بڑی طویل ہے اور زندہ رہنے کیلئے ان میں انفرادی قوت موجود ہے۔

اسی لئے ان لوگوں کا مطمع نظر یہ ہوتا ہے کہ ''جب تک یہ زندگی ہے اس سے خوب فائدہ اُٹھایا جائے''۔ انہیں موت اور آخرت بھول چکی ہوتی ہے وہ زندگی سے لطف اندوز ہونے کی کوشش کرتے اور بہتر معیارات زندگی کے حصول میں لگے رہتے ہیں۔ اللہ جل شانہٗ نے ان لوگوں کی دنیاوی زندگی سے گہری وابستگی کا ذکر قرآن حکیم میں یوں فرمایا ہے:

اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ يُحِبُّوْنَ الْعَاجِلَةَ وَيَذَرُوْنَ وَرَآءَهُمْ يَوْمًا ثَقِيْلًا٥

''یہ لوگ دنیا کو دوست رکھتے ہیں اور (قیامت کے) بھاری دن کو پس پشت چھوڑ دیتے ہیں۔ (سورۃ الدھر: 27)

منکرین خدا کی کوشش ہوتی ہے کہ وہ اس زندگی کی ساری لذتیں، سارے لطف اُٹھالیں۔ مگر جیسا کہ اس آیت قرآنی سے پتہ چلتا ہے زندگی تو بہت جلد گزر جاتی ہے یہ ایک ایسا اہم معاملہ ہے جسے لوگوں کی اکثریت یاد رکھنے میں ناکام ہو جاتی ہے۔ اس موضوع کی مزید وضاحت کے لئے آئیے ہم ایک اور مثال کے بارے میں غور کرتے ہیں۔

چند سیکنڈ یا چند گھنٹے

کسی خاص چھٹی کے دن کے بارے میں غور کیجئے: کئی مہینوں کی سخت محنت کے بعد آپ کو جب دو ہفتوں کی چھٹیاں ملتی ہیں تو آپ اپنی چھٹیاں گزارنے کے لئے آٹھ گھنٹے کے تھکا دینے والے سفر کے بعد سیر و تفریح کے مقام پر پہنچتے ہیں۔ وہاں آپ کو اپنے پسندیدہ چہرے چھٹیاں مناتے ہوئے ہجوم کے درمیان نظر آتے ہیں۔ آپ ان سے حال احوال پوچھتے ہیں۔ موسم گرم ہوتا ہے اور آپ ایک لمحہ بھی ضائع کئے بغیر دھوپ اور خاموش سمندر سے لطف اندوز ہونا چاہتے ہیں۔ چنانچہ آپ اپنے لئے جگہ ڈھونڈ لیتے ہیں، پھر تیرنے کا لباس پہن کر تیزی سے ساحل سمندر کی طرف چلے جاتے ہیں۔ آخر کار آپ اپنے آپ کو صاف و شفاف پانی کے درمیان پاتے ہیں مگر اگلے لمحے اچانک ایک آواز آپ کو جگا دیتی ہے: ''اُٹھ جاؤ ورنہ کام پر جانے میں دیر ہو جائے گی!''

تمہیں یہ الفاظ بہت برے محسوس ہوتے ہیں۔ ایک لمحے کے لئے تو تمہاری سمجھ میں ہی نہیں آتا کہ کیا ہو رہا ہے: تم جو دیکھ رہے ہو اس میں اور جو تم سن رہے ہو اس میں نہ سمجھ میں آنے والا تضاد پایا جاتا ہے۔ جب تم آنکھیں کھولتے ہو تو اپنے آپ کو بستر پر پاتے ہو۔ اب تم پر یہ حقیقت آشکار ہوتی ہے کہ تم تو محض ایک خواب دیکھ رہے تھے۔ تم حیران و پریشان ہو جاتے ہو۔ تم اس حیرت کا اظہار اس طرح کئے بغیر نہیں رہ سکتے: ''میں وہاں تک پہنچنے کیلئے مسلسل آٹھ گھنٹے گاڑی چلاتا رہا۔ آج باہر حالانکہ ٹھٹھرا دینے والی سردی ہے مگر خواب کے دوران میں نے دھوپ دیکھی اور پانی کے چھینٹے میرے چہرے پر پڑ رہے تھے''۔

وہ آٹھ گھنٹے جو تم نے سیر و تفریح کے مقام تک پہنچنے کیلئے گاڑی چلانے میں صرف کئے، جتنی دیر تم وہاں پہنچ کر اپنے لئے جگہ کا انتخاب کرتے رہے، یہ سب دراصل وہ چند سیکنڈ تھے جن میں تم عالم خواب میں رہے۔ یہ سب کچھ حالانکہ حقیقی زندگی سے مختلف نہ تھا مگر حقیقت آمیز رنگ میں جو کچھ تمہیں پیش آیا وہ محض خواب تھا۔

اس سے واضح ہوتا ہے کہ اس دنیا کی زندگی سے بھی ہمیں اسی طرح بیدار کیا جا سکتا ہے جس طرح ہمیں خواب سے جگایا گیا۔ پھر منکرین خدا اسی قسم کی حیرت کا اظہار کریں گے۔ جب تک یہ لوگ زندہ تھے وہ اس غلط فہمی سے باہر نہ نکل سکے کہ ان کی زندگیاں بڑی طویل ہیں۔ مگر جس وقت ان کو از سر نو پیدا کیا جائے گا تو دنیا میں گزارے ہوئے ساٹھ ستر برس چند سیکنڈوں کا دورانیہ نظر آئیں گے۔ اللہ نے اس کا ذکر قرآن حکیم میں اس طرح فرمایا ہے:

قٰلَ كَمْ لَبِثْتُمْ فِي الْاَرْضِ عَدَدَ سِنِيْنَ ۝ قَالُوْا لَبِثْنَا يَوْمًا اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ فَسْئَلِ الْعَآدِّيْنَ ۝ قٰلَ اِنْ لَّبِثْتُمْ اِلَّا قَلِيْلًا لَّوْ اَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝

''پھر اللہ تعالیٰ ان سے پوچھے گا، بتاؤ زمین میں تم کتنے سال رہے؟ وہ کہیں گے ایک دن یا دن کا بھی کچھ حصہ ہم وہاں ٹھہرے ہیں۔ شمار کرنے والوں سے پوچھ لیجئے۔ ارشاد ہوگا: تھوڑی ہی دیر ٹھہرے ہو ناں کاش تم نے یہ اس وقت جانا ہوتا''۔ (سورۃ المومنون : 112-114)

درج بالا سورۃ سے پتہ چلتا ہے کہ دنیا میں انسان نے دس برس گزارے ہوں یا سو سال، آخر کار اسے احساس ہوگا کہ زندگی کس قدر مختصر تھی۔ یہ بالکل اس انسان کے خواب والا معاملہ ہے جو طویل تعطیلات کے دوران اچانک خواب سے اس وقت جگا دیا جاتا ہے جب وہ بہت سے

خوبصورت مناظر دیکھ رہا تھا پھر اسے خیال آتا ہے کہ یہ سب کچھ تو چند سیکنڈوں پر مشتمل خواب کی دنیا کی باتیں تھیں۔ اسی طرح انسان کو زندگی کا مختصر دورانیہ اس وقت سب سے زیادہ پریشان کرے گا جب وہ اپنی زندگی کے بارے میں باقی ساری باتیں بھول چکا ہوگا۔ قرآن پاک کی درج ذیل سورۃ میں اللہ انسان کو حکم دیتا ہے کہ وہ اس طرف پوری توجہ دے:

وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ يُقْسِمُ الْمُجْرِمُوْنَ ۙ۵ مَا لَبِثُوْا غَيْرَ سَاعَةٍ ؕ كَذٰلِكَ كَانُوْا يُؤْفَكُوْنَ ۝

''اور جب وہ ساعت برپا ہوگی تو مجرم قسمیں کھا کھا کر کہیں گے کہ ہم ایک گھڑی بھر سے زیادہ نہیں ٹھہرے ہیں۔ اسی طرح وہ دنیا کی زندگی میں دھوکا کھایا کرتے تھے''۔ (سورۃ الروم : 55)

وہ لوگ جو اس دنیا میں چند گھنٹوں یا چند دنوں کے مہمان ہوتے ہیں بالکل ان ہی کی طرح وہ جو ستر برس تک زندہ رہتے ہیں، بہت محدود سے وقت کے لئے یہاں زندہ رہتے ہیں............ اور جو چیز محدود مدت کیلئے ہوگی اسے ایک روز ختم ہو جانا ہے۔ انسانی زندگی خواہ اسی برس کی ہو یا سو سالہ ہر نئی صبح انسان کو اس کے پہلے سے معینہ دن کے قریب تر لے آتی ہے۔ دراصل انسان زندگی بھر اس تجربے سے گزرتا ہے۔ وہ اپنے لئے وسیع المیعاد منصوبے بناتا ہے مگر وہ سارے کے سارے منصوبے دھرے رہ جاتے ہیں جب ایک روز اسے معینہ وقت پر واپس اپنی منزل کی جانب لوٹ جانا ہوتا ہے۔ انسان جسے زندگی میں قیمتی شے سمجھتا رہا یا جسے اس نے زندگی کا اہم موڑ سمجھا وہ محض وہم وخیال ثابت ہوا۔

ایک ایسے لڑکے کا تصور کریں جو حال ہی میں ہائی سکول میں پہنچا ہے۔ کسی انداز سے وہ اس روز کا انتظار نہیں کر سکتا جس روز وہ گریجویشن کرلے گا مگر وہ ایک آزاد شوق اور آرزومندی کے ساتھ اس وقت کی طرف ضرور دیکھتا ہے۔ پھر جلد ہی وہ اپنے آپ کو کالج میں داخل دیکھتا ہے۔ زندگی کے اس مرحلے میں اسے ہائی سکول کے طویل برسوں پر مشتمل دور یاد ہی نہیں رہتا۔ اس لئے کہ اس کے ذہن میں پہلے سے ہی کئی دوسری باتیں موجود ہیں، وہ مستقبل کیلئے ان قیمتی برسوں سے فائدہ اُٹھا کر اپنے خوف اور ڈر کو کم کرنا چاہتا ہے۔ چنانچہ اس کیلئے وہ بہت سے منصوبے بناتا ہے پھر زیادہ وقت نہیں گزرتا کہ وہ مستقبل قریب میں ہونے والی اپنی شادی کے انتظامات میں مصروف ہو جاتا ہے۔ یہ وہ خاص موقعہ تھا جس کا وہ بڑی بے چینی سے انتظار کر رہا تھا۔ مگر وقت اس

کی توقع سے کہیں زیادہ جلد گزر جاتا ہے اور زندگی کے کئی برس وہ پیچھے چھوڑ آتا ہے اب وہ ایک ایسا ذمہ دار انسان تھا جسے اپنے خاندان کی مدد کرنی تھی۔ جب تک وہ دادا یا نانا بنتا ہے اس کی صحت گرنے لگتی ہے۔ اب اسے بہت کم یاد پڑتا ہے کہ جوانی میں اس نے کیسے کیسے لطف حاصل کیے۔ بے رحم یادیں بھی بھولی بسری باتیں بن جاتی ہیں۔ ایسی تکالیف جو جوانی میں اس کے ذہن پر سوار رہتی تھیں اب اس کیلئے باعث دلچسپی نہیں رہ جاتیں۔ اب تو زندگی کی چند تصویریں ہی اس کی نظروں کے سامنے پھرتی ہیں.......... پھر معینہ وقت قریب آن پہنچتا ہے۔ وقت بہت محدود رہ جاتا ہے' چند برس' مہینے یا پھر محض چند روز۔ اس انسان کی وہ کہانی جسے وہ اعلیٰ و قابل ذکر سمجھتا رہا' بلا استثنٰی اختتام کو پہنچتی ہے...... اسے تجہیز و تکفین کے لئے خاندان کے قریبی افراد' دوست احباب اور عزیز و اقارب لے جاتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ کسی بھی انسان کو اس خاتمے سے بچ نکلنے کا یارا نہیں.......... کل نفس ذائقة الموت۔

تاہم تاریخ کے آغاز سے ہی اللہ نے انسان کو ہدایت فرمائی کہ یہ زندگی عارضی ہے اور آخرت ہی اس کا اصل اور دائمی مسکن ہے۔ اللہ کی آخری کتاب میں جنت اور دوزخ کے بارے میں بہت سی تفصیلات دے دی گئی ہیں۔ مگر انسان پھر بھی اس لازمی حقیقت کو فراموش کر بیٹھتا ہے اور اپنی ساری تگ و دو اس دنیا کی عارضی اور مختصر زندگی میں لگا دیتا ہے۔ تاہم صرف وہ لوگ جو زندگی کو حقیقت کی نظر سے دیکھتے ہیں' وہ اس کی اصلیت سے باخبر ہوتے ہیں۔ وہ یہ جانتے ہیں کہ دنیا کی زندگی کا موازنہ کسی طرح بھی آخرت کے ساتھ نہیں کیا جا سکتا۔ اسی لئے زندگی میں انسان کا مقصد صرف جنت کا حصول ہوتا ہے جو انسان کا ابدی ٹھکانہ ہوگا جہاں اسے اللہ کا بے پایاں لطف و کرم حاصل ہوگا۔ صحیح عقیدے پر رہ کر اللہ کی رضا پر قانع رہتے ہوئے ہی جنت کا حصول ممکن ہو سکتا ہے۔ تاہم وہ لوگ جو اس دنیا کے خاتمے کے بارے میں نہیں سوچتے اور اس زندگی کو دائمی زندگی سمجھ کر گزارتے ہیں وہ یقیناً ہمیشہ کی سزا کے مستحق ہیں۔

اللہ نے ایسے لوگوں کے المناک انجام کا ذکر قرآن پاک میں یوں فرمایا ہے:

وَ يَوْمَ يَحْشُرُهُمْ كَاَنْ لَّمْ يَلْبَثُوْٓا اِلَّا سَاعَةً مِّنَ النَّهَارِ يَتَعَارَفُوْنَ بَيْنَهُمْ ط قَدْ خَسِرَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِلِقَآءِ اللّٰهِ وَ مَا كَانُوْا مُهْتَدِيْنَ o

"اور جس روز اللہ ان کو اکٹھا کرے گا تو (یہی دنیا کی زندگی انہیں ایسی محسوس ہوگی) گویا یہ

محض ایک گھڑی بھر آپس میں جان پہچان کرنے کو ٹھہرے تھے (اس وقت تحقیق ہو جائے گی کہ) فی الواقع سخت گھاٹے میں رہے وہ لوگ جنہوں نے اللہ کی ملاقات کو جھٹلایا اور ہرگز وہ راست پر نہ تھے''۔ (سورۃ یونس : 45)

فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ اُولُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ وَلَا تَسْتَعْجِلْ لَّهُمْ ط كَاَنَّهُمْ يَوْمَ يَرَوْنَ مَا يُوْعَدُوْنَ لا لَمْ يَلْبَثُوْٓا اِلَّا سَاعَةً مِّنْ نَّهَارٍ ط بَلٰغٌ ج فَهَلْ يُهْلَكُ اِلَّا الْقَوْمُ الْفٰسِقُوْنَ o

''پس اے نبیؐ صبر کرو جس طرح اولوالعزم رسولوں نے صبر کیا ہے اور ان کے معاملے میں جلدی نہ کرو۔ جس روز یہ لوگ اس چیز کو دیکھ لیں گے جس کا انہیں خوف دلایا جا رہا ہے تو انہیں یوں معلوم ہوگا کہ جیسے دنیا میں دن کی ایک گھڑی بھر سے زیادہ نہیں رہے تھے۔ بات پہنچا دی گئی' اب کیا نافرمان لوگوں کے سوا اور کوئی ہلاک ہوگا؟'' (سورۃ الاحقاف:35)

بے لگام خواہشیں

اس کتاب کے ابتدائی صفحات میں ہم یہ ذکر کر چکے ہیں کہ وہ عرصہ جو ایک عام انسان اس دنیا میں گزارتا ہے وہ اسی قدر مختصر ہوتا ہے جس قدر ''پلک جھپکنے کی دیر''۔ انسان کے پاس زندگی میں جو کچھ بھی ہو اسے حقیقی خوشی اور اطمینان اس وقت حاصل نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ اللہ پر ایمان نہ لے آئے اور اس کی یاد میں مصروف رہے۔

سن بلوغت کو پہنچتے ہی وہ دولت دنیا' طاقت اور مقام و مرتبے کی خواہش کرنے لگتا ہے۔ تاہم حیرت ہوتی ہے اس بات پر کہ ان خواہشات کی تکمیل کیلئے اس کے وسائل بہت محدود ہوتے ہیں۔ اس بات کا قطعاً کوئی امکان نہیں ہوتا کہ وہ جس شے کی خواہش کرے اسے حاصل کر لے۔ نہ دولت دنیا' نہ دنیاوی کامیابی نہ ہی کسی قسم کی خوشحالی اس کی خواہش کی تسلی و تشفی کر سکتی ہے۔ بلا امتیاز جنس اور سماجی مرتبہ لوگ عموماً اس دنیا میں ساٹھ یا ستر برس زندہ رہتے ہیں۔ اس مدت کے ختم ہونے پر موت تمام دنیاوی عیش و نشاط اور طمع و حرص کو بے معنی بنا دیتی ہے۔

ایسا انسان جو بے لگام خواہشوں کی جانب جھکا رہتا ہے' ہمیشہ اپنے آپ کو ایسے ''عدم اطمینان'' میں گرفتار محسوس کرتا ہے جس کا کوئی علاج نہ ہو۔ زندگی کے ہر مرحلے میں یہ عدم اطمینان

موجود رہتا ہے جبکہ اس کے اسباب وقت اور حالت کے مطابق بدلتے رہتے ہیں۔ ان خواہشوں کی تکمیل کیلئے انسان ہر طرح کے کام کرتا ہے۔ ایسا انسان خواہشوں کا اسقدر غلام بن جاتا ہے کہ وہ ہر طرح کے نتائج دیکھنے کیلئے تیار رہتا ہے خواہ اسے اپنے کنبے کے قریبی افراد کی محبت سے ہی ہاتھ کیوں نہ دھونے پڑیں یا اُسے خاندان سے نکال باہر کیوں نہ کر دیا جائے۔ اس کے باوجود جس وقت وہ اپنا مقصد پالیتا ہے یہ ''جادو'' غائب ہو جاتا ہے۔ وہ حاصل شدہ مقصد میں اب دلچسپی لینا کم کر دیتا ہے۔ مزید یہ کہ حاصل شدہ کامیابی سے عدم اطمینان محسوس کرتے ہوئے وہ ایک دوسری شے کے حصول کے پیچھے لگ جاتا ہے تاوقتیکہ وہ اسے حاصل کرنے میں کامیاب نہیں ہو جاتا۔

بے لگام خواہش رکھنے والا ایک کافر ہی ہو سکتا ہے۔ یہ بری صفت اس کا ساتھ موت تک دیتی ہے۔ جو کچھ اس کے پاس ہوتا ہے وہ اس سے کبھی مطمئن نہیں ہوتا۔

اس کا سبب یہ ہوتا ہے کہ لالچ میں آ کر وہ دنیا کی ہر شے اپنے لئے حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اور اللہ کی رضا کے حصول کا متمنی نہیں رہتا۔ اسی طرح ہر وہ شے جو لوگوں کے پاس ہوتی ہے اور جسے حاصل کرنے کی وہ کوشش کرتے ہیں لوگوں کیلئے وجہ غرور و تکبر اور باعث افتخار بن جاتی ہے اور لوگ اللہ کی مقرر کردہ حدود کو پھلانگ جاتے ہیں۔ یقیناً جو انسان اللہ سے بغاوت و سرکشی کرے گا اللہ اس دنیا میں اسے کبھی ذہنی سکون نہیں دے گا۔ اس بارے میں قرآن حکیم کی ایک سورۃ میں ارشاد باری تعالیٰ یوں ہوتا ہے:

اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ تَطْمَئِنُّ قُلُوْبُهُمْ بِذِكْرِ اللّٰهِ ط اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ o

''ایسے ہی لوگ ہیں وہ جنہوں نے (اس نبیؐ کی دعوت کو) مان لیا ہے اور ان کے دلوں کو اللہ کی یاد سے اطمینان نصیب ہوتا ہے''۔ (سورۃ الرعد : 28)

ایک گمراہ کن دنیا

دنیا بھر میں تخلیق کی جامعیت کی ان گنت مثالیں انسان کے گرد و نواح میں ملتی ہیں، رنگین ارضی مناظر، مختلف قسم کے کئی ملین سیارے، نیلگوں آسمان، پانی سے لدے پھندے بادل یا انسانی جسم...... ایک جامع و مکمل نامیاتی جسم جس کے اندر بیشمار پیچیدہ نظام موجود ہوں۔ یہ سب تخلیق کی

دم بخود کرنے والی مثالیں ہیں جن کو دیکھنے کیلئے گہری نظر کی ضرورت ہوتی ہے۔

جب ہم ایک ایسی تتلی کو دیکھتے ہیں جس نے اپنے وہ پر پھیلا رکھے ہوں جن پر نہایت نازک اور پیچیدہ نمونے بنے ہوتے ہیں تو یہی اس کی شناخت کی وضاحتیں ہوتی ہیں۔ ایسا منظر ہم کبھی فراموش نہیں کر سکتے۔ ایک پرندے کے سر پر ہمیں اسقدر نرم و نازک اور چمکدار بال و پر نظر آتے ہیں کہ وہ قیمتی کالے مخمل کی مانند دکھائی دیتے ہیں یا جب ہم دلکش رنگ دیکھتے ہیں یا ایک پھول کی مسحور کن خوشبو سونگھتے ہیں تو یہ سب انسانی روح کیلئے حیرت انگیز چیزیں ہوتی ہیں۔

ہر کوئی بلا کسی امتیاز کے ایک خوبصورت چہرے کی تعریف کرتا ہے۔ کچھ لوگوں کی نظر میں محل نما گھر، سونے کی ملمع سازی والی تنصیبات اور بہت قیمتی بڑی بڑی کاریں ایسی چیزیں ہوتی ہیں جن سے محبت کی جائے۔ انسان زندگی میں اور بھی بہت سی چیزوں کی خواہش رکھتا ہے مگر جو کچھ ہمارے پاس موجود ہے اس کا سارا حسن ایک روز ماند پڑ جائے گا۔

پھل جب شاخ سے جدا ہو جاتا ہے تو وہ بتدریج سیاہ ہونے لگتا ہے اور بالآخر گل سڑ جاتا ہے۔ پھولوں کی مہک محدود وقت کیلئے ہمارے کمروں کو مشک بار کرتی ہے۔ یہ پھول جلد ہی مرجھا جاتے ہیں۔ حسین و جمیل چہروں پر چند دہائیوں کے بعد جھریاں پڑ جاتی ہیں: جلد پر برسوں کے گزرنے سے اثر پڑتا ہے اور سفید بال اس خوبصورت چہرے کو دوسرے بوڑھے انسانوں کے چہروں سے مختلف نہیں رہنے دیتے۔ صحت مند رنگت کا کوئی نشان بھی تو نہیں بچ رہتا اور کئی برس گزرنے کے بعد ایک نوعمر کے سرخ گال اپنی خوبصورتی کھو بیٹھتے ہیں۔ عمارتوں کو وقتاً فوقتاً مرمت اور رنگ و روغن کی ضرورت رہتی ہے گاڑیاں پرانے ماڈلوں میں شمار ہونے لگتی ہیں اور ان کی حالت بڑی خستہ ہو جاتی ہے، انہیں زنگ لگ جاتا ہے...... مختصراً ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہر وہ شے جو ہمارے آس پاس ہے وہ وقت کی تباہ کاریوں سے نہیں بچ سکتی۔ کچھ لوگوں کو یہ سب کچھ ایک ''قدرتی عمل'' دکھائی دیتا ہے۔ تاہم اس میں ایک واضح پیغام ہوتا ہے کہ ''کوئی شے بھی وقت کے اثرات سے محفوظ نہیں رہ سکتی''۔

اس سب سے بڑھ کر یہ کہ ہر پودا، جانور اور انسان بلکہ یوں کہئے کہ اس دنیا کی ہر جاندار چیز فانی ہے۔ یہ اپنی جگہ ایک حقیقت سہی کہ پیدائش انسانی کی وجہ سے صدیاں گزرنے پر دنیا کی آبادی سکڑتی نہیں مگر ہمیں اس بات کو نظر انداز نہیں کرنا چاہئے کہ موت بھی اپنی جگہ ایک حقیقت ہے۔

تاہم ایک بے لگام خواہش کے طور پر مال واسباب اور دولت دنیا کا سحر انسان کو بری طرح متاثر کرتا ہے۔ مال واسباب کا لالچ اس کی عقل پر پردہ ڈال کر اسے اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ تاہم ایک بات کو سمجھنے کی کوشش کرنی چاہئے: کہ اللہ ہی ہر شے کا مالک کل ہے۔ جاندار چیزیں اسی وقت تک زندہ رہتی ہیں جب تک وہ چاہتا ہے اور وہ مر جاتی ہیں جب اللہ ان کی موت کا پروانہ جاری کر دیتا ہے۔

درج ذیل سورۃ میں اللہ انسان کو سوچنے سمجھنے کی دعوت دے رہا ہے:

اِنَّمَا مَثَلُ الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا كَمَآءٍ اَنْزَلْنٰهُ مِنَ السَّمَآءِ فَاخْتَلَطَ بِهٖ نَبَاتُ الْاَرْضِ مِمَّا یَاْكُلُ النَّاسُ وَ الْاَنْعَامُ ؕ حَتّٰۤى اِذَاۤ اَخَذَتِ الْاَرْضُ زُخْرُفَهَا وَ ازَّیَّنَتْ وَ ظَنَّ اَهْلُهَاۤ اَنَّهُمْ قٰدِرُوْنَ عَلَیْهَاۤ ۙ اَتٰىهَاۤ اَمْرُنَا لَیْلًا اَوْ نَهَارًا فَجَعَلْنٰهَا حَصِیْدًا كَاَنْ لَّمْ تَغْنَ بِالْاَمْسِ ؕ كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰیٰتِ لِقَوْمٍ یَّتَفَكَّرُوْنَ ○

”دنیا کی یہ زندگی (جس کے نشے میں مست ہو کر تم ہماری نشانیوں سے غفلت برت رہے ہو) اس کی مثال ایسی ہے جیسے آسمان سے ہم نے پانی برسایا تو زمین کی پیداوار' جسے آدمی اور جانور سبھی کھاتے ہیں' خوب گھنی ہو گئی پر عین اس وقت جبکہ زمین اپنی بہار پر تھی اور کھیتیاں بنی سنوری کھڑی تھیں اور ان کے مالک سمجھ رہے تھے کہ اب ہم ان سے فائدہ اُٹھانے پر قادر ہیں یکا یک رات کو یا دن کو ہمارا حکم آ گیا اور ہم نے اسے ایسا غارت کر کے رکھ دیا کہ گویا کل وہاں کچھ تھا ہی نہیں۔ اس طرح ہم نشانیاں کھول کھول کر پیش کرتے ہیں ان لوگوں کے لئے جو سوچنے سمجھنے والے ہیں (تم اس ناپائیدار زندگی کے فریب میں مبتلا ہو رہے ہو)“۔ (سورۃ یونس: 24)

اس قرآنی سورۃ میں بتایا گیا ہے کہ اس کرۂ ارض کی ہر وہ شے جو عمدہ اور خوبصورت دکھائی دیتی ہو ایک روز اپنی خوبصورتی کھو بیٹھے گی۔ مزید یہ کہ ایسی تمام چیزیں ایک روز صفحۂ ہستی سے مٹ جائینگی۔ یہ ایک نہایت اہم بات ہے۔ جس پر ہمیں غور و فکر کرنا چاہئے' اسلئے کہ اللہ ہمیں اس بارے میں مطلع فرماتا ہے اور اس قسم کی مثالیں دیتا ہے جو ان لوگوں کیلئے ہوتی ہیں جو ”سوچتے سمجھتے اور غور کرتے ہیں“۔ بطور ایک ذہین مخلوق کے انسان سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ سوچے گا' واقعات سے سبق حاصل کرے گا اور پھر اپنی زندگی کیلئے استدلالی مقاصد کا تعین کرلے گا۔

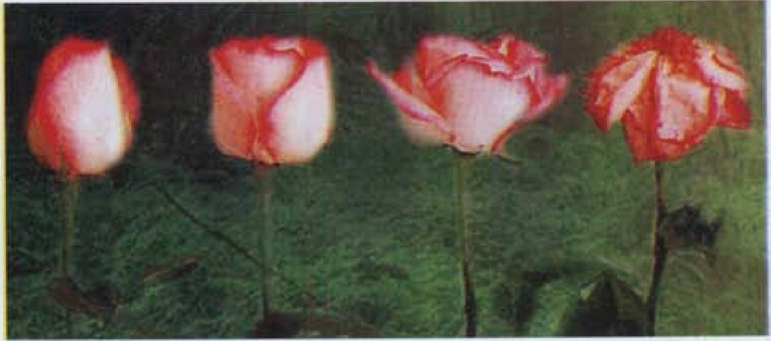






قرآن کریم میں، جو انسان کیلئے آخری وحیِ الٰہی ہے، اللہ تعالٰی نے ہماری توجہ بار بار اس دنیا کی عارضی حقیقت کی طرف دلائی ہے تاکہ ہمارے دل و دماغ اس حقیقت کے بارے میں پوری طرح آگاہ ہو جائیں۔ واقعہ یہ ہے کہ ہم خواہ کہیں بھی رہتے ہوں دنیاوی زندگی کے تغیر و تبدل کے سامنے لاچار ہیں۔ یہ بات اُن لوگوں پر بالکل عیاں ہے جو اپنے گرد و پیش کا اور اپنی زندگی کا مشاہدہ کرتے رہتے ہیں۔ یہ سفاک حقیقت تمام قسم کی دنیاوی خوبصورتیوں کیلئے بھی اتنی ہی اٹل ہے۔ اس صفحے پر ہر تصویر اس سچائی کی مظہر ہے۔ دنیا کے کسی بھی کونے میں، خواہ کتنی ہی بے مثال خوبصورتی کیوں نہ ہو، چند عشروں میں زوال پذیر ہو جاتی ہے اور بسا اوقات اس سے بھی کم وقت میں۔ اتنے کم وقت میں جو ہمارے تخمینوں سے کہیں کم ہوتا ہے۔









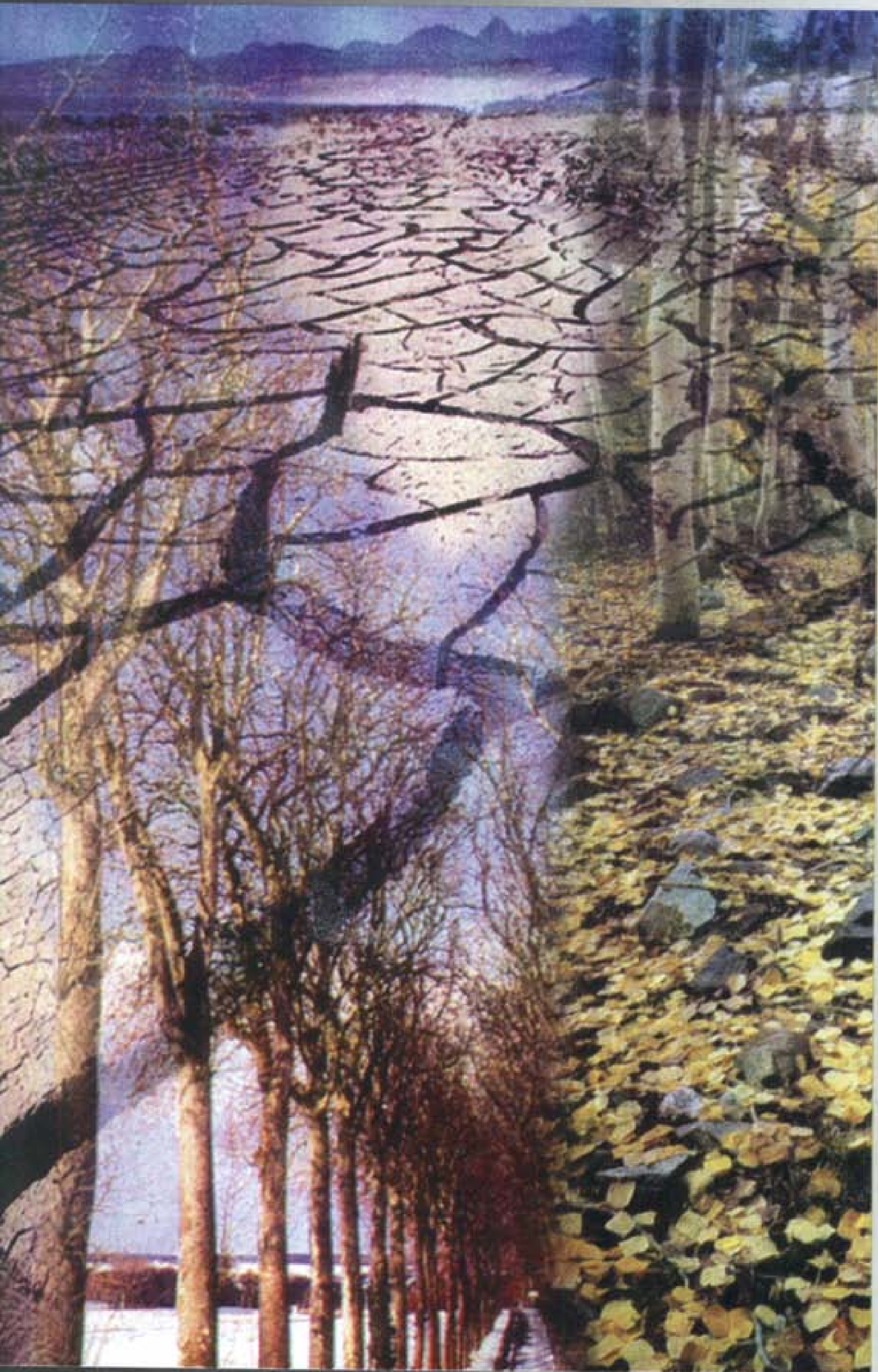




کرۂ ارض پر موجود ہر شے کا مقدر تباہ ہو جانا ہے۔ دنیاوی زندگی کا یہ خاصا ہے...... اور ایسا ہونا قدرتی امر ہے۔



''سوچنا'' اور ''سمجھنا'' انسان کے بے مثال اوصاف ہیں' ان کے بغیر انسان میں اپنے امتیازی خدوخال میں کمی آ جاتی ہے اور وہ جانوروں کی سطح سے بھی نیچے گر جاتا ہے۔ جانور بھی ایسی زندگی گزارتے ہیں جو کئی لحاظ سے انسانی زندگی جیسی ہوتی ہے: یہ سانس لیتے ہیں' افزائش نسل کرتے ہیں اور پھر ایک روز مر جاتے ہیں۔ جانور یہ کبھی نہیں سوچتے کہ وہ کیسے اور کیوں پیدا ہوئے یا یہ کہ ایک روز انہیں مر جانا ہے۔ قدرتی بات ہے کہ وہ زندگی کے حقیقی مقصد کے بارے میں سمجھنے کی بھی کوشش نہیں کرتے۔ ان سے یہ توقع بھی نہیں کی جا سکتی کہ وہ اپنی تخلیق کے مقصد کے بارے میں یا اپنے خالق کے بارے میں سوچیں گے۔





تاہم انسان اس بات کیلئے اللہ کے حضور جوابدہ ہے کہ وہ غوروخوض کے ذریعے اللہ کا شعور تعمیر کرے اور اس ذات باری تعالیٰ کے احکامات کی بجا آوری کا خیال رکھے۔ مزید یہ کہ اُس سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ یہ سمجھنے کی کوشش کرے کہ یہ دنیا ایک محدود سی مدت کیلئے ہے۔ وہ لوگ جو واقعی ان حقائق کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں انہیں اللہ کی رہنمائی حاصل ہوتی ہے اور ان کا پروردگار انہیں وہ روشنی عطا کرتا ہے جس سے وہ اچھے کاموں میں مصروف رہتے ہیں۔

بصورت دیگر انسان اس دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی اذیتیں جھیلتا ہے۔ وہ دولت مند تو ہو جاتا ہے مگر اسے خوشی و مسرت کبھی حاصل نہیں ہوتی۔ حسن و خوبصورتی اور شہرت و ناموری عموماً پر مسرت زندگی کے بجائے بدقسمتی کا پیش خیمہ بنتی ہیں۔ مثال کے طور پر ایک مشہور اور نامور انسان جو کبھی اپنے مداحوں اور پرستاروں کی خوشامدانہ باتوں سے لطف اندوز ہوتا ہے۔ خرابیٔ صحت کے شدید اور پریشان کن مسائل میں گھر جاتا ہے۔ پھر ایک دن وہ کسی ہوٹل کے کمرے میں اس وقت مر جاتا ہے جہاں کوئی بھی اس کی نگہداشت کرنے والا نہیں ہوتا۔

گمراہ کن دنیا کے بارے میں قرآنی مثالیں

اللہ نے قرآن حکیم میں بار بار اس بات کا تذکرہ فرمایا ہے کہ یہ دنیا محض ایسی خوشیوں کی آماجگاہ ہے جنہیں ایک روز ختم ہو جانا ہے۔ خالق کائنات ماضی کے ان مردوں اور عورتوں کے قصے بیان فرماتا ہے جو اپنی قابل رشک صحت' شہرت اور سماجی مرتبے پر بڑے خوش ہوتے تھے مگر انجام کیا ہوا؟ ان کی زندگی ایک روز نہایت تباہ کن اختتام کو پہنچی۔ یہی کچھ تو سورۃ الکھف میں مذکور دو انسانوں کے ساتھ پیش آیا تھا۔

وَاضْرِبْ لَهُمْ مَّثَلًا رَّجُلَيْنِ جَعَلْنَا لِأَحَدِهِمَا جَنَّتَيْنِ مِنْ أَعْنَابٍ وَّحَفَفْنٰهُمَا بِنَخْلٍ وَّجَعَلْنَا بَيْنَهُمَا زَرْعًا ۝ كِلْتَا الْجَنَّتَيْنِ اٰتَتْ أُكُلَهَا وَلَمْ تَظْلِمْ مِّنْهُ شَيْئًا وَّفَجَّرْنَا خِلٰلَهُمَا نَهَرًا ۝ وَّكَانَ لَهٗ ثَمَرٌ فَقَالَ لِصَاحِبِهٖ وَهُوَ يُحَاوِرُهٗٓ أَنَا أَكْثَرُ مِنْكَ مَالًا وَّأَعَزُّ نَفَرًا ۝ وَدَخَلَ جَنَّتَهٗ وَهُوَ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ ۚ قَالَ مَآ أَظُنُّ أَنْ تَبِيْدَ هٰذِهٖٓ أَبَدًا ۝ وَّمَآ أَظُنُّ السَّاعَةَ قَآئِمَةً ۙ وَّلَئِنْ رُّدِدْتُّ إِلٰى رَبِّيْ لَأَجِدَنَّ خَيْرًا مِّنْهَا مُنْقَلَبًا ۝ قَالَ لَهٗ صَاحِبُهٗ وَهُوَ يُحَاوِرُهٗٓ

اَكَفَرْتَ بِالَّذِيْ خَلَقَكَ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ سَوّٰىكَ رَجُلًا o لٰكِنَّا
هُوَ اللّٰهُ رَبِّيْ وَلَآ اُشْرِكُ بِرَبِّيْٓ اَحَدًا o وَلَوْلَآ اِذْ دَخَلْتَ جَنَّتَكَ قُلْتَ
مَاشَآءَ اللّٰهُ لا لَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ ج اِنْ تَرَنِ اَنَا اَقَلَّ مِنْكَ مَالًا وَّ وَلَدًا o فَعَسٰى
رَبِّيْٓ اَنْ يُّؤْتِيَنِ خَيْرًا مِّنْ جَنَّتِكَ وَ يُرْسِلَ عَلَيْهَا حُسْبَانًا مِّنَ السَّمَآءِ
فَتُصْبِحَ صَعِيْدًا زَلَقًا o اَوْ يُصْبِحَ مَآؤُهَا غَوْرًا فَلَنْ تَسْتَطِيْعَ لَهٗ طَلَبًا o وَ
اُحِيْطَ بِثَمَرِهٖ فَاَصْبَحَ يُقَلِّبُ كَفَّيْهِ عَلٰى مَآ اَنْفَقَ فِيْهَا وَ هِيَ خَاوِيَةٌ عَلٰى
عُرُوْشِهَا وَيَقُوْلُ يٰلَيْتَنِيْ لَمْ اُشْرِكْ بِرَبِّيْٓ اَحَدًا o وَلَمْ تَكُنْ لَّهٗ فِئَةٌ
يَّنْصُرُوْنَهٗ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَ مَا كَانَ مُنْتَصِرًا o هُنَالِكَ الْوَلَايَةُ لِلّٰهِ الْحَقِّ ط
هُوَ خَيْرٌ ثَوَابًا وَّ خَيْرٌ عُقْبًا o وَاضْرِبْ لَهُمْ مَّثَلَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا كَمَآءٍ
اَنْزَلْنٰهُ مِنَ السَّمَآءِ فَاخْتَلَطَ بِهٖ نَبَاتُ الْاَرْضِ فَاَصْبَحَ هَشِيْمًا تَذْرُوْهُ
الرِّيٰحُ ط وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ مُّقْتَدِرًا o اَلْمَالُ وَ الْبَنُوْنَ زِيْنَةُ الْحَيٰوةِ
الدُّنْيَا ج وَالْبٰقِيٰتُ الصّٰلِحٰتُ خَيْرٌ عِنْدَ رَبِّكَ ثَوَابًا وَّ خَيْرٌ اَمَلًا o

''اے نبیؐ ان کے سامنے ایک مثال پیش کرو۔ دو شخص تھے۔ ان میں سے ایک کو ہم نے انگور کے دو باغ دیئے اور ان کے گرد کھجور کے درختوں کی باڑھ لگائی اور ان کے درمیان کاشت کی زمین رکھی۔ دونوں باغ خوب پھلے پھولے اور بارآور ہونے میں انہوں نے ذرا سی کسر بھی نہ چھوڑی۔ ان باغوں کے اندر ہم نے ایک نہر جاری کر دی اور اسے خوب نفع حاصل ہوا۔ یہ کچھ پا کر ایک دن وہ اپنے ہمسائے سے بات کرتے ہوئے بولا: میں تجھ سے زیادہ مالدار ہوں اور تجھ سے زیادہ طاقتور نفری رکھتا ہوں۔ پھر وہ اپنی جنت میں داخل ہوا اور اپنے نفس کے حق میں ظالم بنکر کہنے لگا: میں نہیں سمجھتا کہ یہ دولت کبھی فناہ ہو جائے گی اور مجھے توقع نہیں کہ قیامت کی گھڑی کبھی آئے گی۔ تاہم اگر کبھی مجھے اپنے رب کے حضور پلٹایا بھی گیا تو ضرور اس سے بھی زیادہ شاندار جگہ پاؤں گا۔ اس کے ہمسائے نے گفتگو کرتے ہوئے اس سے کہا: کیا تو کفر کرتا ہے اس ذات سے جس نے تجھے مٹی سے اور پھر نطفے سے پیدا کیا اور تجھے ایک پورا آدمی بنا کھڑا کیا؟ رہا میں تو میرا ربّ تو وہی اللہ ہے اور میں اس کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کرتا اور جب تو اپنی جنت میں داخل ہو رہا تھا تو اس وقت تیری زبان سے یہ کیوں نہ نکلا کہ ماشاء اللہ لاقوۃ اِلّا باللہ؟ اگر تو مجھے مال اور اولاد

میں اپنے سے کم تر پا رہا ہے تو بعید نہیں کہ میرا ربّ مجھے تیری جنت سے بہتر عطا فرما دے اور تیری جنت پر آسمان سے کوئی آفت بھیج دے جس سے وہ صاف صاف میدان بن کر رہ جائے یا اس کا پانی زمین میں اُتر جائے اور پھر تو اسے کسی طرح نہ نکال سکے۔ آخر کار ہوا یہ کہ اس کا سارا ثمرہ مارا گیا اور وہ اپنے انگوروں کے باغ کو ٹٹیوں پر اُلٹا پڑا دیکھ کر اپنی لگائی ہوئی لاگت پر ہاتھ ملتا رہ گیا اور کہنے لگا: کاش! میں نے اپنے ربّ کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرایا ہوتا۔ نہ ہوا اللہ کو چھوڑ کر اس کے پاس کوئی جتھا کہ اس کی مدد کرتا اور نہ کر سکا وہ آپ ہی اس آفت کا مقابلہ...... اس وقت معلوم ہوا کہ کارسازی کا اختیار خدائے برحق ہی کے لئے ہے انعام وہی بہتر ہے جو وہ بخشے اور انجام وہی بخیر ہے جو وہ دکھائے۔

اور اے نبیؐ انہیں حیات دنیا کی حقیقت اس مثال سے سمجھاؤ کہ آج ہم نے آسمان سے پانی برسا دیا تو زمین کی پود خوب گھنی ہوگئی اور کل وہی نباتات بھس بن کر رہ گئی جسے ہوائیں اُڑائے لئے پھرتی ہیں۔ اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔ یہ مال اور یہ اولاد محض دنیوی زندگی کی ایک ہنگامی آرائش ہے۔ اصل میں تو باقی رہ جانے والی نیکیاں ہی تیرے ربّ کے نزدیک نتیجے کے لحاظ سے بہتر ہیں اور انہیں سے اچھی اُمیدیں وابستہ کی جاسکتی ہیں''۔ (سورۃ الکھف : 32-46)

جب کوئی انسان اپنے مال واسباب پر غرور وتکبر کرتا یا شیخی بھگارتا ہے تو اپنے آپ کو مضحکہ خیز بنا لیتا ہے۔ یہ اللہ کا دائمی اور غیر متغیر قانون ہے دولت اور طاقت اللہ کی طرف سے انعامات کے طور پر عطا ہوتے ہیں اور وہ جب چاہے انہیں واپس لے سکتا ہے۔ باغ والوں کے قصے میں اس کی ایک اور مثال قرآن حکیم میں اس طرح بیان فرمائی گئی ہے۔

اِنَّا بَلَوْنٰهُمْ كَمَا بَلَوْنَآ اَصْحٰبَ الْجَنَّةِ ۚ اِذْ اَقْسَمُوْا لَيَصْرِمُنَّهَا مُصْبِحِيْنَ ۝ وَلَا يَسْتَثْنُوْنَ ۝ فَطَافَ عَلَيْهَا طَآئِفٌ مِّنْ رَّبِّكَ وَهُمْ نَآئِمُوْنَ ۝ فَاَصْبَحَتْ كَالصَّرِيْمِ ۝ فَتَنَادَوْا مُصْبِحِيْنَ ۝ اَنِ اغْدُوْا عَلٰى حَرْثِكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰرِمِيْنَ ۝ فَانْطَلَقُوْا وَهُمْ يَتَخَافَتُوْنَ ۝ اَنْ لَّا يَدْخُلَنَّهَا الْيَوْمَ عَلَيْكُمْ مِّسْكِيْنٌ ۝ وَّغَدَوْا عَلٰى حَرْدٍ قٰدِرِيْنَ ۝ فَلَمَّا رَاَوْهَا قَالُوْٓا اِنَّا لَضَآلُّوْنَ ۝ بَلْ نَحْنُ مَحْرُوْمُوْنَ ۝ قَالَ اَوْسَطُهُمْ اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ لَوْلَا تُسَبِّحُوْنَ ۝ قَالُوْا سُبْحٰنَ رَبِّنَآ اِنَّا كُنَّا ظٰلِمِيْنَ ۝ فَاَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ

يَتَلَاوَمُوْنَ ○ قَالُوْا يٰوَيْلَنَآ اِنَّا كُنَّا طٰغِيْنَ ○ عَسٰى رَبُّنَآ اَنْ يُّبْدِلَنَا خَيْرًا مِّنْهَآ اِنَّآ اِلٰى رَبِّنَا رٰغِبُوْنَ ○ كَذٰلِكَ الْعَذَابُ ط وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَكْبَرُ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ○

"ہم نے ان (اہل مکہ) کو اُسی طرح آزمائش میں ڈالا ہے جس طرح ایک باغ کے مالکوں کو آزمائش میں ڈالا تھا۔ جب انہوں نے قسم کھائی کہ صبح سویرے ضرور اپنے باغ کے پھل توڑیں گے اور وہ کوئی استثناء نہیں کر رہے تھے۔ رات کو وہ سوئے پڑے تھے کہ تمہارے ربّ کی طرف سے ایک بلا اس باغ میں پھر گئی اور اسکا ایسا حال ہوگیا جیسے کٹی ہوئی فصل ہو۔ صبح ان لوگوں نے ایک دوسرے کو پکارا کہ اگر پھل توڑنے ہیں تو سویرے سویرے اپنی کھیتی کی طرف نکل چلو۔ چنانچہ وہ چل پڑے اور آپس میں چپکے چپکے کہتے جاتے تھے کہ آج کوئی مسکین تمہارے پاس باغ میں نہ آنے پائے۔

وہ کچھ نہ دینے کا فیصلہ کئے ہوئے صبح سویرے جلدی جلدی اس طرح وہاں گئے جیسے کہ وہ (پھل توڑنے پر) قادر ہیں۔ مگر جب باغ کو دیکھا تو کہنے لگے: ہم راستہ بھول گئے ہیں...... نہیں بلکہ ہم محروم رہ گئے۔

ان میں جو سب سے بہتر آدمی تھا اس نے کہا: میں نے تم سے کہا نہ تھا کہ تم تسبیح کیوں نہیں کرتے؟ وہ پکار اُٹھے: پاک ہے ہمارا ربّ واقعی ہم گنہگار تھے پھر ان میں سے ہر ایک دوسرے کو ملامت کرنے لگا۔ آخر کو انہوں نے کہا: افسوس ہمارے حال پر، بے شک ہم سرکش ہوگئے تھے بعید نہیں کہ ہمارا ربّ ہمیں اس سے بہتر باغ عطا فرمائے۔ ہم اپنے ربّ کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ ایسا ہوتا ہے عذاب اور آخرت کا عذاب اس سے بھی بڑا ہے کاش یہ لوگ اس کو جانتے"۔

(سورۃ القلم : 17-33)

بینا آنکھ تو ان آیات سے فوراً یہ پہچان جاتی ہے کہ اللہ نے اس قصّے میں ملحدین اور منکرین خدا کی مثالیں پیش نہیں کی ہیں۔ یہاں جن کا ذکر ہے وہ بالکل وہی ہیں جو اللہ پر ایمان تو رکھتے ہیں مگر ان کے دل اس کی یاد سے غافل ہوگئے ہیں اور جو اپنے خالق کے شکر گزار بندے نہیں رہے۔ اللہ نے ان پر جو کرم اور مہربانیاں کی ہیں وہ ان پر اتراتے ہیں اور یہ بھول جاتے ہیں کہ اس مال و دولت میں سے اس کی راہ میں انہیں خرچ کرنا چاہئے۔ ایک خاص انداز میں وہ اللہ کے وجود اور طاقت کی تصدیق تو کرتے ہیں مگر ان کے دلوں میں غرور و تکبر آجاتا ہے، خواہشیں اور خود غرضی انہیں گھیر لیتی ہیں۔





وَاضْرِبْ لَهُمْ مَّثَلَ الْحَيٰوةِ
الدُّنْيَا كَمَآءٍ اَنْزَلْنٰهُ مِنَ
السَّمَآءِ فَاخْتَلَطَ بِهٖ نَبَاتُ
الْاَرْضِ فَاَصْبَحَ هَشِيْمًا
تَذْرُوْهُ الرِّيٰحُ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ
عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ مُّقْتَدِرًا ○

اور اے نبیؐ انہیں حیات دنیا کی حقیقت
اس مثال سے سمجھاؤ کہ آج ہم نے
آسمان سے پانی برسا دیا تو زمین کی پود
خوب گھنی ہو گئی۔ اور کل وہی نباتات
بھس بن کر رہ گئی جسے ہوائیں اڑائے
لئے پھرتی ہیں اور اللہ ہر چیز پر قدرت
رکھتا ہے۔ (سورۃ الکہف: 45)

قرآن حکیم میں حضرت موسیٰ کی قوم کے ایک شخص قارون کا قصہ بیان فرمایا گیا ہے۔اس میں اوّلین نمونے کے متمول دنیاوی کردار کی مثال دی گئی ہے۔قارون اور وہ انسان جو جاہ ومرتبے اور دولت کی خواہش رکھتے ہیں دونوں ایسے نام نہاد ایمان والے ہیں جو مال واسباب کی خاطر مذہب کو دور ہٹا دیتے ہیں اور یوں اس دائمی انعامات والی زندگی کو کھو بیٹھتے ہیں جس کا نقصان ان کیلئے ایک دائمی محرومی بن جاتا ہے۔

''یہ ایک واقعہ ہے کہ قارون موسیٰ کی قوم کا ایک شخص تھا۔پھر وہ اپنی قوم کے خلاف سرکش ہوگیا اور ہم نے اس کو اتنے خزانے دے رکھے تھے کہ ان کی کنجیاں طاقتور آدمیوں کی ایک جماعت مشکل سے اُٹھا سکتی تھی۔ایک دفعہ جب اس کی قوم کے لوگوں نے اس سے کہا: پھول نہ جا اللہ پھولنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔جو مال اللہ نے تجھے دیا ہے اس سے آخرت کا گھر بنانے کی فکر کر اور دنیا میں سے بھی اپنا حصہ فراموش نہ کر۔احسان کر جس طرح اللہ نے تیرے ساتھ احسان کیا ہے اور زمین میں فساد برپا کرنے کی کوشش نہ کر' اللہ مفسدوں کو پسند نہیں کرتا۔تو اس نے کہا: یہ سب کچھ تو مجھے اس علم کی بنا پر دیا گیا ہے جو مجھ کو حاصل ہے...... کیا اس کو یہ علم نہ تھا کہ اللہ اس سے پہلے بہت سے ایسے لوگوں کو ہلاک کر چکا ہے جو اس سے زیادہ قوت اور جمعیت رکھتے تھے؟ مجرموں سے تو ان کے گناہ نہیں پوچھے جاتے۔

ایک روز وہ اپنی قوم کے سامنے اپنے پورے ٹھاٹھ میں نکلا۔جو لوگ حیات دنیا کے طالب تھے وہ اسے دیکھ کر کہنے لگے: کاش ہمیں بھی وہی کچھ ملتا جو قارون کو دیا گیا ہے۔یہ تو بڑے نصیبے والا ہے۔مگر جو لوگ علم رکھنے والے تھے وہ کہنے لگے: افسوس تمہارے حال پر' اللہ کا ثواب بہتر ہے اس شخص کیلئے جو ایمان لائے اور نیک عمل کرے اور یہ دولت نہیں ملتی مگر صبر کرنے والوں کو۔

آخر کار ہم نے اسے اور اس کے گھر کو زمین میں دھنسا دیا۔پھر کوئی اس کے حامیوں کا گروہ نہ تھا جو اللہ کے مقابلے میں اسکی مدد کو آتا۔اور نہ وہ خود اپنی مدد آپ کر سکا۔اب وہی لوگ جو کل اس کی منزلت کی تمنا کر رہے تھے کہنے لگے: افسوس ہم بھول گئے تھے کہ اللہ اپنے بندوں میں سے جس کا رزق چاہتا ہے کشادہ کرتا ہے اور جسے چاہتا ہے نپا تُلا دیتا ہے۔اگر اللہ نے ہم پر احسان نہ کیا ہوتا تو ہمیں بھی زمین میں دھنسا دیتا۔افسوس ہم کو یاد نہ رہا کہ کافر فلاح نہیں پایا کرتے۔

تِلْكَ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِيْنَ لَا يُرِيْدُوْنَ عُلُوًّا فِي الْاَرْضِ وَ لَا فَسَادًا ؕ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ○

''وہ آخرت کا گھر تو ہم ان لوگوں کیلئے مخصوص کر دیں گے جو زمین میں اپنی بڑائی نہیں چاہتے اور نہ فساد کرنا چاہتے ہیں اور انجام کی بھلائی متقین ہی کیلئے ہے''۔

(سورۃ القصص :76-84)

سب سے زیادہ غلط کام تو قارون نے یہ کیا تھا کہ اس نے اللہ سے الگ تھلگ اپنی ایک آزاد حیثیت تصور کر لی تھی۔ بیشک جیسا کہ اس سورۃ میں ذکر ہوا اس نے اللہ کے وجود سے انکار نہیں کیا تھا بلکہ صرف یہ تصور کر لیا تھا کہ محض اپنی اعلیٰ وارفع صفات کی بنا پر وہ اس طاقت اور دولت کا مستحق تھا جو اسے اللہ نے دی تھی۔ تاہم دنیا کے تمام لوگ اللہ کے نوکر و غلام ہیں اور ان کا سارا مال و اسباب انہیں اس لئے نہیں دیا گیا کہ وہ اس کے مستحق تھے۔ بلکہ انسان کو جو کچھ ملتا ہے اللہ کی مہربانی سے ملتا ہے۔ وہ اس حقیقت کو سمجھ لے تو پھر وہ کبھی ناشکر گزار نہ ہوگا اور نہ ہی اپنے مال و اسباب کی وجہ سے خالق کائنات کا نافرمان بنے گا۔ وہ اللہ کا شکر گزار بندہ بن کر اچھے اعمال کرے گا۔ یقیناً یہ اللہ کا شکر گزار بندہ بننے کا بہترین اور نہایت قابل عزت طریقہ ہے۔ دوسری جانب قارون اور وہ لوگ جو اس کی طرح بننا چاہتے ہیں انہیں صرف اس وقت اپنے ان بُرے کاموں کا

اِنَّمَا مَثَلُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا كَمَآءٍ اَنْزَلْنٰهُ مِنَ السَّمَآءِ فَاخْتَلَطَ بِهٖ نَبَاتُ الْاَرْضِ مِمَّا يَاْكُلُ النَّاسُ وَالْاَنْعَامُ ؕ حَتّٰٓى اِذَآ اَخَذَتِ الْاَرْضُ زُخْرُفَهَا وَازَّيَّنَتْ وَ ظَنَّ اَهْلُهَآ اَنَّهُمْ قٰدِرُوْنَ عَلَيْهَآ ۙ اَتٰىهَآ اَمْرُنَا لَيْلًا اَوْ نَهَارًا فَجَعَلْنٰهَا حَصِيْدًا كَاَنْ لَّمْ تَغْنَ بِالْاَمْسِ ؕ كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ○

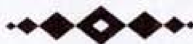
''اس کی مثال ایسی ہے جیسے آسمان سے ہم نے پانی برسایا تو زمین کی پیداوار جسے آدمی اور جانور سب کھاتے ہیں خوب گھنی ہوگئی۔ پھر عین اس وقت جبکہ زمین اپنی بہار پر تھی اور کھیتیاں بنی سنوری کھڑی تھیں اور ان کے مالک سمجھ رہے تھے کہ اب ہم ان سے فائدہ اٹھانے پر قادر ہیں۔ یکا یک رات کو یا دن کو ہمارا حکم آ گیا اور ہم نے اسے ایسا غارت کر کے رکھ دیا کہ گویا کل وہاں کچھ تھا ہی نہیں۔ اس طرح ہم نشانیاں کھول کھول کر پیش کرتے ہیں ان لوگوں کیلئے جو سوچنے سمجھنے والے ہیں (تم اس ناپائیدار زندگی کے فریب میں مبتلا ہو رہے ہو)'' (سورۃ یونس : 24)

احساس ہوتا ہے جب کوئی تباہی ان پر نازل ہو جاتی ہے۔ بالآخر جو نقصان انہیں پہنچتا ہے اگر وہ مسلسل اللہ کے خلاف بغاوت پر آمادہ رہتے ہیں تو انہیں بُری طرح تباہ و برباد کر دیا جاتا ہے۔ ان کا یہ انجام اٹل ہو جاتا ہے۔ ان کا ٹھکانہ جہنم ہوگا جو ایک ایسا بُرا ٹھکانہ ہے جس میں انہیں ہمیشہ کیلئے رہنا ہوگا:

اِعْلَمُوْٓا اَنَّمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَّ لَهْوٌ وَّ زِيْنَةٌ وَّ تَفَاخُرٌۢ بَيْنَكُمْ وَ تَكَاثُرٌ فِى الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِ ؕ كَمَثَلِ غَيْثٍ اَعْجَبَ الْكُفَّارَ نَبَاتُهٗ ثُمَّ يَهِيْجُ فَتَرٰىهُ مُصْفَرًّا ثُمَّ يَكُوْنُ حُطَامًا ؕ وَ فِى الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ شَدِيْدٌ ۙ وَّ مَغْفِرَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَ رِضْوَانٌ ؕ وَ مَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ ۝

”خوب جان لو کہ یہ دنیا کی زندگی اس کے سوا کچھ نہیں کہ ایک کھیل اور دل لگی اور ظاہری ٹیپ ٹاپ اور تمہارا آپس میں ایک دوسرے پر فخر جتانا اور مال و اولاد میں ایک دوسرے سے بڑھ جانے کی کوشش کرنا ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک بارش ہوگئی تو اس سے پیدا ہونے والی نباتات کو دیکھ کر کاشت کار خوش ہو گئے۔ پھر وہی کھیتی پک جاتی ہے اور تم دیکھتے ہو کہ وہ زرد ہو گئی۔ پھر وہ بھس بن کر رہ جاتی ہے اور اس کے برعکس آخرت ایک جگہ ہے جہاں سخت عذاب ہے اور اللہ کی مغفرت اور اسکی خوشنودی ہے۔ دنیا کی زندگی ایک دھوکے کے سوا کچھ نہیں۔

(سورۃ الحدید : 20)



انسانی کمزوریاں

اللہ نے آدمی کو ایک نہایت جامع و مکمل حالت میں تخلیق کیا اور پھر اسے اعلیٰ و ارفع صفات عطا کیں۔ اُسے اپنی سوچ سمجھ اور سیکھنے کی صلاحیت اور ثقافتی عمل سے گزرنے کی استعداد پیدا کرنے کی صلاحیت اور امتیازی دانشورانہ تجربوں کی بنا پر دوسری تمام مخلوقات پر فضیلت حاصل ہے۔اس بارے میں دو آراءنہیں ہوسکتیں۔

آپ نے کبھی یہ سوچا ہے کہ ان تمام اعلیٰ صفات کے باوجود انسان کا جسم اسقدر نازک کیوں ہے کہ ہمیشہ بیرونی اور اندرونی خطرات کی زد میں رہتا ہے؟ اس پر جرثومے کیوں حملہ آور ہونے کو تیار رہتے ہیں حالانکہ وہ خود اسقدر چھوٹے ہوتے ہیں کہ انسانی آنکھ کو نظر ہی نہیں آتے۔ انسان دن کا زیادہ وقت اسے صاف ستھرا رکھنے میں کیوں لگا رہتا ہے؟ اسے اپنے جسم کی اسقدر حفاظت اور نگہداشت کی ضرورت کیوں پیش آتی ہے؟ یہ وقت گزرنے پر بوڑھا کیوں ہوجاتا ہے؟

لوگوں کا خیال ہے کہ یہ ایک قدرتی امر ہے۔انسان کو ایک خاص مقصد کیلئے اسکی نگہداشت کرنے کی ضرورت پڑتی ہے۔انسانی ضرورتوں کی تفصیل بطورخاص تخلیق کی گئی ہے۔یہ قرآنی آیت وَخُلِقَ الْاِنْسَانُ ضَعِيفًا ٥ ''انسان کو کمزور پیدا کیا گیا ہے'' (سورۃ النساء: 28) اس حقیقت کو واضح کرتی ہے۔انسان کی لامحدود ضرورتوں کو ایک خاص مقصد کے تحت تخلیق کیا گیا ہے تاکہ اسے یہ سمجھا دیا جائے کہ وہ اللہ کا غلام ہے اور یہ دنیا اس کا عارضی مسکن ہے۔

انسان کو اپنے مقام پیدائش اور تاریخ پیدائش پر کوئی اختیار حاصل نہیں۔اسی طرح نہ ہی وہ یہ جانتا ہے کہ اس کی موت کہاں اور کب ہوگی۔مزید یہ کہ جو جو باتیں اس کی زندگی پر منفی اثرات

مرتب کر رہی ہیں انہیں ختم کرنا اس کے بس میں نہیں ہے۔ سعیٔ نا کام ہے اسے مایوسی ہوگی۔

انسان ایک نازک طبیعت لئے پیدا ہوتا ہے اور زندہ رہنے کے لئے اسے بڑی نگہداشت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس دنیا میں اچانک رونما ہونے والے واقعات کے سامنے وہ اپنے آپ کو کمزور اور غیر محفوظ محسوس کرتا ہے۔ بعینہٖ وہ خرابیٔ صحت وتندرستی کے ان خطرات کی زد میں بھی رہتا ہے جو کسی وقت بھی پیش آسکتے ہیں اور اس میں تہذیبی وتمدنی امتیاز سے بھی کوئی فرق نہیں پڑتا۔ وہ شہر میں رہتا ہو کہ پسماندہ پہاڑی دیہات میں دونوں صورتوں میں ایسے خطرات سے محفوظ نہیں ہوتا۔ انسان غیر متوقع طور پر کسی بھی وقت ناقابل علاج اور مہلک مرض کا شکار ہوسکتا ہے۔ کوئی ایسا حادثہ پیش آسکتا ہے جس سے اس کے جسم کو ناقابل تلافی نقصان پہنچ سکتا ہے اس سے اس کے جسم کے اعضاء اور قابل رشک حسن وخوبصورتی ضائع ہوسکتی ہے۔ مزید یہ کہ اس کا اطلاق سب پر ہوتا ہے۔ اس میں کسی مقام ومرتبے، عہدے، نسل وغیرہ کا امتیاز کام نہیں آتا۔ بلا کسی استثنیٰ کے یہی انجام ہر ایک کا مقدر ہوتا ہے۔ ایک ایسا مشہور ونامور انسان جس کے مداحوں کی تعداد کئی ملین ہو اور ایک عام گذریا دونوں ایک غیر متوقع حادثے کے نتیجے میں کسی بھی وقت مکمل طور پر نہ پہچانے جانے کی حالت کو پہنچ سکتے ہیں۔

کمزور سا انسانی جسم ہڈیوں اور گوشت سے مل کر بنتا ہے، جس کا کل وزن اوسطاً ستر اسی کلوگرام ہوتا ہے۔ اسے ایک پتلی سی کھال نے ڈھانپ رکھا ہوتا ہے بلاشبہ یہ حساس کھال آسانی کے ساتھ زخمی ہوسکتی ہے اور اس پر خراشیں آسکتی ہیں۔ اسے زیادہ تیز دھوپ یا ہوا میں رکھا جائے تو یہ خشک ہو کر پھٹ جاتی ہے۔ قدرتی علتوں سے بچنے کیلئے انسان ہمیشہ ماحول کے اثرات کے خلاف اپنی حفاظت کیلئے چوکنا رہتا ہے۔

بیشک انسانی جسم کے اندر بہترین نظام کارفرما ہوتے ہیں۔ اُسے گوشت، پٹھے، ہڈیاں، اعصابی ریشے اور دل اور خون کی وریدوں کا ایک نہایت پیچیدہ نظام وجود بخشتا ہے اور اس میں چربی بھی ہوتی ہے مگر یہ سب کچھ کسی بھی وقت خراب ہوسکتا ہے۔ اگر انسان گوشت پوست اور چربی کے علاوہ کسی اور مادے کا بنا ہوتا، جو باہر سے جسم کے اندر مداخلت کو روک سکتا، مثلاً جرثوموں کے حملوں سے اس کی حفاظت کرسکتا تو انسان کے بیمار پڑنے کے امکانات ختم ہو جاتے۔ مگر گوشت بہت نازک اور کمزور مواد کا بنا ہوا ہوتا ہے۔ اسے ایک کمرے کے درجہ حرارت پر کچھ دیر

کیلئے رکھ دیا جائے تو یہ گل سڑ جاتا ہے اور اسے کیڑا لگ جاتا ہے۔

اللہ کی طرف سے بار بار کی یاد دہانیوں سے انسان اکثر اپنے جسم کی بنیادی ضرورتوں کو محسوس کرنے لگتا ہے۔ مثال کے طور پر اگر یہ سرد موسم کی زد میں رہے تو خرابیٔ صحت کے خطرات پیدا ہو جاتے ہیں۔ اس کا محفوظ نظام بتدریج ''ناکارہ'' ہو جاتا ہے۔ ایسے موقعہ پر اس کا جسم اپنا مستقل درجہ حرارت (37° سی) بھی برقرار نہیں رکھ سکتا جو اچھی صحت کیلئے اساسی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کے دل کی دھڑکن سست پڑ جاتی ہے' خون کی وریدیں سکڑ جاتی ہیں اور شریانوں پر دباؤ بڑھ جاتا ہے۔ حرارت ازسرنو حاصل کرنے کیلئے جسم کانپنے لگتا ہے۔ جسم کا درجہ حرارت گر کر 35° سی پر آ جاتا ہے' نبض کی رفتار سست پڑ جاتی ہے اور بازوؤں' ٹانگوں اور انگلیوں میں خون کی وریدیں سکڑ جاتی ہیں جس سے موت کا خطرہ بڑھ جاتا ہے۔ ایسا شخص جس کے جسم کا درجہ حرارت 35° سی ہو اس کا سر چکرانے لگتا ہے اور وہ مسلسل نیند کی حالت میں رہنا چاہتا ہے۔

ذہن کے کام کی رفتار سست پڑ جاتی ہے۔ جسم کے درجہ حرارت میں ذرا سی کمی سے ایسی صورت حال پیدا ہو جاتی ہے مگر سرد موسمی اثرات کی زد میں زیادہ دیر رہنے سے جسم کا درجہ حرارت 33° سی سے گر جاتا ہے جس سے انسان ہوش و حواس کھو بیٹھتا ہے۔

اگر درجۂ حرارت 24° سی ہو جائے تو نظام تنفس کام کرنا چھوڑ دیتا ہے اور اگر 20° سی تک آ جائے تو دماغ کو نقصان پہنچاتا ہے اور بالآخر 19° سی پر حرکت قلب بند ہو جاتی ہے۔ جس سے اٹل انجام سامنے ہوتا ہے یعنی موت واقع ہو جاتی ہے۔

یہ صرف ایک ایسی مثال ہے جس میں اس کتاب کے آئندہ صفحات میں مزید توسیع کی جائے گی۔ ایسی مثالوں کا مقصد اس بات پر زور دینا ہے کہ انسان بہت سے بے رحم اسباب کی بنا پر خطرات میں گھرا رہتا ہے اور اپنے طرز زندگی میں مکمل اطمینان اور سکون کو تلاش کر لینے میں ناکام رہتا ہے۔ اس کا مقصد قاری کو یہ یاد دلانا بھی ہے کہ انسان کو زندگی کے ساتھ اندھی وابستگی نہیں رکھنی چاہئے نہ ہی اسے عمر بھر خوابوں کا پیچھا کرنا چاہئے بلکہ اس کے برعکس اسے ہمیشہ اللہ کو' حقیقی زندگی اور آخرت کو یاد رکھنا چاہئے۔

انسان سے وعدہ کیا گیا ہے کہ اسے جنت کی دائمی زندگی عطا کی جائے گی جیسا کہ قارئین کو آگے چل کر اس کتاب کے صفحات میں یہ دیکھنے کا موقعہ ملے گا کہ جنت ایک جامع و اکمل مقام

ہے۔ جنت میں انسان کی وہ تمام جسمانی کمزوریاں اور بیماریاں ختم ہو جائیں گی جو اس دنیا میں اسے گھیرے رکھتی ہیں۔ وہ جس شے کی خواہش کرے گا وہ اس کی دسترس میں ہوگی۔ مزید یہ کہ تکان، پیاس، بھوک اور صدمہ وگزند کا جنت میں کوئی وجود نہیں ہوگا۔

اس کتاب کا ایک اور مقصد یہ ہے کہ لوگوں کی مدد کی جائے کہ وہ اپنی اصل فطرت کے بارے میں غور کریں اور بالآخر اپنے خالق کی لامحدود برتری کو پوری طرح سمجھ لیں۔ مزید یہ کہ یہ سمجھنا کہ انسان کو اللہ کی ہدایت ورہنمائی کی ضرورت ہے یقیناً ایک ایسی بات ہے جس کا تعلق ہر انسان کے ساتھ ہے۔

اس بارے میں ارشاد باری تعالیٰ یوں ہوتا ہے:-

يَاَيُّهَا النَّاسُ اَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ اِلَى اللّٰهِ ج وَ اللّٰهُ هُوَ الْغَنِىُّ الْحَمِيْدُ٥

''لوگو تم ہی اللہ کے محتاج ہو اور اللہ تو غنی وحمید ہے'' (سورۃ فاطر : 15)

انسانی جسم کی ضرورتیں

انسان بہت سے جسمانی خطرات کی زد میں رہتا ہے۔ صحت وتندرستی کی خرابی کے خطرات کو کم سے کم کرنے کیلئے انسان اپنے جسم اور ماحول کو صاف ستھرا رکھتا ہے اور عمر بھر ان کی نگہداشت کے تکلیف دہ مراحل کا بوجھ اُٹھائے پھرتا ہے زیادہ حیران کن بات تو یہ ہے کہ ان کاموں پر خرچ ہونے والا وقت بہت زیادہ ہوتا ہے۔ ہمارے کرائے گئے کئی سروے ایسے تھے جن سے ہم نے یہ معلوم کرنے کی کوشش کی کہ ڈاڑھی مونڈنے، نہانے، بالوں کی حفاظت، جلد کی نگہداشت، ناخنوں کی نگہداشت وغیرہ پر کتنا وقت لگایا جاتا ہے۔ ہمیں بڑے حیران کن نتائج دیکھنے کو ملے۔ ہمیں یہ پتہ چلا کہ ان روزمرہ کے کاموں پر ہم اپنا کس قدر قیمتی وقت خرچ کرتے ہیں۔

اپنی زندگی کے ایام میں ہم بہت سے لوگوں سے ملتے ہیں۔ گھر پر، دفتر میں، سڑکوں پر، خرید و فروخت کے دوران دوکانوں پر، ہمیں بہت سے خوش لباس لوگ نظر آتے ہیں۔ ان لوگوں کے درمیان ڈاڑھی منڈے چہرے، صاف ستھرے بالوں اور جسموں والے انسان، استری شدہ ملبوسات زیب تن کئے ہوئے لوگ، چمکتے ہوئے پالش شدہ جوتے پہنے ہوئے انسان کو ہم دیکھتے اور ملتے ہیں۔ تاہم اس ساری ٹیپ ٹاپ کے لئے وقت اور کوشش درکار ہوتی ہے۔

انسان صبح کو بیدار ہونے سے لیکر رات سونے تک اپنے آپ کو صاف ستھرا اور تازہ دم رکھنے کے کتنے جتن کرتا ہے۔ صبح جب ہم نیند سے بیدار ہوتے ہیں تو سب سے پہلا کام ہم یہ کرتے ہیں کہ غسل خانے میں جائیں۔ رات کو نیند کے دوران ہمارے منہ کے اندر کچھ ایسے جرثومے پیدا ہو جاتے ہیں جن سے ہمارا منہ اندر سے بدمزہ ہو جاتا ہے اور ہمیں دانتوں کو برش کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے۔ تاہم ایک نئے دن کے آغاز پر صرف دانتوں کو برش کرنا ہی ضروری نہیں ہوتا' نہ ہاتھ منہ دھو لینے پر بات ختم ہو جاتی ہے۔ دن کے دوران بالوں میں گرد و غبار جمع ہو جاتا ہے اور پسینے سے جسم بھی گندا ہو جاتا ہے۔ رات کو سوتے میں خواب کے دوران بھی پسینہ آ سکتا ہے۔ چنانچہ جسم سے آنے والی بدبو سے نجات کا ایک ہی حل باقی رہ جاتا ہے کہ غسل خانے میں جا کر فوارے کے نیچے بیٹھ کر نہایا جائے۔ اس لئے کہ اس کے بغیر کام پر جانا اچھا نہیں لگے گا۔ جسم کو صاف ستھرا رکھنے کیلئے کئی قسم کے صابن' شیمپو استعمال ہوتے ہیں دانتوں کو صاف کرنے کیلئے طرح طرح کے پیسٹ ہیں' جسم پر چھڑکنے کیلئے پاؤڈر ہیں' چہرے پر لگانے کے لئے لوشن اور کریم ہیں اور یوں اس فہرست میں تو اضافہ پہ اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ جو جو چیزیں ہم نے اُوپر گنوا دی ہیں ان کے علاوہ بھی لیبارٹریوں میں بننے والی کئی اور ایسی اشیاء ہیں جن کو جسم کی نگہداشت کیلئے استعمال کیا جاتا ہے۔

جسمانی نگہداشت کے ساتھ ساتھ کپڑوں' مکان اور آس پاس کے ماحول کی صفائی پر بھی کافی وقت لگتا ہے۔ بیشک کوئی بھی انسان اپنے آپ کو اس وقت تک صاف ستھرا نہیں رکھ سکتا جب تک کہ وہ ایک صاف ستھرے ماحول میں نہ رہ رہا ہو۔

مختصر یہ کہ زندگی کا زیادہ وقت جسم کی ضرورتیں پوری کرنے پر خرچ ہو جاتا ہے۔ مزید یہ کہ ہمیں اس مقصد کیلئے کچھ کیمیائی اشیاء کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ اللہ نے انسان کو بہت سی کمزوریوں کے ساتھ پیدا کیا مگر ان کمزوریوں کو عارضی طور پر چھپانے کیلئے کئی طریقے بھی مہیا کر دیئے ہیں۔ تاکہ دوسرے لوگوں کو اس کی ان کمزوریوں کا پتہ بھی نہ چلے اور وہ اپنے آپ کو ٹھیک ٹھاک حالت میں رکھ سکے۔ اس کے علاوہ اللہ نے انسان کو عقل و ذہانت سے نوازا ہے تاکہ وہ ان ''کمزوریوں'' پر پردہ ڈالنے کے طریقے تلاش کر سکے۔ اگر ہم صاف ستھرا اور تازہ دم رہنے کیلئے یہ طریقے استعمال نہیں کرتے تو جلد ہی ہم سے لوگوں کو کراہت آنے لگتی ہے۔

مزید یہ کہ انسان زیادہ دیر تک کیلئے اپنے آپ کو صاف ستھرا نہیں رکھ سکتا۔ چند گھنٹوں کے بعد صبح کے کیئے ہوئے غسل کے اثرات ختم ہو جاتے ہیں۔ ہم تو بہت مختصر سے وقت کے لئے اپنے جسم کو صاف ستھرا رکھ سکتے ہیں۔ ہمیں دن بھر میں کم سے کم ایک مرتبہ غسل کی ضرورت ہوتی ہے اسی طرح ہمیں باقاعدگی کے ساتھ دانتوں کو برش سے صاف کرنا ہوتا ہے۔ مگر بیکٹیریا بڑی تیزی کے ساتھ ہمارے منہ کی حالت کو پہلا جیسا بنا دیتا ہے۔ وہ عورت جو آئینے کے سامنے کھڑی گھنٹوں کی محنت سے اپنا بناؤ سنگھار کرتی ہے مگر جب رات کو سو جاتی ہے تو صبح کو بیدار ہونے پر اس کے چہرے پر خوبصورت بناؤ سنگھار کا کوئی نشان تک باقی نہیں رہتا۔ پھر یہ کہ اگر وہ چہرے کو اچھی طرح پہلے بناؤ سنگھار سے صاف نہیں کر لیتی' استعمال شدہ سامان زیب و زینت کی باقیات اس کے چہرے کو اور خراب کر دیتی ہیں۔ ہر روز شیو کرنے والے شخص کو صبح اُٹھ کر شیو کرنی ہوتی ہے۔

اس بات کو سمجھ لینا بہت ضروری ہے کہ یہ سب ضروریات ایک خاص مقصد کے لئے ہوتی ہیں۔ اس بات کی وضاحت اس مثال سے ہو جاتی ہے: جب ہمارے جسم کا درجہ حرارت بڑھتا ہے تو ہمیں پسینہ آتا ہے۔ پسینے کی بدبو ہمیں پریشان کرتی ہے۔ اس دنیا میں رہنے والے ہر شخص کیلئے اس تجربے سے گزرنا ناگزیر ہوتا ہے۔ تاہم پودوں کے معاملے میں اس قسم کی ضرورت اس لئے پیش نہیں آتی کہ ان کو پسینہ نہیں آتا۔ گلاب کا پھول زمین سے اگنے والے پودے پر کھلتا ہے، جس زمین میں کھاد بھی ڈالی جاتی ہے' وہ گرد و مٹی اور گندگی میں بھی رہتا ہے مگر اسمیں سے بو نہیں آتی۔ تمام حالات میں گلاب سے تو خوشبو ہی آتی ہے۔ ہمیں اس بات کا تذکرہ کرنے کی ضرورت نہیں کہ اسے تو اپنے جسم کی نگہداشت نہیں کرنی پڑتی۔ جسم پر جس قسم کی خوشبویات ہی کیوں نہ استعمال کی جائیں چند انسان ایسے ہوں گے جن کے جسموں سے اس قسم کی مستقل خوشبو آئے گی۔

انسانی جسم کی صفائی ستھرائی کی ضروریات کے علاوہ خوراک بھی صحت کے لئے لازمی ہے۔ جسم کو پروٹین' کاربوہائیڈریٹ' شکر' وٹامن اور مختلف معدنی اشیاء کی ایک خاص مقدار ضرورت ہوتی ہے جو جسم کے لئے لازمی ہیں۔ ایک مرتبہ ان تمام میں اعتدال ختم ہو جائے تو انسانی جسم بیمار پڑ جاتا ہے' اس کے سارے نظام درہم برہم ہو جاتے ہیں اور اسے شدید نقصان پہنچتا ہے۔ وہ نظام جو اس کی حفاظت کرتا تھا وہ حفاظتی صلاحیتیں کھو بیٹھتا ہے جس سے جسم کمزور ہو کر بیماری کا شکار ہو جاتا ہے اس لئے جو توجہ جسم کی نگہداشت کو دی جاتی ہے وہی خوراک کو بھی دی جانی چاہیئے۔

انسانی زندگی کیلئے ایک اور لازمی شے پانی ہے۔ خوراک کے بغیر انسان کچھ روز تک زندہ رہ سکتا ہے مگر چندروز اسے پانی نہ ملے تو نتائج بڑے مہلک نکلتے ہیں۔ انسانی جسم کے تمام کیمیائی عمل پانی کی مدد کے محتاج ہیں اور پانی بیشک زندگی کیلئے بے حد ضروری ہے۔

مذکورہ بالا وہ کمزوریاں ہیں جو ایک انسان اپنے جسم میں دیکھ سکتا ہے۔ مگر ایک سوال پیدا ہوتا ہے: کیا ہم سب کو اس بات کا علم ہے کہ یہ کمزوریاں ہیں؟ تو پھر کیا ہم یہ سوچتے ہیں کہ یہ "قدرتی" ہیں۔ اس لئے کہ دنیا بھر کے انسانوں میں یہ کمزوریاں موجود ہیں؟

تاہم یہ بات ہمارے ذہنوں میں رہنی چاہئے کہ اگر اللہ چاہتا تو وہ انسان کو ان کمزوریوں کے بغیر تخلیق کر سکتا تھا۔ پھر ہر انسان ایک گلاب کی مانند صاف ستھرا اور خوشبودار ہوتا۔ مگر انسان کی موجودہ حالت سے ہم آخر کار ایک دانائی کی بات تک پہنچتے ہیں' ایک بات ہمارے ذہن میں اور ہماری عقل میں آتی ہے۔ کہ انسان جب اللہ کے روبرو اپنی کمزوریوں پر نگاہ ڈالتا ہے تو اسے یہ بات سمجھ میں آ جانی چاہئے کہ اسے کیوں تخلیق کیا گیا ہے اور پھر اسے اللہ کے ایک ادنیٰ غلام کی حیثیت سے باعزت زندگی گزارنے کی کوشش کرنی چاہئے۔

"شعور و آگہی" کے بغیر 15 برس

ہر انسان اپنی روزمرہ زندگی کا کچھ وقت سو کر گزارتا ہے۔ بلا امتیاز اس بات کے کہ اسے کتنا کام کرنا ہے یا وہ اس سے بچنے کی کتنی کوشش کرتا ہے اسے نیند تو آتی ہے جس سے فرار ممکن نہیں۔ کم از کم دن کا چوتھا حصہ وہ ضرور بستر پر گزارے گا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ انسان دن میں صرف 18 گھنٹے "شعور و آگہی" کی حالت میں رہتا ہے۔ بقیہ وقت جو کم از کم دن میں چھ گھنٹے بنتے ہیں اسے اوسطاً مکمل "بے ہوشی و بے خبری" میں گزارنے ہوتے ہیں۔ اس نقطہ نظر سے جائزہ لیا جائے تو بڑی حیران کن تصویر سامنے آتی ہے: اوسطاً 60 سالہ زندگی کا چوتھا حصہ مکمل "بے ہوشی و بے خبری" میں گزر جاتا ہے۔

تو کیا ہمارے پاس نیند کا کوئی نعم البدل ہے؟ اس شخص کا کیا بنے گا جو یہ کہے "میں سونا نہیں چاہتا"......

پہلے تو انسان کی آنکھیں سرخ ہوتی ہیں اور جلد کا رنگ زرد پڑ جاتا ہے اور اگر بے خوابی کا

دورانیہ بڑھ جاتا ہے تو انسان شعور و آگہی کھو بیٹھتا ہے۔ جب نیند آتی ہے تو پہلے آنکھیں بند ہوتی ہیں اور انسان کسی ایک مقام پر توجہ مرکوز نہیں کر سکتا۔ یہ ناگزیر عمل ہوتا ہے اور خوبصورت و بدصورت، امیر و غریب ہر انسان کو اسی عمل سے گزرنا ہوتا ہے۔

اسی طرح موت کے وقت بھی جیسا کہ نیند سے پہلے ہوتا ہے، انسان خارجی دنیا سے متعلق بے حس ہو جاتا ہے اور ایسی حالت میں کسی بھی ترغیب سے متاثر نہیں ہوتا۔ تھوڑی دیر قبل جو ہوش و حواس صحیح کام کر رہے تھے، کام کرنے چھوڑنے لگتے ہیں۔ اسی دوران قوت ادراک میں تبدیلی آ جاتی ہے۔ جسم اپنا کام گھٹا کر بہت کم درجے پر لے آتا ہے۔ جگہ اور وقت کے بارے میں ہوش نہیں رہتا اور جسم کی حرکات بہت سست پڑ جاتی ہیں۔ یہ صورت حال ایک طرح سے موت کی ایک دوسری شکل ہے، جس میں کہا جاتا ہے کہ روح جسم کو چھوڑ جاتی ہے۔ بیشک جس وقت جسم بستر پر سو رہا ہوتا ہے روح اس وقت مختلف تجربات سے گزرتی ہے اور بالکل مختلف مقامات پر رہتی ہے۔ خواب کے دوران ایک انسان اپنے آپ کو موسم گرما کے ایک روز ساحل سمندر پر دیکھتا ہے، اسے یہ خبر نہیں ہوتی کہ وہ بستر میں سویا ہوا ہے۔ موت کی بھی ظاہری صورت یہی ہوتی ہے: یہ روح کو جسم سے جدا کر دیتی ہے، جسے روح اس دنیا میں استعمال کرتی ہے اور اسے ایک نئے جسم میں اُٹھا کر ایک دوسری دنیا میں لے جاتی ہے۔ اللہ نے قرآن حکیم میں، جو مستند وحی کی شکل میں نازل ہوا، انسان کی صراط مستقیم کی جانب رہنمائی فرمائی ہے۔ ذات باری تعالیٰ نے بار بار ہمیں نیند اور موت کے درمیان پائی جانے والی مماثلت کے بارے میں یاد دہانی کرائی ہے:

وَ هُوَ الَّذِیْ یَتَوَفّٰکُمْ بِالَّیْلِ وَ یَعْلَمُ مَا جَرَحْتُمْ بِالنَّهَارِ ثُمَّ یَبْعَثُکُمْ فِیْهِ لِیُقْضٰۤی اَجَلٌ مُّسَمًّى ۚ ثُمَّ اِلَیْهِ مَرْجِعُکُمْ ثُمَّ یُنَبِّئُکُمْ بِمَا کُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝

''وہی ہے جو رات کو تمہاری روحیں قبض کرتا ہے اور دن کو جو کچھ تم کرتے ہو اسے جانتا ہے۔ پھر دوسرے روز وہ تمہیں اسی کاروبار کے عالم میں واپس بھیج دیتا ہے تاکہ زندگی کی مقرر مدت پوری ہو۔ آخر کار اسی کی طرف تمہاری واپسی ہے۔ پھر وہ تمہیں بتا دے گا کہ تم کیا کرتے رہے ہو''۔ (سورۃ الانعام : 60)

اَللّٰهُ یَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ حِیْنَ مَوْتِهَا وَالَّتِیْ لَمْ تَمُتْ فِیْ مَنَامِهَا ۚ فَیُمْسِكُ الَّتِیْ قَضٰى عَلَیْهَا الْمَوْتَ وَ یُرْسِلُ الْاُخْرٰۤى اِلٰۤى اَجَلٍ مُّسَمًّى

ۭ اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوۡمٍ یَّتَفَکَّرُوۡنَ۝

''وہ اللہ ہی ہے جو موت کے وقت روحیں قبض کرتا ہے اور جو ابھی نہیں مرا ہے اس کی روح نیند میں قبض کر لیتا ہے۔ پھر جس پر وہ موت کا فیصلہ نافذ کرتا ہے اسے روک لیتا ہے اور دوسروں کی روحیں ایک وقت مقرر کے لئے واپس بھیج دیتا ہے۔ اس میں بڑی نشانیاں ہیں ان لوگوں کیلئے جو غور و فکر کرنے والے ہیں''۔ (سورۃ الزمر : 42)

انسان مکمل طور پر حواس کے کام سے محروم ہو کر یا دوسرے لفظوں میں ''مکمل بے ہوش'' ہو کر زندگی کا تیسرا حصہ نیند میں گزارتا ہے۔ مگر وہ اس حقیقت پر بہت کم غور کرتا ہے اور اسے یہ احساس کبھی نہیں ہوا کہ زندگی میں جن چیزوں کو وہ اہم سمجھتا رہا ان سب کو اپنے پیچھے یہیں چھوڑ کر جا رہا ہے۔ ایک اہم امتحان، سٹاک ایکسچینج میں کھو دینے والی بھاری رقوم یا کوئی چھوٹا سا ذاتی مسئلہ، مختصر یہ کہ دن کے وقت نہایت اہم نظر آنے والا کوئی بھی معاملہ سونے پر دل و دماغ سے بالکل نکل جاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ دنیا کے ساتھ کوئی رشتہ باقی نہیں رہ جاتا۔

اب تک ہم نے جتنی مثالیں بھی پیش کیں سب سے ایک ہی بات واضح ہو کر سامنے آئی کہ یہ زندگی بہت مختصر ہے اور ہم نے زیادہ وقت روزمرہ کے عام کاموں پر انہیں ''لازمی'' سمجھ کر خرچ کر دیا۔ جب اس وقت کو ہم منہا کر کے دیکھتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ زندگی کے نام نہاد لطف کے لئے تو وقت بہت کم بچا ہے۔ اس کے برعکس انسان یہ محسوس کرتے ہوئے حیران ہو جاتا ہے کہ اس نے کھانے پینے، جسم کی نگہداشت، نیند، کام اور بہتر معیارات زندگی کے حصول پر زیادہ وقت صرف کر دیا ہے۔

روزمرہ کے جن کاموں کو واقعی زیادہ وقت دینا چاہئے جو زندہ رہنے کیلئے ضروری ہیں بلاشبہ اس بارے میں حساب لگانا اور سوچنا زیادہ اہم بات ہے۔ جیسا کہ ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں کہ 60 سالہ زندگی کے 20 برس تو نیند میں گزر جاتے ہیں بقیہ 40-45 برسوں میں سے ابتدائی 5-10 سال بچپن کی نذر ہو جاتے ہیں جو ایک ایسا دور ہوتا ہے جب تقریباً کسی بات کی سمجھ نہیں ہوتی۔ دوسرے لفظوں میں ایک ساٹھ سالہ انسان نے نصف زندگی تو بے خبری میں گزاری ہوتی ہے۔ بقیہ نصف زندگی کے اعداد و شمار مل سکتے ہیں۔ ان میں وہ وقت بھی شامل ہے جو کھانے تیار کرنے میں گزرا، کھانا کھانے میں صرف ہوا، نہانے میں لگا یا سڑکوں پر ٹریفک کے جام ہو جانے کی صورت

میں بڑبڑاتے گزارا گیا۔ اس فہرست میں توسیع بھی ہوسکتی ہے جب وقت کا حساب ہو چکا تو پتہ چلتا ہے کہ ''طویل'' زندگی میں سے باقی تو 3-5 برس ہی بچے ہیں۔ ایک دائمی زندگی کے مقابلے میں ایسی مختصر زندگی کی کیا اہمیت رہ جاتی ہے؟

اس مقام پر یہ کہنا درست معلوم ہوتا ہے کہ مومنوں اور کافروں کے درمیان ایک وسیع خلیج منہ کھولے کھڑی ہے۔ منکرین خدا سمجھتے ہیں کہ اس دنیا کی زندگی ہی ہے آخرت کچھ نہیں۔ پھر وہ ساری تگ و دو اس دنیا کی زندگی تک محدود رکھتے ہیں تاکہ زیادہ سے زیادہ فائدہ حاصل کرسکیں۔ مگر یہ سب لاحاصل کوشش ثابت ہوتی ہے۔ اس لئے کہ یہ زندگی مختصر ہے اور یہ زندگی بیشمار ''کمزوریوں'' کا مجموعہ ہے۔ مزید یہ کہ کافر چونکہ اللہ پر ایمان نہیں رکھتا اس کی زندگی یوں مشکلات اور پریشانیوں میں گزرتی ہے کہ اسے طرح طرح کے خوف اور ڈر دامنگیر رہتے ہیں۔

دوسری طرف جو ایمان والے ہیں وہ اللہ کی یاد میں زندگی گزارتے ہیں اور ہر لمحہ انہیں اس کی موجودگی کا احساس رہتا ہے۔ زندگی کے چھوٹے بڑے معاملات میں' جسمانی نگہداشت کے کٹھن مراحل میں' کھانے پینے' کھڑا ہونے' بیٹھنے' سونے اور روزی کمانے وغیرہ کے دوران وہ اپنے پروردگار کو اپنے قریب محسوس کرتے ہیں۔ ان کی زندگی کا مقصد اللہ کی خوشنودی کا حصول ہوتا ہے اسی لئے وہ تمام دنیاوی غموں اور اندیشوں سے پوری طرح دور رہ کر پُرسکون اور مطمئن زندگیاں گزارتے ہیں۔ اس کے نتیجے میں وہ جنت پالیتے ہیں' جو ایک دائمی خوشی و مسرت کا مقام ہے۔ اسی طرح مقصد حیات کے بارے میں درج ذیل قرآنی سورۃ میں ارشاد باری تعالیٰ یوں ہوتا ہے:

وَقِيْلَ لِلَّذِيْنَ اتَّقَوْا مَا ذَآ اَنْزَلَ رَبُّكُمْ ط قَالُوْا خَيْرًا ط لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةٌ ط وَ لَدَارُ الْاٰخِرَةِ خَيْرٌ ط وَلَنِعْمَ دَارُ الْمُتَّقِيْنَ o

''دوسری طرف جب خدا ترس لوگوں سے پوچھا جاتا ہے کہ یہ کیا چیز ہے جو تمہارے ربّ کی طرف سے نازل ہوئی ہے تو وہ جواب دیتے ہیں کہ بہترین چیز اُتری ہے۔ اس طرح کے نیکوکار لوگوں کیلئے اس دنیا میں بھی بھلائی ہے اور آخرت کا گھر تو ضرور ہی ان کے حق میں بہتر ہے۔ بڑا اچھا گھر ہے متقیوں کا''۔ (سورۃ النحل : 30)

بیماریاں اور حادثات

بیماری بھی انسان کو یاد دلاتی ہے کہ وہ کمزوری کے کس قدر قریب ہے۔ انسانی جسم بظاہر ہر قسم کے خارجی خطرات سے پوری طرح محفوظ بنا دیا گیا ہے مگر وہ بیماری پھیلانے والے وائرس سے جو انسانی آنکھ کو نظر بھی نہیں آتے بری طرح متاثر ہوتا ہے۔ مگر یہ بات اس لئے غیر منطقی لگتی ہے کیونکہ اللہ نے انسانی جسم کو نہایت مکمل اور موئثر نظاموں سے لیس کیا ہے بالخصوص وہ نظام مامونیت جسے دشمنوں پر ''فاتح فوج'' کا نام دیا جا سکتا ہے۔ تاہم انسانی جسم کی طاقت اور قوت مدافعت کے باوجود لوگ اکثر بیمار پڑ جاتے ہیں۔ وہ اس حقیقت پر کم غور کرتے ہیں کہ انسانی جسم کو اسقدر اعلیٰ وعمدہ نظاموں سے لیس کرنے کے بعد اللہ نے بیماریاں پیدا کرنے والے جراثیم یا وائرس کو کبھی اجازت نہ دی ہوتی کہ وہ ان امراض کا باعث بن سکیں۔ یا پھر ان باریک باریک انسان دشمنوں کا وجود ہی نہ ہوتا۔ تاہم آج کوئی انسان بھی معمولی سے کسی سبب کے باعث بیمار پڑ سکتا ہے۔ مثال کے طور پر ایک واحد وائرس انسانی جسم پر آئے ہوئے چھوٹے سے زخم کے راستے داخل ہو کر ذرا سی دیر میں پورے جسم میں پھیل جاتا ہے اور پھر جسم کے اہم اعضاء کا کنٹرول سنبھال لیتا ہے اسقدر ترقی یافتہ ٹیکنالوجی کے باوجود انفلوئنزا کا وائرس بیشمار لوگوں کیلئے موت کا خطرہ پیدا کر دیتا ہے۔ تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ بارہا انفلوائنزا نے دنیا کی بستیوں کو صفحہ ہستی سے مٹا دیا۔ مثال کے طور پر 1918ء میں 25 ملین لوگ انفلوائنزا سے مر گئے تھے۔ اسی طرح 1995ء میں ایک ایسی وبائی بیماری پھیلی جس نے 30 ہزار جانوں کو لقمہ اجل بنا دیا تھا۔ انسانی جانوں کا سب سے زیادہ نقصان جرمنی میں ہوا۔

آج بھی خطرہ موجود ہے: ایک وائرس کسی بھی وقت حملہ کر سکتا ہے اور کسی کی بھی جان لے سکتا ہے یا تقریباً بیس برس مخفی رہنے کے بعد بھی ایک بیماری دوبارہ پھیل سکتی ہے۔ ان تمام واقعات کو قدرتی حادثات تسلیم کرتے ہوئے ان پر توجہ نہ دینا ایک بہت بڑی غلطی ہوگی۔ اللہ انسان کیلئے بیماریاں ایک خاص مقصد کے تحت بھیجتا ہے۔ ان سے وہ لوگ جو اس کے نافرمان ہیں انہیں اپنی محدود قوت کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ اس کے علاوہ اس زندگی کی اصل حقیقت کو سمجھنے میں بھی مدد ملتی ہے۔

بیماریوں کے علاوہ حادثات بھی انسان کے لئے خطرات پیدا کرتے ہیں۔ اخبارات بلاناغہ ٹریفک حادثات کی خبریں شہ سرخیوں کے طور پر چھاپتے ہیں۔ ریڈیو اور ٹی وی کے خبرناموں میں بھی زیادہ حصہ حادثات کی خبروں پر مشتمل ہوتا ہے۔ حادثات سے اسقدر مانوس ہونے کے باوجود ہم نے یہ کبھی نہیں سوچا کہ ہم میں سے کسی کو بھی، کسی بھی وقت کوئی حادثہ پیش آ سکتا ہے۔ ہمارے اردگرد ہزاروں طرح کے ایسے عوامل موجود ہوتے ہیں جو اچانک ہماری زندگی کے بہاؤ کا رُخ بدل سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر راستہ چلتے چلتے ایک شخص بیچ سڑک کے توازن کھو کر گر سکتا ہے۔ اس قسم کے معمولی سے حادثے سے دماغ کو چوٹ لگ سکتی ہے، دماغ کی رگ پھٹ سکتی ہے، ٹانگ ٹوٹ سکتی ہے یا کھانا کھاتے وقت مچھلی کی ہڈی حلق میں پھنس کر موت کا باعث بن سکتی ہے۔ یہ اسباب بظاہر جس قدر معمولی کیوں نہ ہوں مگر ہر روز دنیا بھر میں ہزاروں انسان ایسے ایسے حادثات کا شکار ہوتے ہیں جن کا تصور تک کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔

ان حقائق سے یہ بات ہماری سمجھ میں آ جانی چاہئے کہ اس دنیا کی زندگی پر ہماری ساری توجہ کس قدر بے ثمر جاتی ہے اور نتیجہ یہ اخذ کرنا چاہئے کہ ہر وہ شے جو عارضی طور پر ہمیں دی گئی ہے وہ اس دنیا میں ہماری آزمائش کرنے کیلئے دی گئی ہے یہ بات کس قدر مضحکہ خیز لگتی ہے کہ انسان جو اب بھی ایک نظر نہ آنے والے وائرس سے لڑنے کے قابل نہیں اپنے قادر مطلق، خالق و مالک حقیقی کے سامنے نافرمانی اور بغاوت کا مظاہرہ کرنے لگتا ہے۔

یہ بات ہر قسم کے شک وشبے سے بالاتر ہے کہ اللہ نے انسان کو تخلیق کیا اور وہی تمام خطرات سے اسے محفوظ رکھتا ہے۔ اس حوالے سے حادثات اور بیماریاں ہمیں یہ بتاتی ہیں کہ ہماری حیثیت کیا ہے۔ کوئی انسان اپنے آپ کو جس قدر بھی طاقتور کیوں نہ سمجھتا ہو اللہ کی مرضی شامل حال نہ ہو تو وہ کسی بھی تباہی و بربادی سے اپنے آپ کو محفوظ نہیں رکھ سکتا۔ اللہ انسان کو اس کی کمزوریاں یاد دلانے کیلئے بیماری پیدا کرتا اور اس قسم کی دیگر صورت حال سے انسان کو دوچار کرتا ہے۔

یہ دنیا ایک ایسا مقام ہے جہاں انسان کی آزمائش کی جاتی ہے یہ ہر کسی کی ذمہ داری ہے کہ وہ ذات باری تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کرنے کی کوشش کرے۔ اس آزمائش کے اختتام پر وہ لوگ جنہوں نے اللہ کے ساتھ دوسروں کو شریک نہیں ٹھہرایا ہوتا، اس کے فرامین کی تعمیل کی ہوتی ہے اور جن باتوں سے منع فرمایا گیا ان سے باز رہے، ان کا دائمی ٹھکانہ جنت ہوگا وہ جو سرکشی سے باز نہ

آ ئے اس دنیا کو اور اپنی خواہشات کو ترجیح دی وہ اللہ کے کرم سے محروم رہیں گے انہیں دائمی عذاب میں ڈال دیا جائے گا۔ یہ لوگ نہ تو اس دنیا میں تکلیفوں، غموں اور کمزوری سے بچ سکیں گے نہ ہی آخرت میں۔

بیماریوں اور حادثات کے نتائج

جیسا کہ گذشتہ صفحات میں ذکر کیا گیا بیماری اور حادثات سے اللہ انسان کی آزمائش کرتا ہے۔ اس قسم کا معاملہ درپیش ہو تو ایک فرمانبردار انسان فوراً اللہ سے رجوع کرتا ہے۔ اس کی عبادت کرتا ہے اور اس کی پناہ میں آنے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ اس بات سے خوب واقف ہوتا ہے کہ اللہ کے سوا کوئی اور اسے اس دُکھ سے نجات نہیں دے سکتا۔ اسے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس کے صبر واستقلال اور استقامت نیز اللہ پر اس کے بھروسے کی آزمائش ہے۔

قرآن حکیم میں حضرت ابراہیمؑ کے مثالی رویے کی تعریف کی گئی ہے۔ اُن کی صمیم قلب سے کی گئی دُعا کو مومنین سے کہا گیا ہے کہ وہ دہرائیں۔ قرآن پاک میں اس کا ذکر یوں فرمایا ہے:

وَالَّذِیْ هُوَ یُطْعِمُنِیْ وَ یَسْقِیْنِ o وَ اِذَا مَرِضْتُ فَهُوَ یَشْفِیْنِ o وَالَّذِیْ یُمِیْتُنِیْ ثُمَّ یُحْیِیْنِ o

"...... جو مجھے کھلاتا پلاتا ہے اور جب میں بیمار ہو جاتا ہوں تو وہی مجھے شفا دیتا ہے۔ جو مجھے موت دے گا اور پھر دوبارہ مجھ کو زندگی بخشے گا"۔ (سورۃ الشعراء : 79-81)

دوسری طرف حضرت ایوبؑ نے جو اللہ کے پیغمبر تھے تمام مومنین کے لئے اس وقت ایک اچھی مثال چھوڑی جب آپ نے انتہائی مہلک بیماری کے دوران بھی اللہ سے صبر کی توفیق مانگی:

وَاذْکُرْ عَبْدَنَآ اَیُّوْبَ م اِذْ نَادٰی رَبَّهٗٓ اَنِّیْ مَسَّنِیَ الشَّیْطٰنُ بِنُصْبٍ وَّ عَذَابٍ o

"اور ہمارے بندے ایوبؑ کا ذکر کرو جب اس نے اپنے ربّ کو پکارا کہ شیطان نے مجھے تکلیف اور عذاب میں ڈال دیا ہے"۔ (سورۃ ص : 41)

اس قسم کی تکلیف اللہ کے بندوں کی اپنے خالق کے لئے اطاعت و فرمانبرداری کو مضبوط بنا دیتی ہے اور انہیں ایمان کی پختگی بخشتی ہے۔ اسی لئے ہر مصیبت "خوش نصیبی" ہوتی ہے۔ منکرین

خدا دوسری جانب تمام قسم کے حادثات اور بیماریوں کو ''بدنصیبی'' تصور کرتے ہیں۔ انہیں یہ احساس نہیں ہوتا کہ ہر شئے کو ایک خاص مقصد کیلئے پیدا کیا گیا ہے اور مصائب کے دوران جس صبر وشکر کا مظاہرہ کیا جاتا ہے اس کا اجر آخرت میں ملتا ہے' اسی لئے کفار غمزدہ ہو جاتے ہیں۔ بیشک وہ نظام جو اللہ کے وجود سے انکار پر قائم ہوا ہمیں لوگ مادہ پرستانہ نقطہ نظر اختیار کر لیتے ہیں اور جو اللہ پر ایمان نہیں رکھتے بیماریاں اور حادثات ان کیلئے رنج والم کا باعث بنتے ہیں۔ مادہ پرستانہ معاشرے کی اخلاقی اقدار اور نقطہ نظر یہ سکھاتے ہیں کہ جس بیماری اور حادثے سے لوگ گزرتے ہیں اس کے نتیجے میں قریبی ''دوست'' بھی ان کا ساتھ چھوڑ دیتے ہیں حالانکہ یہ ابھی مر نہیں گئے ہوتے۔ ایسا رویہ صرف اس لئے اختیار کیا جاتا ہے کیونکہ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ کسی مصیبت زدہ سے دوستی یا اس کی نگہداشت ایک مصیبت بن جاتی ہے۔ وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ ماضی کے اچھے اور سنہرے دنوں میں اسی بیمار یا حادثے کے شکار انسان نے دوستوں کو بے حد محبت دی ہوتی ہے۔ جوں ہی کوئی بیمار ہو کر بستر پر دراز ہوا یا معذور ہو گیا اس کیلئے اب تک جو محبت محسوس کی جاتی تھی سب غائب ہو گئی۔ ایک اور وجہ جس کی بنا پر لوگ بدل جاتے ہیں وہ بینائی کا ضائع ہو جانا یا مختلف ہنر ہاتھ سے جاتے رہنا ہوتا ہے۔ ایک مادہ پرستانہ معاشرے میں اس کی بھی توقع کی جا سکتی ہے اس لئے کہ اس طرح کے معاشرے میں لوگ دوسروں کو ان کے جسمانی اوصاف کی بنیاد پر درجہ دیتے ہیں۔ چنانچہ جب کبھی کوئی جسمانی نقص پیدا ہوتا ہے اس انسان کو جو قدر و منزلت دی جاتی تھی اس میں کمی واقع ہو جاتی ہے۔

مثال کے طور پر ایک جسمانی طور پر معذور انسان کی بیوی یا اس کے قریبی رشتے دار بہت جلد شکایت کرنے لگ جاتے ہیں کہ وہ اس کی نگہداشت میں بڑی تکلیف محسوس کرتے ہیں۔ وہ اکثر یہ رونا بھی روتے ہیں کہ وہ لوگ کس قدر بدنصیب ہیں۔ زیادہ تر تو یہ بات بھی کہتے ہیں کہ وہ ابھی جوان ہیں اور اس قسم کی مصیبت سے دوچار ہو جانا ایک ایسی بات نہ تھی جس کے وہ مستحق تھے یہ تو محض اپنے آپ کو حق بجانب ثابت کرنے کا بہانہ ہے کہ وہ مرد یا عورت اپنے معذور (مرد یا عورت) رشتہ دار کی پوری طرح نگہداشت نہیں کر رہی۔ دوسری طرف کچھ لوگ مریض یا معذور کی مدد محض اس لئے کرتے ہیں کہ انہیں یہ ڈر رہتا ہے کہ لوگ یہ نہ کہیں کہ اس حالت میں انہوں نے اپنے عزیز کو چھوڑ دیا ہے۔ ایسی افواہیں جو اکثر جلد پھیل جاتی ہیں انہیں اس قسم کے رویے سے باز

رکھتی ہیں۔ مصیبت کے ان ایام میں ساتھ دینے کے وہ وعدے جو اچھے دنوں میں کئے گئے تھے اچانک خودغرضی کے جذبات کی بھینٹ چڑھ جاتے ہیں۔

ایک ایسا معاشرہ جس میں وفاداری' دوستی اور خلوص صرف اس وقت دیا جاتا ہے جب دوسرے سے کسی فائدے کی توقع ہو'اس میں ایسے واقعات سے ہمیں حیران نہیں ہونا چاہئے۔ بیشک جن معاشروں میں مادہ پرستانہ رویئے مستحکم ہو جاتے ہیں اور جہاں اللہ کا خوف نہیں رہتا یہ توقع رکھنا ہی عبث ہے کہ کوئی بغیر کسی مطلب اور غرض کے کسی دوسرے سے وفاداری کا مظاہرہ کرے گا۔ ہم کسی سے پر خلوص ہونے کی توقع اس وقت تک نہیں رکھ سکتے جب تک اسے یہ یقین نہ ہو کہ اگر وہ ایسا نہیں کرے گا تو اسے سزا ملے گی اور کرے گا تو انعام سے نوازا جائے گا۔ مادہ پرستانہ معاشرے میں اس قسم کے رویئے کو ''احمقانہ'' تصور کیا جاتا ہے۔ ایسا اسلئے ہے کہ ان کی نظر میں کسی ایسے انسان سے وفاداری کا مظاہرہ کرنا حماقت ہے جس کے بارے میں معلوم ہو کہ وہ چند برس بعد مر جائے گا۔ ایک ایسے نظام میں اس صورت حال پر غور کریں جس میں فریقین کو پتہ ہو کہ انہیں مختصر سے عرصے کیلئے جینا ہے اور پھر مر جانا ہے' اس قسم کی ذہنیت معقول نظر آتی ہے۔ پھر کیوں نہ وہ مختلف کام کرنے کے زیادہ آرام دہ اور آسان طریقوں کو ترجیح دیں۔

مگر حقائق اس کے برعکس ہیں۔ وہ جو اللہ پر بھروسہ کرتے ہیں' وہ جو اس کی موجودگی پر ایمان رکھتے ہیں' اپنی کمزوریوں سے واقف ہیں اور اللہ سے ڈرتے ہیں' یہ لوگ دوسروں کا اندازہ

جن بیماریوں کو ان تصاویر میں دکھایا گیا ہے وہ اکثر اللہ کی طرف سے آزمائشیں ہوتی ہیں۔ ایمان والوں کیلئے ایسے واقعات وہ نادر مواقع بن جاتے ہیں جن میں وہ صبر اور اللہ کی مکمل اطاعت کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ مگر وہ لوگ جو اپنی سوجھ بوجھ کو اس دنیا تک محدود کر لیتے ہیں' یہ راز ان کی سمجھ سے بالاتر رہتا ہے۔



گلہڑ



شنگلز (جلدی بیماری)



چھپاکی (جلدی بیماری)

اس طرح لگاتے ہیں جس طرح اللہ چاہتا ہے۔ایک ایسے انسان کی سب سے بڑی صفت جو اللہ کی موجودگی کا تصور رکھتا ہے یہ ہے کہ وہ اس سے ڈرتا ہے' اسے ہر ایک سے زیادہ احترام دیتا ہے اور پھر ان صفات کی وجہ سے اسمیں جو اعلیٰ رویہ پیدا ہو جاتا ہے اس کا مظاہرہ کرتا ہے۔ اگر ایک ایسا انسان جو اللہ سے ڈرتا ہے اس دنیا میں اعلیٰ اخلاقی اقدار کا مظاہرہ کرتا ہے تو اسے ہمیشہ کیلئے جسمانی اور ذہنی پختگی حاصل ہو جاتی ہے جب وہ اس حقیقت سے باخبر ہو جاتا ہے تو اس دنیا کے طبعی نقائص اپنی تمام اہمیت کھو بیٹھتے ہیں۔ اللہ نے ایمان والوں سے یہی وعدہ کر رکھا ہے۔ یہی وہ بنیادی وجہ ہے کہ مومنین ایک دوسرے کیلئے عزت واحترام اور محبت وشفقت کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ وہ ایک دوسرے کی جسمانی معذوریوں کو نظر انداز کر دیتے ہیں اور ایک دوسرے کیلئے عمر بھر کی رفاقت اور دوستی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔

مومنین اور کفار کی سوچ میں جو بڑا فرق پایا جاتا ہے اور ان کے ذہنوں کی جو مختلف حالت ہوتی ہے اس کو بہت اہم سمجھا جانا چاہئے۔ مومنین کے دلوں سے بغض اور کینہ نکل جاتا ہے اور اس کی جگہ امن وسلامتی لے لیتی ہے۔ مایوسی' بداطمینانی اور رنجیدگی سے کفار کے ذہنوں میں بے چینی اور اضطراب پیدا ہوتا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ کفار کیلئے ایک مادہ پرستانہ معاشرے میں یہ ایک سزا تھی جو انہیں ملی مگر فی الحقیقت یہ اللہ کی طرف سے ان لوگوں کی بدنصیبی ہے جو اس پر ایمان نہیں لاتے۔ وہ لوگ جو یہ سمجھے بیٹھے ہیں کہ غلط اور برے کاموں کیلئے ان سے باز پرس نہ ہوگی' یوم حساب اس وقت حیران اور دنگ رہ جائیں گے جب ظلم' کفر اور اللہ کی اطاعت سے منہ موڑنے کا حساب لیا جائے گا:

وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنَّمَا نُمْلِيْ لَهُمْ خَيْرٌ لِّاَنْفُسِهِمْ ط اِنَّمَا نُمْلِيْ لَهُمْ لِيَزْدَادُوْٓا اِثْمًا وَ لَهُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ o

"یہ ڈھیل جو ہم انہیں دیئے جاتے ہیں اس کو یہ کافر اپنے حق میں بہتری نہ سمجھیں۔ ہم تو انہیں اس لئے ڈھیل دے رہے ہیں کہ یہ خوب بار گناہ سمیٹ لیں۔ پھر ان کیلئے سخت ذلیل کرنے والی سزا ہے"۔ (سورۃ آل عمران : 178)

زندگی کے آخری سال

برسوں کے گزر جانے کے بعد انسانی جسم پر جو تباہ کن اثرات مرتب ہوتے ہیں انہیں صاف طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔ جوں جوں سال گزرتے جاتے ہیں انسان کا نہایت قیمتی سرمایہ ایک ایسی تباہی کی جانب بڑھتا جاتا ہے جہاں سے واپسی ممکن ہی نہ ہو۔ وہ جسمانی تبدیلیاں جو انسانی زندگی میں آتی ہیں ان کا ذکر قرآن پاک میں اس طرح آیا ہے۔

اَللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِّنْ ضُعْفٍ ثُمَّ جَعَلَ مِنْۢ بَعْدِ ضُعْفٍ قُوَّةً ثُمَّ جَعَلَ مِنْۢ بَعْدِ قُوَّةٍ ضُعْفًا وَّشَیْبَةً ؕ یَخْلُقُ مَا یَشَآءُ ۚ وَ هُوَ الْعَلِیْمُ الْقَدِیْرُ ۝

’’اللہ ہی تو ہے جس نے ضعف کی حالت سے تمہاری پیدائش کی ابتداء کی پھر اس ضعف کے بعد تمہیں قوت بخشی۔ پھر اس قوت کے بعد تمہیں ضعیف اور بوڑھا کر دیا۔ وہ جو کچھ چاہتا ہے پیدا کرتا ہے اور وہ سب کچھ جاننے والا ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے‘‘۔ (سورۃ الرّوم : 54)

ایک بالغ انسان کی زندگی میں آخری عمر کے برسوں کو اس لحاظ سے نہایت نظر انداز کئے گئے برس سمجھا جاتا ہے کیونکہ اس عرصے میں مستقبل کیلئے منصوبے نہیں بنتے۔ ہاں یہ ضرور ہوتا ہے کہ ضعیف العمری کی پنشن کیلئے بچت کر لینے کی فکر ضرور دامنگیر ہو جاتی ہے۔ بیشک اس زمانے میں موت کے بہت قریب ہونے کی وجہ سے لوگ اس دور کے بارے میں غیر مستقل مزاجی کا مظاہرہ کرنے لگتے ہیں۔ جب کوئی شخص بڑھاپے کا ذکر چھیڑتا ہے تو دوسرے لوگ فکر مند ہو جاتے ہیں۔ جوں ہی ایسا ممکن ہو وہ اس ’’ناخوشگوار‘‘ موضوع گفتگو کو تبدیل کر دیتے ہیں۔ زندگی کے ان تکلیف دہ برسوں کے تصور سے بچنے کیلئے روزانہ کا معمول بھی بڑا معاون ثابت ہوتا ہے۔ چنانچہ اسے اس وقت تک ملتوی کر دیا جاتا ہے تاوقتیکہ یہ ایک روز آ ہی نہیں جاتا ہے۔ بیشک اسے ٹالنے کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ انسان یہ سمجھتا ہے کہ موت سے پہلے انسان کے پاس طویل وقت ہے۔ اس عام غلط فہمی کا ذکر قرآن پاک میں اس طرح فرمایا گیا ہے:

بَلْ مَتَّعْنَا هٰۤؤُلَآءِ وَ اٰبَآءَهُمْ حَتّٰى طَالَ عَلَیْهِمُ الْعُمُرُ ؕ

’’اصل بات یہ ہے کہ ہم ان لوگوں کو اور ان کے آباؤ اجداد کو زندگی کا سروسامان دیئے چلے گئے یہاں تک کہ ان کو دن لگ گئے‘‘۔ (سورۃ الانبیاء : 44)

اس غلط تصور سے اکثر بڑا دکھی ہونا پڑتا ہے۔ یہ صرف اس وجہ سے ہوتا ہے کہ کوئی انسان کتنا ہی بوڑھا کیوں نہ ہو جائے ماضی میں سے جو کچھ اس کے پاس بچتا ہے وہ بھولی بسری یادیں ہوتی ہیں۔ انسان کو اپنا بچپن بہت کم یاد رہ جاتا ہے۔ یہ یاد رکھنا بھی مشکل ہوتا ہے کہ پچھلی دہائی میں کیا کچھ ہوا۔ ایک نوجوان کی بڑی بڑی خواہشیں' اہم فیصلے اور وہ منزلیں جن تک پہنچنے کا اس نے عزم کر رکھا ہو' ایک بار پوری ہو جائیں تو اپنی تمام تر اہمیت کھو بیٹھتی ہیں۔ اسی لئے ایک ''طویل'' زندگی کا قصہ سنانا سعی لاحاصل ہوتا ہے۔

خواہ ایک انسان ابھی لڑکپن میں ہو یا عالم جوانی میں' ان میں سے ہر دور کو چاہئے کہ انسان کو اپنی زندگی کے بارے میں جلد فیصلہ کرنے پر اکسائے۔ مثال کے طور پر اگر آپ چالیس برس کے ہیں اور ساٹھ کی دہائی کے وسط تک زندہ رہنے کی توقع رکھتے ہیں اور جس کی آپ کے پاس کوئی ضمانت نہیں۔ تو پھر یہ بقیہ 25 برس بھی یقیناً اتنی ہی تیزی سے گزر جائیں گے جتنی تیزی کے ساتھ اس سے پہلے کا 40 سالہ زمانہ گزرا ہے۔ آپ کی زندگی مزید لمبی ہو جائے تب بھی یہ بات سچ ثابت ہوگی۔ اس لئے کہ یقین تیس یا چالیس بھی اسی طرح گزر جائیں گے اور آپ کو پتہ بھی نہ چلے گا۔ یہ یقیناً اس دنیا کی اصل حقیقت کی مسلسل یاد دہانی ہے ایک روز ہر ذی روح کو اس دنیا سے چلے جانا ہے اور پھر دوبارہ واپسی نہیں ہے۔ چنانچہ انسان کو تمام تعصبات سے دامن چھڑا کر زندگی کے بارے میں زیادہ حقیقت پسندی کا مظاہرہ کرنا چاہئے۔ وقت بہت تیزی سے گزرتا ہے اور ہر نیا روز انسان کے لئے زیادہ جسمانی کمزوری لاتا ہے اور جوانی کے تازہ افکار کی نسبت اس کی سوچ اور فکر میں بھی کمی واقع ہوتی ہے۔ مختصر یہ کہ بوڑھا ہونا اس بات کی علامت ہے کہ اب وہ انسان اپنے جسم' زندگی اور مقدر کو کنٹرول کرنے کے قابل نہیں رہا۔ اس عرصے میں وقت کے بُرے اثرات ظاہر ہونا شروع ہو جاتے ہیں۔ اللہ نے اس بارے میں ہمیں درج ذیل قرآنی سورۃ میں اس طرح مطلع فرمایا ہے:

وَ اللّٰهُ خَلَقَكُمْ ثُمَّ يَتَوَفّٰكُمْ قف وَ مِنْكُمْ مَّنْ يُّرَدُّ اِلٰٓى اَرْذَلِ الْعُمُرِ لِكَيْ لَا يَعْلَمَ بَعْدَ عِلْمٍ شَيْـًٔا ط اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ قَدِيْرٌ ○

''اور دیکھو اللہ نے تمہیں پیدا کیا۔ پھر وہ تم کو موت دیتا ہے اور تم میں سے کوئی بدترین عمر کو پہنچا دیا جاتا ہے تا کہ سب کچھ جاننے کے بعد پھر کچھ نہ جانے۔ حق یہ ہے کہ اللہ ہی علم میں بھی کامل

ہے اور قدرت میں بھی''۔ (سورۃ النحل : 70)

طب میں آخری درجے کے بڑھاپے کو بھی ''دوسرا بچپن'' کہا جاتا ہے۔ چنانچہ زندگی کے ان اختتامی برسوں میں معمر لوگوں کو بچوں کی سی نگہداشت کی ضرورت ہوتی ہے اس لئے کہ ان کی جسمانی اور ذہنی کارکردگی میں کچھ تبدیلیاں آجاتی ہیں۔

جب انسان بوڑھا ہو جاتا ہے تو اس کی جسمانی اور روحانی خصوصیات جو اس کے بچپن جیسی ہوتی ہیں زیادہ نمایاں ہو جاتی ہیں۔ ضعیف العمر لوگ بہت سے ایسے کام نہیں کر سکتے جن میں جسمانی طاقت درکار ہوتی ہے بڑھاپے میں عام بیماریوں کی جو علامات دیکھنے میں آتی ہیں ان میں بار بار فیصلے بدلنا' غیر صحت مند سوچ' چلنے پھرنے میں دشواری' توازن برقرار نہ رکھ سکنا' بات کرتے وقت زبان میں لکنت' حافظے کی کمزوری اور بتدریج حافظہ جاتے رہنا اور متلون مزاجی شامل ہیں۔

مختصر یہ کہ ایک خاص عمر کے بعد لوگ جسمانی اور ذہنی طور پر بچپن کی طرح دوسروں پر انحصار کرنے لگتے ہیں۔

زندگی کا آغاز اور اختتام شیر خوارگی کی سی حالت میں ہوتا ہے ایسا بظاہر الل ٹپ نہیں ہو جاتا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ایک انسان اس وقت تک جواں رہے جب تک اس کی موت واقع نہیں ہوتی۔ تاہم اللہ انسان کو اس کی زندگی کے مختلف مراحل میں کئی چیزوں میں کمی واقع کر کے اس دنیا کی عارضی حیثیت کے بارے میں یاددہانی کراتا ہے۔ یہ عمل ایک یاددہانی کا کام دیتا ہے کہ زندگی ہاتھ سے نکلتی جا رہی ہے۔ اس بارے میں قرآن حکیم کی درج ذیل سورۃ میں اس طرح ارشاد باری تعالیٰ ہوتا ہے:

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّنَ الْبَعْثِ فَاِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ مِنْ عَلَقَةٍ ثُمَّ مِنْ مُّضْغَةٍ مُّخَلَّقَةٍ وَّ غَيْرِ مُخَلَّقَةٍ لِّنُبَيِّنَ لَكُمْ ؕ وَ نُقِرُّ فِي الْاَرْحَامِ مَا نَشَآءُ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ثُمَّ نُخْرِجُكُمْ طِفْلًا ثُمَّ لِتَبْلُغُوْٓا اَشُدَّكُمْ ۚ وَ مِنْكُمْ مَّنْ يُّتَوَفّٰى وَ مِنْكُمْ مَّنْ يُّرَدُّ اِلٰٓى اَرْذَلِ الْعُمُرِ لِكَيْلَا يَعْلَمَ مِنْۢ بَعْدِ عِلْمٍ شَيْـًٔا ؕ وَ تَرَى الْاَرْضَ هَامِدَةً فَاِذَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْهَا الْمَآءَ اهْتَزَّتْ وَ رَبَتْ وَ اَنْۢبَتَتْ مِنْ كُلِّ زَوْجٍۭ بَهِيْجٍ۝

''لوگو اگر تمہیں زندگی کے بعد موت کے بارے میں کچھ شک ہے تو تمہیں معلوم ہو کہ ہم

نے تم کو مٹی سے پیدا کیا ہے۔ پھر نطفے سے' پھر خون کے لوتھڑے سے' پھر گوشت کی بوٹی سے جو شکل والی بھی ہوتی ہے اور بے شکل بھی (یہ ہم اس لئے بتا رہے ہیں) تا کہ تم پر حقیقت واضح کریں۔ ہم جس (نطفے) کو چاہتے ہیں ایک خاص وقت تک رحموں میں ٹھہرائے رکھتے ہیں۔ پھر تم کو ایک بچے کی صورت میں نکال لاتے ہیں (پھر تمہیں پرورش کرتے ہیں) تا کہ تم اپنی جوانی کو پہنچو اور تم میں سے کوئی پہلے ہی واپس بلا لیا جاتا ہے اور کوئی بدترین عمر کی طرف پھیر دیا جاتا ہے تا کہ سب کچھ جاننے کے بعد پھر کچھ نہ جانے۔ اور تم دیکھتے ہو کہ زمین سوکھی پڑی ہے پھر جہاں ہم نے اس پر مینہ برسایا کہ یکا یک وہ پھبک اُٹھی اور پھول گئی اور اس نے ہر قسم کی خوش منظر نباتات اگلنی شروع کر دی''۔ (سورۃ الحج : 5)

عمر سے متعلق جسمانی مسائل

آپ کے پاس خواہ کتنی ہی دولت کیوں نہ ہو' قابل رشک صحت ہو پھر بھی ہر انسان کو آخر کار بہت سی معذوریاں دیکھنی پڑتی ہیں اور عمر سے متعلق پیچیدگیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ان میں سے چند ایک کا ذکر آنے والی سطور میں کیا جا رہا ہے:

انسانی جسم کی کھال کو بڑی اہمیت حاصل ہے کیونکہ اسی سے یہ فیصلہ کیا جاتا ہے کہ ایک انسان کس طرح دکھائی دے رہا ہے۔ جب انسانی جسم میں سے چند ملی میٹر کا ریشہ نکال دیا جاتا ہے تو لامحالہ طور پر وہ انسان اس طرح دکھائی دیتا ہے جس پر نظر پڑتے ہی دیکھنے والا پریشان ہو جائے۔ ایسا اس لئے ہے کہ کھال جہاں ایک طرف جسم کو بیرونی خطرات سے بچاتی ہے وہیں یہ جسم کو ایک جمالیاتی صورت بھی مہیا کرتی ہے جس سے جسم خوبصورت نظر آتا ہے۔ بیشک یہ کھال کا ایک اہم کام ہے۔ اگر کوئی عورت اپنے آپ کو خوش شکل سمجھتی ہے تو ایسا محض اس کی کھال کی وجہ سے ہے۔ گوشت کا ایک ٹکڑا جس کا وزن کل چار ساڑھے چار پونڈ ہوتا ہے اس کے جسم کو ڈھانپ لیتا ہے۔ مگر دیکھنے والا حیران ہو جاتا ہے کہ یہی ایک ایسا عضو ہے جو بڑھاپے میں خراب نظر آنے لگتا ہے۔

جب انسان بوڑھا ہوتا ہے تو اس کے جسم کی کھال اپنی لچک کھو بیٹھتی ہے کیونکہ وہ ساختیاتی لحمیات جو اس کے نیچے کی تہوں کا ''ڈھانچہ'' تشکیل دیتی ہیں حساس اور کمزور ہو جاتی ہیں۔ اسی

سے چہرے پر جھریاں اور لکیریں پڑ جاتی ہیں جن کو دیکھ کر بہت سے لوگ خوفزدہ ہو جاتے ہیں۔ کھال کی سب سے اُوپر والی تہ کے غدودوں کا کام سست پڑ جاتا ہے جس سے شدید خشکی پیدا ہو جاتی ہے جب کھال باہر کے موسمی حالات کے سامنے کھلی رہتی ہے تو اس کی سرایت پذیری میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ اس کے نتیجے میں معمر انسانوں کو بے خوابی کا مرض لاحق ہو جاتا ہے۔ ان کے جسموں پر سطحی سے زخم ہو جاتے ہیں اور ان کے جسم خارش کرنے لگتے ہیں جسے ''بڑھاپے کی خارش'' کہتے ہیں۔ اسی طرح کھال کے نیچے کی تہوں کو بھی نقصان پہنچتا ہے۔ کھال کے ریشوں اور مواد کی تبدیلی سے بھی کام نہیں بنتا جس کے نتیجے میں رسولیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔

انسانی جسم کیلئے ہڈیوں کی مضبوطی بھی بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ بوڑھے لوگوں کیلئے کمر جھکائے بغیر سیدھا چلنا مشکل ہو جاتا ہے جبکہ نوجوان کیلئے یہ کوئی مسئلہ نہیں ہوتا۔ جب کوئی خمیدہ کمر کے ساتھ چلتا ہے تو اس کی ساری تمکنت اور غرور خاک میں مل جاتا ہے۔ اس سے یہ پیغام ملتا ہے کہ وہ انسان تو اب اپنے جسم پر بھی کنٹرول کرنے کے قابل نہیں رہا۔ گویا یہ بھی ایک انسان کے ''کبروغرور'' کا مٹ جانا ہے۔

ضعیف العمری کی بس اتنی ہی علامات نہیں ہیں۔ بوڑھے لوگ حسیات بھی کھو بیٹھتے ہیں کیونکہ ایک خاص عمر کے بعد عصبی خلیے دوبارہ کام کرنے کے قابل نہیں رہتے۔ خیرہ کن اور چندھیا دینے والی روشنی میں بوڑھے لوگ کمزور بینائی کی وجہ سے جگہ و مقام کا صحیح تعین نہیں کر سکتے۔ یہ بے حد اہم ہے اس لئے کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ آنکھوں کی بینائی محدود ہو گئی ہے۔ رنگوں کی شوخی، چیزوں کی حالت اور ان کا حجم دھندلا جاتا ہے بیشک بوڑھے انسانوں کیلئے یہ بڑی کٹھن صورت حال ہوتی ہے جس میں وہ اپنے آپ کو عادی بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔

عمر کے زیادہ ہو جانے کی بنا پر انسان اس جسمانی تباہی سے دوچار ہوتا ہے جس کا اسے اس سے پہلے کبھی تجربہ نہ ہوا تھا۔ عمر بڑھنے کے ساتھ ساتھ اب تک تو اس نے اپنے آپ کو پہلے سے زیادہ مضبوط اور صحت مند محسوس کیا تھا۔ ہم حالانکہ اس قسم کے کسی نمونے سے تو اب تک واقف نہیں ہیں مگر ایسی زندگیاں جو طویل ہو جاتی ہیں ہوسکتا ہے انہیں ایسے بے مثال مواقع میسر آئے ہوں گے جن میں وہ لوگ ذاتی طور پر زیادہ میل جول سے اپنی زندگی بہتر گزارنے میں کامیاب ہوئے ہوں۔ مگر بنی نوع انسان کیلئے جو نظام بہتر طور پر بنایا گیا ہے وہ وہی ہے جس میں جوں جوں



انسان بوڑھا ہوتا ہے زندگی سے متعلق مختلف باتیں روبہ زوال ہو جاتی ہیں۔

یہ اس دنیا کی عارضی حیثیت کا ایک اور ثبوت ہے۔ اللہ ہمیں اس حقیقت کے بارے میں بار بار قرآن حکیم میں یاددہانی کراتا ہے اور مومنین کیلئے حکم صادر ہوتا ہے کہ اس پر غوروفکر کریں:

اِنَّمَا مَثَلُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا كَمَآءٍ اَنْزَلْنٰهُ مِنَ السَّمَآءِ فَاخْتَلَطَ بِهٖ نَبَاتُ الْاَرْضِ مِمَّا يَاْكُلُ النَّاسُ وَالْاَنْعَامُ ط حَتّٰٓى اِذَآ اَخَذَتِ الْاَرْضُ زُخْرُفَهَا وَازَّيَّنَتْ وَ ظَنَّ اَهْلُهَآ اَنَّهُمْ قٰدِرُوْنَ عَلَيْهَآ لا اَتٰهَآ اَمْرُنَا لَيْلًا اَوْ نَهَارًا فَجَعَلْنٰهَا حَصِيْدًا كَاَنْ لَّمْ تَغْنَ بِالْاَمْسِ ط كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ○

''دنیا کی یہ زندگی (جس کے نشے میں مست ہو کر تم ہماری نشانیوں سے غفلت برت رہے ہو) اس کی مثال ایسی ہے جیسے آسمان سے ہم نے پانی برسایا تو زمین کی پیداوار جسے آدمی اور جانور سب کھاتے ہیں خوب گھنی ہوگئی پھر عین اس وقت جبکہ زمین اپنی بہار پر تھی اور کھیتیاں بنی سنوری کھڑی تھیں اور ان کے مالک سمجھ رہے تھے کہ اب ہم ان سے فائدہ اُٹھانے پر قادر ہیں' یکا یک رات کو یا دن کو ہمارا حکم آ گیا اور ہم نے اسے ایسا غارت کر کے رکھ دیا کہ گویا کل وہاں کچھ تھا ہی نہیں۔ اس طرح ہم نشانیاں کھول کھول کر پیش کرتے ہیں ان لوگوں کیلئے جو سوچنے سمجھنے والے ہیں''۔ (سورۂ یونس : 24)

زندگی کے ایک خاص دور کے بعد جب انسان یہ سمجھتا ہے کہ وہ جسمانی اور ذہنی طور پر مضبوط ہے' وہ پوری دنیا کو اپنے نقطہ نظر سے دیکھتا ہے پھر اچانک وہ ایک ایسے دور سے گزرتا ہے جس میں وہ ساری چیزیں اس سے چھن جاتی ہیں جن سے وہ کبھی لطف اندوز ہوا کرتا تھا۔ یہ عمل ناگزیر بھی ہے اور ناقابل واپسی بھی...... ایسا اسلئے ہے کہ اللہ نے اس دنیا کو ایک عارضی مقام کے طور پر تخلیق کیا تا کہ انسان اسمیں زندگی گزارے۔ اس نے اسے نا تمام بنایا تا کہ یہ انسان کو آخرت کی یاد دلاتی رہے۔

مشہور اور نامور لوگوں کے بڑھاپے سے کیا سبق حاصل کئے جا سکتے ہیں

بوڑھا ہونا ناگزیر اور اٹل ہے۔ بلا استثنیٰ کوئی بھی اس سے بچ نہیں سکتا۔ مگر جب ہم مشہور اور

نامور شخصیات کو بوڑھا ہوتے دیکھتے ہیں تو ہم پر اس کا زیادہ گہرا اثر ہوتا ہے شاید اسلئے کہ ان کی جسمانی خرابی ہماری نظروں کے سامنے ہوتی ہے۔ ان لوگوں کی ضعیف العمری کو دیکھتے ہوئے جو اپنی شہرت و ناموری، دولت دنیا اور حسن و جمال کی وجہ سے مشہور تھے ہمیں اس زندگی کے مختصر اور غیر اہم ہونے کی یقیناً ایک یاد دہانی ہوتی ہے۔

ہر روز ہم اس حقیقت پر مبنی سینکڑوں مثالیں دیکھ سکتے ہیں۔ ایک ذہین، صحت مند اور مشہور انسان یا وہ جو کبھی اپنے حسن و جمال میں ثانی نہ رکھتا تھا یا جو اپنی دنیاوی کامیابیوں کی بنا پر مشہور تھا ایک روز اخبارات، رسائل اور ٹی وی کی خبر بن جاتا ہے کہ وہ جسمانی اور ذہنی طور پر معذور ہو گیا ہے۔ یہ وہ انجام ہے جو ہر کسی کا مقدر بنتا ہے۔ تاہم مشہور لوگ ہمارے ذہنوں میں بطور خاص جگہ پاتے ہیں۔ جس طرح وہ بوڑھے ہوتے ہیں اور اپنی ساری دلکشی اور خوبصورتی کھو بیٹھتے ہیں اس سے ہم جذباتی طور پر بے حد متاثر ہوتے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک یہ ثبوت پیش کر رہا ہے کہ کوئی انسان جس قدر بھی کامیاب، خوبصورت اور جواں کیوں نہ ہو انسان کا ناگزیر انجام بڑھاپا ہے۔

انسانی موت

انسانی زندگی لحظہ بہ لحظہ ہمارے ہاتھ سے سرکتی جاتی ہے۔ کیا آپ اس حقیقت سے باخبر ہیں کہ ہر نیا دن آپ کو موت کے قریب تر لاتا جاتا ہے یا یہ کہ موت آپ کے بھی اسی قدر قریب ہے جتنی دوسروں کے قریب؟

جیسا کہ ہمیں اس آیت قرآنی میں بتایا گیا ہے کہ جو کوئی بھی اس دنیا میں آیا اسے ایک روز مرنا ہے: كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ ثُمَّ اِلَيْنَا تُرْجَعُوْنَ ۝ "ہر متنفس کو موت کا مزا چکھنا ہے پھر تم سب ہماری طرف ہی پلٹا کر لائے جاؤ گے"۔ (سورۃ العنکبوت: 57) بغیر استثنیٰ کے وہ سب کے سب مر گئے، ان میں سے ہر ایک آج ہم سے بچھڑ کر جانے والے ان لوگوں کا نشان تک بھی باقی نہیں ہے وہ جو آج زندہ ہیں اور وہ جو مستقبل میں زندہ ہوں گے ایک پہلے سے مقرر دن کو موت سے ہمکنار ہوں گے۔ اس حقیقت کے باوجود لوگ موت کو ایک خلافِ قیاس واقعہ سمجھتے ہیں۔

ایک ایسے شیر خوار بچے کا تصور کریں جس نے ابھی ابھی اس دنیا میں آنکھیں کھولی ہیں اور دوسری طرف ایک ایسا انسان ہے جو موت سے قبل آخری ہچکی لینے والا ہے۔ ان دونوں کو اپنی اپنی پیدائش یا موت پر کسی قسم کا بھی کوئی اختیار نہیں تھا۔ یہ صرف اور صرف اللہ کے قبضۂ قدرت میں ہے کہ کسی انسان کو سانس لینے کی مہلت دیئے رکھے یا اس کی زندگی واپس لے لے۔

تمام انسان ایک خاص دن تک زندہ رہیں گے اور پھر مر جائینگے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک کی درج ذیل سورۃ میں لوگوں کے اس رویّے کا ذکر فرمایا ہے جو عام طور پر موت کے وقت دکھایا جاتا ہے:

قُلْ إِنَّ الْمَوْتَ الَّذِي تَفِرُّونَ مِنْهُ فَإِنَّهُ مُلَاقِيكُمْ ثُمَّ تُرَدُّونَ إِلَىٰ عَالِمِ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ ۝

''ان سے کہو: تم جس موت سے بھاگتے ہو وہ تمہیں آ کر رہے گی۔ پھر تم اس کے سامنے پیش کئے جاؤ گے جو پوشیدہ و ظاہر کا جاننے والا ہے اور وہ تمہیں بتا دے گا کہ تم کیا کچھ کرتے رہے ہو''۔ (سورۃ الجمعہ : 8)

لوگوں کی اکثریت موت کے بارے میں سوچنے سے پہلو تہی کرتی ہے۔ روزمرہ کے واقعات کے تیز رفتار سمندر میں انسان عموماً بالکل مختلف موضوعات کے بارے میں سوچنے میں مصروف رہتا ہے۔ مثلاً یہ کہ کس کالج میں داخلہ لینا ہے، کس کمپنی میں کام کرنا ہے، کل صبح کس رنگ کا لباس پہننا ہے، دوپہر کے کھانے میں کیا پکانا ہے۔ یہ بڑے بڑے معاملات ہیں جن کے بارے میں ہم عموماً سوچتے ہیں۔ زندگی کے بارے میں یہی تصور پایا جاتا ہے کہ یہ نام ہی روزمرہ کے ان چھوٹے چھوٹے معاملات کا ہے۔ موت کا کہیں ذکر چھڑ بھی جائے تو وہ لوگ مخل ہو کر خاموش کرا دیتے ہیں جن کو یہ موضوع اچھا نہیں لگتا۔ انسان یہ سمجھتا ہے کہ موت چونکہ صرف اس وقت آئے گی جب وہ بوڑھا ہو جائے گا اس لئے وہ قبل از وقت ایسے ناخوشگوار اور تلخ موضوع کے بارے میں اپنے آپ کو فکرمند نہیں کرنا چاہتا۔ مگر یہ بات ہمیشہ ذہن نشین رکھنے کی ہے کہ آنے والے مزید ایک گھنٹے کی کوئی ضمانت نہیں ہے کہ وہ آئے گا بھی یا نہیں۔ انسان اپنے اردگرد لوگوں کی اموات دیکھتا ہے مگر بہت کم سوچتا ہے کہ ایک روز دوسرے اس کی موت دیکھیں گے۔ وہ یہ کبھی تصور نہیں کرتا کہ ایسا انجام اس کا منتظر ہے۔

چنانچہ جب انسان کو موت آتی ہے تو زندگی کی تمام ''حقیقتیں'' اچانک غائب ہو جاتی ہیں۔ ''اچھے بیتے دنوں'' کی کسی یاددہانی کو دنیا میں بقائے دوام حاصل نہیں ہے ہر اس چیز کے بارے میں سوچو جسے تم اس لمحے کر سکتے ہو' تم پلکیں جھپک سکتے ہو' جسم کو حرکت دے سکتے ہو' بول سکتے ہو' ہنس سکتے ہو' یہی تمہارے جسم کے کام ہیں۔ اب یہ خیال کرو کہ موت کے بعد تمہارے جسم کی کیا حالت ہوگی اس کی کیا صورت رہ جائے گی۔

زندگی کا آخری سانس لینے کے بعد تم صرف اور صرف ''گوشت پوست کا ڈھیر'' رہ جاؤ گے۔ بے جان اور بے روح ڈھیر۔ تمہارا جسم خاموش اور بے حس وحرکت پڑا ہوگا جسے مردہ خانے تک اُٹھا کر لے جائینگے۔ وہاں سے آخری بار غسل دیا جائے گا۔ پھر اسے ایک چادر (کفن) میں لپیٹ کر تابوت میں بند کر کے قبرستان تک لے جائینگے۔ تمہارے جسد خاکی کو لحد میں اُتارنے کے بعد اُوپر مٹی ڈال دی جائے گی۔ یہ ہے تمہاری داستانِ حیات کا اختتام۔ اب آئندہ کے لئے صرف تمہارے نام کی مرمریں لوح قبر اس قبرستان میں نظر آیا کرے گی۔ نہ تم ہو گے نہ تمہارے چاہنے والوں کی محفلیں' نہ قہقہے نہ کاروبار زندگی۔

تمہاری موت کے بعد چند ماہ یا چند برس تک تمہاری قبر پر باقاعدگی سے آنے والے موجود رہیں گے۔ مگر جوں جوں وقت گزرتا جائے گا قبر پر آنے والوں کی تعداد میں کمی واقع ہوتی جائے گی۔ چند دہائیاں گزر جانے کے بعد اس قبر پر کبھی کوئی نظر نہ آیا کرے گا۔

دریں اثناء تمہارے خاندان کے قریبی لوگ تمہاری موت کی وجہ سے ایک مختلف تجربے سے گزریں گے۔ گھر کے اندر تمہارا کمرہ اور بستر خالی ہوگا۔ جنازے کے بعد تمہاری ملکیت میں شامل چیزوں میں سے بہت کم گھر میں باقی رکھی جائینگی۔ تمہارے زیادہ ملبوسات' جوتے وغیرہ ضرورت مندوں کو دے دیئے جائینگے۔ دفتر عوامی رجسٹریشن میں تمہاری فائل منسوخ کر دی جائے گی یا پرانے ریکارڈ میں پھینک دی جائے گی۔ ابتدائی چند برسوں میں تو کوئی نہ کوئی تمہارے لئے نوحہ خواں ضرور ہوگا۔ جو یادیں تم نے پیچھے چھوڑیں انہیں مٹنے میں کچھ وقت لگے گا۔ چالیس یا پچاس برس بعد تم چند لوگوں کو یاد رہ جاؤ گے۔ جلد ہی نئی نسلیں آ جائینگی اور پھر کرۂ ارض پر تمہاری نسلوں میں سے کوئی ایک بھی باقی نہ رہے گی۔ تمہیں یاد کیا جا رہا ہے یا نہیں اس سے تمہیں کیا فرق پڑے گا۔

جب دنیا میں اس طرح کے حالات ہوں گے زیر زمین تمہارا مردہ جسم تیزی کے ساتھ پیوند

خاک ہو رہا ہوگا۔ تمہیں جوں ہی قبر میں دفن کر کے لوگ واپس لوٹے ہوں گے آکسیجن کی عدم موجودگی کی وجہ سے جرثوموں اور کیڑوں مکوڑوں نے تمہارے جسم کو کھانا شروع کر دیا ہوگا۔ نامیاتی جسموں سے خارج ہونے والی گیسوں نے جسم کو پھلا دیا ہوگا۔ اس کا آغاز پیٹ سے ہوتا ہے، جس کی وجہ سے اس کی شکل وصورت بدل جاتی ہے۔ ناک اور منہ سے خون آلود جھاگ نکلنے لگتی ہے اس لئے کہ پردہ شکم پر دباؤ پڑتا ہے۔ جسم جوں جوں گلنے سڑنے لگتا ہے بال، ناخن، تلوے اور ہتھیلیاں جھڑ جاتی ہیں۔ جسم کے ان بیرونی اعضاء کے ساتھ ساتھ اندرونی اعضاء مثلاً پھیپھڑے، دل اور جگر بھی شکست وریخت کا شکار ہونے لگتے ہیں۔ اس دوران شکم کے اندر نہایت تکلیف عمل ظہور پذیر ہوتا ہے، جہاں کھال گیسوں کا دباؤ برداشت نہیں کر سکتی اور اچانک پھٹ جاتی ہے جس سے نا قابل برداشت تعفن اور بدبو پھیل جاتی ہے۔ کھوپڑی سے شروع ہو کر پٹھے اپنی اپنی مخصوص جگہوں سے جدا ہونے لگتے ہیں۔ کھال اور نرم ریشے مکمل طور پر جدا ہو جاتے ہیں۔ دماغ ٹوٹ پھوٹ جائے گا اور چکنی مٹی جیسا ہو جائے گا۔ یہ عمل اس وقت تک جاری رہے گا جب تک پورا جسم پنجر میں تبدیل نہیں ہو جاتا۔

دوبارہ پچھلی زندگی میں لوٹ کر جانے کا کوئی امکان نہیں ہے۔ خاندان کے افراد کے ہمراہ کھانے کی میز پر جمع ہونے، ملنے جلنے یا باعزت اور باوقار ملازمت کے ازسرنو حصول کی کوئی امید نہ کی جا سکے گی۔ مختصر یہ کہ "گوشت اور ہڈیوں کا وہ ڈھیر" جسے ہم ایک شناخت دیتے ہیں بڑے تکلیف دہ انجام سے دوچار ہوتا ہے۔ دوسری طرف تم خود بلکہ تمہاری روح اس جسم کو اسی وقت چھوڑ دے گی جونہی تم جاں بحق ہو جاؤ گے۔ تمہارا بقیہ...... تمہارا جسم...... مٹی میں مل کر مٹی ہو جائے گا۔

ٹھیک ہے مگر ان سب باتوں کے یوں ظہور پذیر ہونے کا سبب کیا ہے؟

اگر اللہ نے چاہا ہوتا تو جسم اس طرح سے کبھی پیوند خاک نہ ہوا ہوتا۔ ایسا ہونے میں خود اس کے اندر ایک بہت اہم پیغام ملتا ہے۔

انسان کا وہ خوفناک انجام جو اس کا انتظار کرتا ہے، اسے چاہئے کہ وہ انسان کو یہ تسلیم کرا لے کہ وہ اپنے آپ میں محض ایک جسم نہیں ہے بلکہ وہ تو ایک ایسی روح ہے جو اس جسم کے پنجرے میں بند ہے۔ دوسرے لفظوں میں انسان کو اس بات کا اعتراف کرنا ہے کہ جسم سے ماورا بھی اس کا ایک وجود ہے۔ مزید یہ کہ انسان کو اپنے جسم کی موت کے بارے میں سمجھنا چاہئے جسے وہ یوں اپنے

پاس رکھنے کی کوشش کرتا ہے جیسے اس کو اس عارضی دنیا میں ہمیشہ کیلئے زندہ رہنا ہے۔ تاہم اس کا یہ جسم جس کو وہ اسقدر اہم سمجھتا ہے ایک روز گل سڑ کر حشرات الارض کی خوراک بن جائیگا اور بالآخر ایک پنجر باقی رہ جائے گا اور وہ دن بہت جلد آنے ہی والا ہے۔

ان حقائق کے باوجود انسانی ذہن کا میلان کچھ اس قسم کا ہے کہ جس شے کو وہ پسند نہیں کرتا یا چاہتا نہیں اس کی پرواہ نہیں کرتا۔ وہ تو ان چیزوں کو بھی نظر انداز کرنے کی کوشش کرتا ہے جن کا وہ آمنا سامنا نہیں کرسکتا۔ جب موت گفتگو کا موضوع ہو اس وقت اس کا یہ رویہ زیادہ کھل کر سامنے آتا ہے کسی کا جنازہ یا خاندان کے کسی بہت قریبی عزیز کی موت اس حقیقت کو اسے یاد کراتی ہے۔ عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ وہ لوگ جو نیند کے دوران مرجائیں یا کسی حادثے میں لقمہ اجل بن جائیں وہ مختلف قسم کے لوگ ہوتے ہیں اور جن چیزوں سے ان کا آمنا سامنا ہوتا ہے وہ ہمارے سر پر کبھی نہیں پڑتیں۔ ہر انسان یہی سمجھتا ہے کہ ابھی مرجانا بہت جلدی ہوگا اور یہ کہ زندہ رہنے کے لئے ہمیشہ بڑے سال باقی ہوتے ہیں۔

زیادہ اغلب خیال یہی ہے کہ وہ انسان جو سکول جاتے ہوئے یا کسی کاروباری اجلاس میں شرکت کیلئے تیزی سے جاتے وقت مرجاتے ہیں ان کا بھی یہی خیال ہوتا ہے۔ انہوں نے غالباً یہ کبھی نہ سوچا تھا کہ اگلے روز کے اخبارات میں ان کی موت کی خبریں شائع ہوں گی۔ یہ بھی عین ممکن ہے کہ جس وقت آپ یہ سطریں پڑھ رہے ہوں گے، انہیں پڑھ چکنے کے بعد بھی آپ یہ توقع نہیں رکھتے ہوں گے کہ آپ مرسکتے ہیں۔ یا آپ اس بات کے امکان پر بھی شاید یقین نہ رکھتے ہوں گے۔ غالباً اسلئے کہ آپ یہ محسوس کرتے ہیں کہ اس وقت مرجانا بہت جلد ہوگا کیونکہ ابھی تو آپ کو بہت سے کام مکمل کرنے ہیں۔ تاہم ایسا سوچنا موت سے گریز کرنے کے مترادف ہے اور موت سے بچ نکلنے کی یہ بے سود کوششیں ہیں:

قُلْ لَّنْ يَّنْفَعَكُمُ الْفِرَارُ اِنْ فَرَرْتُمْ مِّنَ الْمَوْتِ اَوِ الْقَتْلِ وَ اِذًا لَّا تُمَتَّعُوْنَ اِلَّا قَلِيْلًا○

''اے نبیؐ ان سے کہو اگر تم موت یا قتل سے بھاگو تو یہ بھاگنا تمہارے لئے کچھ بھی نفع بخش نہ ہوگا۔ اس کے بعد زندگی کے مزے لوٹنے کا تھوڑا ہی موقعہ تمہیں مل سکے گا''۔

(سورۃ الاحزاب : 16)



ناک اور منہ سے بہتی ہوئی خون آلود جھاگ



موت کے فوراً بعد



آنکھیں جو موت کے بعد جامنی (ارغوانی) ہو جاتی ہیں



مردہ جسم میں شکست وریخت شروع



قبر کے اندر کیڑوں کی کھائی ہوئی لاش



ایک جلی ہوئی لاش۔

اَیۡنَ مَا تَکُوۡنُوۡا یُدۡرِکۡکُّمُ الۡمَوۡتُ وَ لَوۡ کُنۡتُمۡ فِیۡ بُرُوۡجٍ مُّشَیَّدَۃٍ ؕ

”رہی موت تو جہاں بھی تم ہو وہ بہر حال تمہیں آ کر رہے گی خواہ تم کیسی ہی مضبوط عمارتوں میں ہو“

(سورۃ النساء : 78)

انسان جسے تنہا تخلیق کیا گیا ہے اُس کو ضرور اس حقیقت سے باخبر ہونا چاہئے کہ وہ مرے گا بھی تنہا۔

تاہم انسان جب تک زندہ رہتا ہے نشے کی مانند دھن دولت کا اسیر ہو جاتا ہے۔ اسے مال و دولت کی لت لگ جاتی ہے۔ زندگی کا واحد مقصد مزید مال و اسباب جمع کرنا رہ جاتا ہے۔ مگر کوئی انسان بھی تو مال و دولت ساتھ لے کر قبر میں نہیں جاتا۔ مردہ جسم کو جس ڈھیلی ڈھالی چادر (کفن) میں لپیٹ کر دفن کیا جاتا ہے وہ بھی سستے سے کپڑے کی ہوتی ہے انسانی جسم اس دنیا میں تنہا آتا ہے اور تنہا ہی جاتا ہے۔ واحد اثاثہ جو کوئی اپنے ساتھ مرتے وقت لے جا سکتا ہے وہ اس کا ایمان یا فقدان ایمان (کفر) ہوتا ہے۔

> اَللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِّنْ ضُعْفٍ ثُمَّ جَعَلَ مِنْۢ بَعْدِ ضُعْفٍ قُوَّةً ثُمَّ جَعَلَ مِنْۢ بَعْدِ قُوَّةٍ ضُعْفًا وَّ شَیْبَةً ؕ یَخْلُقُ مَا یَشَآءُ ۚ وَ هُوَ الْعَلِیْمُ الْقَدِیْرُ۝
>
> ''اللہ ہی تو ہے جس نے ضعف کی حالت سے تمہاری پیدائش کی ابتداء کی پھر اس ضعف کے بعد تمہیں قوت بخشی۔ پھر اس وقت کے بعد تمہیں ضعیف اور بوڑھا کر دیا۔ وہ جو کچھ چاہتا ہے پیدا کرتا ہے اور وہ سب کچھ جاننے والا ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے۔ (سورۃ الرّوم : 54)



دُنیاوی مال واسباب کالالچ

عمر بھر ہم مخصوص چیزوں کے حصول میں مصروف عمل رہتے ہیں۔ دولت، جائیداد، بہتر مقام ومرتبہ، شریک حیات اور بچے۔ یہ وہ مشترک چیزیں ہیں جن کی تلاش میں ہر انسان سرگرداں رہتا ہے۔ زندگی بھر کی منصوبہ بندی اور کوششیں ان تک رسائی کیلئے محدود رہتی ہیں۔ اس واحد حقیقت کے باوجود جسمیں کسی کو کوئی اختلاف نہیں، کہ ہر شے گزرتی عمر کی طرف جھکی رہتی ہے اور بالآخر دنیا سے مٹ جاتی ہے، لوگ پھر بھی ان چیزوں کے ساتھ اپنی گہری وابستگی ختم نہیں کرتے۔ ایک روز بالکل نئی کار پرانے فیشن میں شمار ہونے لگتی ہے، قدرتی آفات کے باعث زرخیز کھیتیاں بنجر ہو جاتی ہیں۔ ایک حسین وجمیل عورت جب بوڑھی ہو جاتی ہے تو اس کی ساری دلکشی ختم ہو جاتی ہے۔ پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ اس دنیا میں ہر انسان کو ایک نہ ایک روز مر جانا ہے اور جو کچھ اس کی ملکیت میں تھا اسی دنیا میں رہ جاتا ہے۔ یہ بیشک ایسے حقائق ہیں جنہیں مسترد نہیں کیا جا سکتا مگر پھر بھی انسان دنیاوی مال واسباب کیلئے بے حدو حساب رغبت کا مظاہرہ کرتا ہے۔

وہ لوگ جنہوں نے اپنی زندگیاں دنیاوی مال واسباب کیلئے آنکھیں بند کر کے وقف کر رکھی ہوتی ہیں انہیں ایک روز یہ احساس ہوگا کہ وہ عمر بھر سایوں کے پیچھے بھاگتے رہے ہیں۔ مرنے کے بعد انہیں اپنی مضحکہ خیز حالت کا اندازہ ہوگا۔ صرف اسی وقت زندگی کا اصل مقصد ان پر واضح ہوگا کہ انہیں تو اللہ کا سچا غلام بن کر رہنا تھا۔

اللہ نے قرآن حکیم میں لوگوں کی اس ''گہری وابستگی'' کا ذکر درج ذیل سورۃ میں یوں فرمایا ہے:

زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ النِّسَآءِ وَ الْبَنِيْنَ وَ الْقَنَاطِيْرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَ الْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَ الْاَنْعَامِ وَ الْحَرْثِ ط ذٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ج وَ اللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الْمَاٰبِ o

''لوگوں کیلئے مرغوباتِ نفس...... عورتیں' اولاد' سونے چاندی کے ڈھیر' چیدہ گھوڑے' مویشی اور زرعی زمینیں بڑی خوش آئند بنادی گئی ہیں مگر یہ سب دنیا کی چند روزہ زندگی کے سامان ہیں۔ حقیقت میں جو بہتر ٹھکانا ہے وہ تو اللہ کے پاس ہے''۔ (سورۃ آل عمران: 14)

اس دنیا کے سارے معاملات ــــ دولت' بیویاں' اولاد اور تجارت بہت سے انسانوں کو اس زندگی میں مصروف رکھتے ہیں۔ تاہم اگر وہ اللہ کی طاقت اور عظمت کا اعتراف کر لیتے تو انہیں معلوم ہو جاتا کہ انسان کو جو تمام چیزیں عطا کی گئی ہیں وہ اس ذات باری تعالٰی کی خوشنودی حاصل کرنے کا ذریعہ ہیں۔ اس طرح سے انہیں یہ بات سمجھ آ جائے گی کہ انسان کا اصل مقصد اس خالق و مالک کا غلام بن کر رہنا ہے۔ مگر وہ لوگ جو اللہ پر ایمان نہیں رکھتے وہ دیدۂ بینا نہیں رکھتے اور اپنی اس دنیا میں موجودگی کے بارے میں سمجھنے سے اسلئے محروم رہ جاتے ہیں کیونکہ وہ دنیاوی خواہشوں کے اسیر ہوتے ہیں۔ وہ اس پُرنقص اور ادھوری زندگی سے بڑی بڑی چیزوں کی اُمید لگائے رکھتے ہیں۔

کس قدر حیرت کا مقام ہے کہ انسان آخرت کے بارے میں سب کچھ بھلا بیٹھتا ہے۔ جو اس کیلئے ایک جامع' بے نقص اور لامحدود حد تک اعلیٰ مسکن ہے اور اس دنیا سے مطمئن ہو کر بیٹھ گیا ہے۔ اگر ایک انسان اللہ پر پورا ایمان نہیں بھی رکھتا تو آخرت کی موجودگی کے بارے میں ذرا سا ''امکان'' بھی اسے زندگی میں محتاط رویہ اپنانے پر راغب کر دے گا۔

دوسری طرف مومنین اس بات سے پوری طرح آگاہ ہیں کہ یہ کسی طرح بھی امکان نہیں بلکہ حقیقت ہے۔ اسی لئے وہ عمر بھر اس کوشش میں لگے رہتے ہیں کہ کسی طرح بھی جہنم میں جانے کا ہلکا سا امکان بھی نہ رہ جائے۔ ان کی پوری کوشش ہوتی ہے کہ جنت حاصل کر لیں۔

وہ جانتے ہیں کہ اس دنیا میں بیکار خواہشوں کے تعاقب میں گزاری گئی زندگی کے نتیجے میں آخرت' میں جس مایوسی کا احساس ہوگا وہ بے حد تلخ ہوگا۔ وہ اس بات سے بھی خوب آگاہ ہیں کہ دنیا میں جمع کی گئی دولت' بھاری بینک' کھاتے' پُرتعیش کاریں یا محلات بھی دائمی سزا سے بچنے کیلئے

اُن سے بطورِ تاوان قبول نہیں کیے جائینگے۔ مزید یہ آخرت میں نہ خاندان، نہ ہی جان سے پیارے دوست موجود ہوں گے کہ انہیں دائمی رنج و غم سے بچالیں۔ اس کے برعکس ہر کوئی اپنے آپ کو بچانے کی فکر میں ہوگا۔ اس سب کے باوجود بھی بہت سے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اس زندگی کا تسلسل آخرت تک نہیں جاتا اور وہ لالچ میں آ کر اس دنیا کو گلے لگا لیتے ہیں۔ اس کا ذکر ربِّ کائنات نے درج ذیل سورۃ میں یوں فرمایا ہے:

اَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ ۝ حَتّٰى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ ۝

''تم لوگوں کو زیادہ سے زیادہ اور ایک دوسرے سے بڑھ کر دنیا حاصل کرنے کی دھن نے غفلت میں ڈال رکھا ہے یہاں تک کہ (اسی فکر میں) تم لب گور پہنچ جاتے ہو''۔

(سورۃ التکاثر : 1-2)

بیشک دنیاوی مال و اسباب میں دلکشی کا پایا جانا ہی آزمائش کا راز ہے۔ اللہ جو چیزیں انسان کو عطا کرتا ہے انہیں بڑی صناعی کے ساتھ تخلیق کرتا ہے مگر وہ پھر بھی مختصر عرصے کیلئے ہوتی ہیں۔ ایسا اس لئے ہے تاکہ لوگ اس بارے میں سوچیں اور جو چیزیں انہیں اس دنیا میں عطا کی ہیں ان کا آخرت کی چیزوں کے ساتھ موازنہ کریں۔ یہ وہ ''راز'' ہے جس کی بات ہم کر رہے ہیں۔ اس دنیا کی زندگی بیشک بڑی شاندار ہے۔ یہ بڑی رنگین اور دلکش نظر آتی ہے اور اس کی ایک ایک شے سے اللہ کی تخلیق کی عظمت ٹپکتی ہے۔ اچھی زندگی گزارنا اور اس سے لطف اندوز ہونا بیشک ایک ایسی شے ہے جس کی انسان خواہش کرتا ہے اور انسان یقیناً اللہ سے دُعا مانگتا ہے کہ وہ ایسی زندگی گزار سکے۔ مگر یہ کبھی بھی اصل مقصد نہیں ہوسکتا۔ اس لئے کہ زندگی میں اس قسم کا مقصد اتنا اہم نہیں ہوتا جتنا اہم اللہ کی خوشنودی حاصل کرنا اور جنت کا حصول ہے۔ اس لئے انسان کو ان انعاماتِ خداوندی سے لطف اندوز ہوتے وقت اپنا اصل مقصد کبھی نہیں بھولنا چاہئے۔

اللہ نے انسان کو اس بارے میں درج ذیل سورۃ میں متنبہ کیا ہے:

وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَمَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ زِيْنَتُهَا ۚ وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ وَّ اَبْقٰى ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝

''تم لوگوں کو جو کچھ بھی دیا گیا ہے وہ محض دنیا کی زندگی کا سامان اور اس کی زینت ہے اور جو کچھ اللہ کے پاس ہے وہ اس سے بہتر اور باقی تر ہے۔ کیا تم لوگ عقل سے کام نہیں

لیتے؟'' (سورۃ القصص : 60)

دنیاوی چیزوں سے بڑھی ہوئی رغبت ایک ایسا سبب ہے جس کی بنا پر انسان آخرت کو بھول جاتا ہے۔ ایک اور بات بھی یاد رکھنے کی ہے' انسان کو ان دنیاوی چیزوں سے حقیقی خوشی کبھی حاصل نہیں ہوتی جن کو وہ لالچ میں سینے سے لگائے رہتا ہے نہ ہی اسے وہ چیزیں سچی خوشی دیتی ہیں جن کے حصول میں وہ رات دن سرگرداں رہتا ہے۔ ایسا اسلئے ہے کہ شدید خواہشات اطمینان مہیا نہیں کرسکتیں۔ انسان جتنا کچھ بھی حاصل کرلے اس کی ذات کی آرزوئیں کبھی ختم نہیں ہوتیں۔ یہ عجیب بات ہے کہ وہ ہل من مزید کا مطالبہ کرتا رہتا ہے اور پہلے سے زیادہ اور بہتر کے حصول کی آرزو اسے پریشان کئے رکھتی ہے۔ اسی وجہ سے انسان کو اس دنیا میں چین اور سکون میسر نہیں آتا۔

کیا حقیقی دولت کا اس دنیا میں کوئی وجود ہے؟

لوگوں کی اکثریت کا خیال ہے کہ وہ اپنی زندگی کو اگر ایک بار فیصلہ کرلیں تو اس دنیا میں مکمل اور بہترین بنا سکتے ہیں۔ مزید یہ کہ وہ صرف یہ سمجھتے ہیں کہ زندگی کا اعلیٰ معیار حاصل کرنے کیلئے صرف زیادہ سے زیادہ دولت درکار ہوتی ہے یا بہتر معیارات زندگی' خوشگوار خاندانی زندگی اور معاشرے میں قابل تعریف مرتبہ و مقام ضروری ہوتا ہے۔ مگر جو لوگ تمام وقت ان چیزوں کے حصول میں صرف کردیتے ہیں انہیں بھی غلط فہمی ہوگئی ہے اور وہ بھی غلطی کئے جارہے ہیں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ دنیاوی خوشی و مسرت اور چین و سکون کے حصول کی خاطر وہ تگ و دو کرتے رہتے ہیں اور آخرت کو بالکل بھلائے رکھتے ہیں۔ اس حقیقت کے باوجود کہ ان کی زندگی کا حقیقی مقصد تو اس دنیا میں اللہ کا غلام اور فرمانبردار بندہ بن کر رہنا ہے اور جو کچھ اس نے عطا کیا ہے اس کا شکر ادا کرنا ہے مگر وہ تو فضول خواہشات کی تکمیل میں لگے رہتے ہیں۔ قرآن حکیم میں اللہ نے انسان کو دنیا کے پُر فریب لالچ اور اس کی ان بیکار خواہشوں کے بارے میں اس طرح مطلع فرمایا ہے:

اِعْلَمُوْٓا اَنَّمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَّ لَهْوٌ وَّ زِيْنَةٌ وَّ تَفَاخُرٌۢ بَيْنَكُمْ وَ تَكَاثُرٌ فِي الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِ ؕ كَمَثَلِ غَيْثٍ اَعْجَبَ الْكُفَّارَ نَبَاتُهٗ ثُمَّ يَهِيْجُ فَتَرٰىهُ مُصْفَرًّا ثُمَّ يَكُوْنُ حُطَامًا ؕ وَ فِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ شَدِيْدٌ ۙ وَّ مَغْفِرَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَ رِضْوَانٌ ؕ وَ مَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ ۝

''خوب جان لو کہ یہ دنیا کی زندگی اس کے سوا کچھ نہیں کہ ایک کھیل اور دل لگی اور ظاہری ٹیپ ٹاپ اور تمہارا آپس میں ایک دوسرے پر فخر جتانا اور مال و اولاد میں ایک دوسرے سے بڑھ جانے کی کوشش کرنا ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک بارش ہوگئی تو اس سے پیدا ہونے والی نباتات کو دیکھ کر کاشت کار خوش ہو گئے۔ پھر وہی کھیتی پک جاتی ہے اور تم دیکھتے ہو کہ وہ زرد ہوگئی۔ پھر وہ بھس بن کر رہ جاتی ہے اس کے برعکس آخرت وہ جگہ ہے جہاں سخت عذاب ہے اور اللہ کی مغفرت اور اس کی خوشنودی ہے۔ دنیا کی زندگی ایک دھوکے کے سوا کچھ نہیں''

(سورۃ الحدید : 20)

بہت سے لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے اور نہ ہی اسے اس دنیا میں رہتے ہوئے دیکھ لینا ممکن سمجھتے ہیں جو ان کی بہت بڑی غلطی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ ان کی دولت دنیا کبھی ضائع نہیں ہوگی۔ اپنے غرور و تکبر کے باعث وہ اللہ کے سامنے سر تسلیم خم نہیں کرتے اور اس کے وعدے کے خلاف اپنے منہ موڑ لیتے ہیں۔ ان لوگوں کے انجام کا ذکر قرآن پاک میں اس طرح آیا ہے:

اِنَّ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَ نَا وَ رَضُوْا بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ اطْمَاَنُّوْا بِهَا وَ الَّذِيْنَ هُمْ عَنْ اٰيٰتِنَا غٰفِلُوْنَ o اُولٰٓئِكَ مَاْوٰهُمُ النَّارُ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ o

''حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ ہم سے ملنے کی توقع نہیں رکھتے اور دنیا کی زندگی ہی پر راضی اور مطمئن ہو گئے ہیں اور جو لوگ ہماری نشانیوں سے غافل ہیں ان کا آخری ٹھکانا جہنم ہوگا۔ ان برائیوں کی پاداش میں جن کا اکتساب وہ (اپنے اس غلط عقیدے اور غلط طرز عمل کی وجہ سے) کرتے رہے''۔ (سورۃ یونس : 7-8)

تاریخ میں ایسے بہت سے لوگوں کا ذکر آیا ہے۔ بادشاہ' سلاطین اور فراعین نے سوچا کہ وہ اپنی ناقابل اعتبار دولت کی بنیاد پر لافانی ہو سکتے تھے۔ یہ تصور ان کے ذہنوں میں کبھی نہ آیا تھا کہ دنیا میں دولت اور طاقت سے بھی زیادہ قیمتی شے کوئی اور موجود ہے۔ اس مریضانہ اور پُر نقص ذہنیت نے ان کے عوام کو گمراہ کر دیا تھا جو ان کی دولت اور طاقت سے بڑے مرعوب تھے۔ تاہم ان تمام کفار کا بڑا بھیانک انجام ہوا۔ ان کے بارے میں اللہ ہمیں قرآن حکیم میں اس طرح مطلع فرماتا ہے:

اَيَحْسَبُوْنَ اَنَّمَا نُمِدُّهُمْ بِهٖ مِنْ مَّالٍ وَّ بَنِيْنَ o نُسَارِعُ لَهُمْ فِي

الْخَيْرٰتِ ط بَلْ لَّا يَشْعُرُوْنَ ○

''کیا یہ سمجھتے ہیں کہ ہم جو انہیں مال اولاد سے مدد دیئے جا رہے ہیں تو گویا انہیں بھلائیاں دینے میں سرگرم ہیں؟ نہیں، اصل معاملے کا انہیں شعور نہیں ہے'' (سورۃ المومنون : 55-56)

فَلَا تُعْجِبْكَ اَمْوَالُهُمْ وَلَآ اَوْلَادُهُمْ ط اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ بِهَا فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ تَزْهَقَ اَنْفُسُهُمْ وَهُمْ كٰفِرُوْنَ ○

''ان کے مال و دولت اور ان کی کثرتِ اولاد کو دیکھ کر دھوکا نہ کھاؤ۔ اللہ تو یہ چاہتا ہے کہ انہی چیزوں کے ذریعے سے ان کو دنیا کی زندگی میں بھی مبتلائے عذاب کرے اور یہ جان بھی دیں تو انکارِ حق ہی کی حالت میں دیں''۔ (سورۃ التوبہ : 55)

یہ لوگ دراصل ایک بے حد اہم اور نازک بات کی طرف توجہ نہیں دے رہے۔ تمام دولت اور جو شے بھی وہ اہم سمجھ رہے ہیں اللہ کی ملکیت ہے۔ اللہ ہی دولت کا اصل مالک ہے اور جن کو وہ چاہتا ہے بیشمار مال و دولت سے نوازتا ہے۔ انسان سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ اس کے لئے اللہ کا شکر گزار ہوگا اور اس کا بندہ و غلام بن جائے گا۔ جب بھی اللہ کسی کو مال و اسباب دیتا ہے۔ تو کوئی انسان اسے محدود نہیں کر سکتا اور اسی طرح جب اللہ کسی کو اس سے محروم رکھنا چاہتا ہے تو اللہ کے سوا کوئی نہیں جو اسے بحال کر سکے۔ یوں اللہ لوگوں کو آزمائش میں ڈالتا ہے تاہم وہ لوگ جو اپنے خالق اور یوم حساب کو بھول جاتے ہیں وہ اس طرف کوئی توجہ نہیں دیتے:

اَللّٰهُ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَ يَقْدِرُ ط وَ فَرِحُوْا بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ط وَ مَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا فِى الْاٰخِرَةِ اِلَّا مَتَاعٌ ○

''اللہ جس کو چاہتا ہے رزق کی فراخی بخشتا ہے اور جسے چاہتا ہے نپا تلا رزق دیتا ہے۔ یہ لوگ دنیوی زندگی میں مگن ہیں، حالانکہ دنیا کی زندگی آخرت کے مقابلے میں ایک متاعِ قلیل کے سوا کچھ بھی نہیں'' (سورۃ الرعد : 26)

کیا دُنیا میں دولت اور رُتبہ و منصب اہم ہیں؟

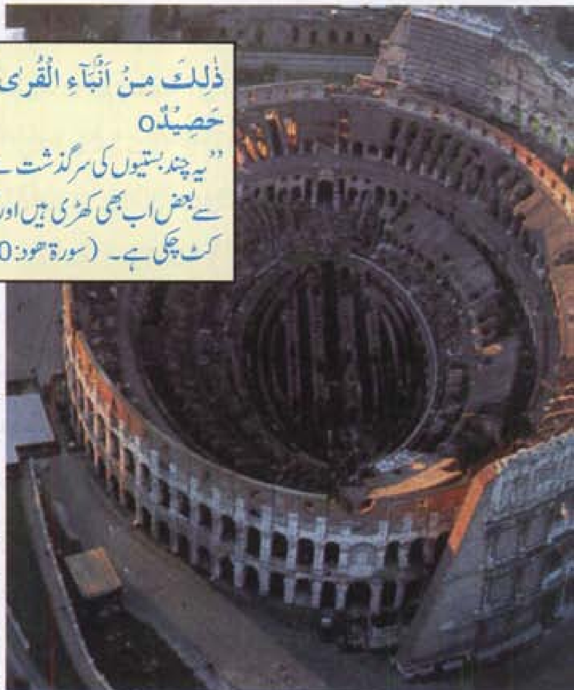
بہت سے لوگوں کا خیال ہے کہ اس دنیا میں نہایت پرسکون زندگی کا حصول ممکن ہے۔ اس ذہنیت کے انسانوں کا دعویٰ ہے کہ دولت کے ذریعے سچی خوشی اور عزت حاصل کی جا سکتی ہے۔



ہنڈراس (Honduras) کی ایک مایائی یادگار کی تصویر (سب سے نیچے) اسی یادگار کی موجودہ حالت، جو کبھی ایک شاندار تہذیب و تمدن کا نشان تھی۔ اس موازنے سے ایک حیرت انگیز حقیقت ظاہر ہوتی ہے۔ اس دنیا میں کوئی بھی شاندار شے تباہی سے محفوظ و مامون نہیں ہے۔







ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْقُرٰى نَقُصُّهٗ عَلَيْكَ مِنْهَا قَآئِمٌ وَّ حَصِيْدٌ○

"یہ چند بستیوں کی سرگذشت ہے جو ہم تمہیں سنا رہے ہیں۔ان میں سے بعض اب بھی کھڑی ہیں اور بعض کی فصل (وقت کی درانتی سے) کٹ چکی ہے۔ (سورۃ ھود:100)

عالیشان قدیم رومی عروس البلاد سے صرف ایک تھیٹر باقی بچا تھا۔ جسے اب بالکل ہی مختلف شکل دے دی گئی ہے۔ (دائیں طرف) اسی تھیٹر کی موجودہ حالت۔ آج وہاں ان کا نام ونشان تک نظر نہیں آتا جو کبھی وہاں بڑی شان وشوکت سے رہتے تھے۔

ان ہی ذہنیت والے لوگوں کے خیال میں ایک بار یہ چین اور اطمینان حاصل کرلیا جائے تو پھر یہ عمر بھر ساتھ رہتا ہے۔مگر یہ نادان نہیں جانتے کہ حقیقت تو اس کے برعکس ہے۔انسان اپنے خالق اور روز حساب کو بھلا کر اپنے خوابوں کی زندگی کبھی حاصل نہیں کرسکتا۔اسلیئے کہ ایک شے حاصل کر لینے کے بعد وہ دوسری چیزوں کی تلاش میں لگ جاتا ہے۔ بہت سی دولت کما لینے کے بعد بھی اطمینان نہیں ملتا تو وہ ایک دوسرے کاروبار کی طرف رُخ کرلیتا ہے۔اس نے ایک بار اپنے ہمسائے کا بے حد خوبصورت اور سجا ہوا مکان دیکھ لیا تھا۔پھر اسے اپنے فلیٹ میں کوئی خوشی محسوس نہ ہوتی تھی یا اسے اپنا مکان اس لئے اب اچھا نہیں لگتا کیونکہ اسے گذشتہ سال کے فیشن کے مطابق سجایا گیا تھا۔ اسی لئے وہ چاہتا ہے کہ اسے از سرِ نو سجائے۔اسی طرح چونکہ فیشن اور انسانی شوق ڈرامائی انداز میں بدل جاتے ہیں' وہ ایک زیادہ خوبصورت کپڑوں کی الماری کی خواہش رکھتا ہے' اسے پہلے سے موجود الماری اب بالکل اچھی نہیں لگتی۔ منکرین خدا کی نفسیات کو درج ذیل سورۃ میں بڑی وضاحت کے ساتھ بیان فرمادیا گیا ہے:

ذَرۡنِیۡ وَمَنۡ خَلَقۡتُ وَحِیۡدًاo وَّ جَعَلۡتُ لَهٗ مَالًا مَّمۡدُوۡدًا o وَّ بَنِیۡنَ شُهُوۡدًاo وَّ مَهَّدۡتُّ لَهٗ تَمۡهِیۡدًاo ثُمَّ یَطۡمَعُ اَنۡ اَزِیۡدَo

''چھوڑ دو مجھے اور اس شخص کو جسے میں نے اکیلا پیدا کیا' بہت سا مال اس کو دیا' اس کے ساتھ حاضر رہنے والے بیٹے دیئے اور اس کیلئے ریاست کی راہ ہموار کی پھر وہ طمع رکھتا ہے کہ میں اسے اور زیادہ دوں''۔ (سورۃ المدثر : 11-15)

ایک ایسا انسان جسے اللہ نے ذہنِ رسا دیا ہے اور واضح سوجھ بوجھ عطا کی ہے' اسے اس بات کا اعتراف کر لینا چاہئے کہ ایسے لوگ جن کے پاس عالیشان محلات ہیں' جن میں کمروں کی تعداد مکینوں کی تعداد سے زیادہ ہے پر تعیش قیمتی کاریں ہیں اور کپڑوں کی بھری ہوئی بڑی بڑی الماریاں ہیں' وہ ان سب میں سے محدود سا حصہ استعمال کرتے ہیں۔ اگر آپ کے پاس دنیا میں سب سے بڑا محل ہو تو کیا آپ ایک ہی وقت میں ہر کمرے کے آرام سے لطف اندوز ہو سکیں گے؟ اور اگر آپ کے پاس فیشن کے مطابق ملبوسات سے بھری ہوئی الماری ہے تو آپ ایک روز میں ان میں سے کتنے سوٹ پہن سکیں گے؟ ایک عالیشان محل کا مالک' جس محل میں درجنوں کمرے ہیں بیک وقت ایک ہی کمرہ استعمال کر سکے گا کیونکہ جگہ اور وقت کے حوالے سے ہر کمرہ ایک علیحدہ اکائی کی شکل میں موجود ہوتا ہے۔ اگر آپ کو بہت سے لذیذ اور مشہور کھانے بیک وقت پیش کر دیئے جائیں تو آپ کا شکم ان میں سے چند ایک کے سوا کچھ قبول نہ کرے گا۔ آپ نے جبراً ٹھونسنے کی کوشش کی تو بجائے لطف اندوز ہونے کے اپنے آپ کو اذیت دیں گے۔

اس فہرست میں مزید اضافہ کیا جا سکتا ہے مگر سب سے زیادہ حیران کن حقیقت یہ ہے کہ انسان کو ایک بہت مختصر سی زندگی دی گئی ہے جس میں دولت سے حاصل کردہ سامان تعیش کو استعمال میں لایا جا سکتا ہے۔ انسان اپنے انجام کی سمت تیزی سے بڑھتا ہے۔ مگر زندگی میں اسے یہ بات بمشکل سمجھ آتی ہے وہ سمجھتا ہے کہ دولت اسے دائمی خوشی و مسرت دے سکتی ہے جیسا کہ اس سورۃ میں ارشاد باری تعالیٰ ہوتا ہے:

یَحۡسَبُ اَنَّ مَالَهٗۤ اَخۡلَدَهٗo

''وہ سمجھتا ہے کہ اس کا مال ہمیشہ اس کے پاس رہے گا'' (سورۃ الھمزۃ : 3)

انسان اپنی دولت کی قوت سے اسقدر اندھا دھند متاثر ہوتا ہے کہ جب اسے یوم حشر اپنا

خوفناک انجام نظر آنے لگتا ہے تو وہ اس وقت بھی اپنی ساری دولت دے کر سزا سے بچنے کی کوشش کرے گا:

يُبَصَّرُوْنَهُمْ ط يَوَدُّ الْمُجْرِمُ لَوْ يَفْتَدِیْ مِنْ عَذَابِ يَوْمِئِذٍ بِبَنِيْهِ ہ وَصَاحِبَتِهٖ وَاَخِيْهِ ہ وَ فَصِيْلَتِهِ الَّتِیْ تُئْوِيْهِ ہ وَمَنْ فِی الْاَرْضِ جَمِيْعًا ثُمَّ يُنْجِيْهِ ہ كَلَّا ط اِنَّهَا لَظٰی ہ

''حالانکہ وہ ایک دوسرے کو دکھائے جائینگے۔ مجرم چاہے گا کہ اس دن کے عذاب سے بچنے کے لئے اپنی اولاد کو، اپنی بیوی کو، اپنے بھائی کو، اپنے قریب ترین خاندان کو جو اسے پناہ دینے والا تھا اور روئے زمین کے سب لوگوں کو فدیئے میں دے دے اور یہ تدبیر اسے نجات دلا دے۔ ہرگز نہیں۔ وہ تو بھڑکتی ہوئی آگ کی لپٹ ہوگی جو گوشت پوست کو چاٹ جائے گی''۔

(سورة المعارج : 11-15)

تاہم کچھ انسان ایسے ہیں جو یہ جانتے ہیں کہ دولت، خوشحالی اور خوش قسمتی اللہ کے قبضۂ قدرت میں ہیں۔ اسی لئے وہ خوب جانتے ہیں کہ عہدہ اور مرتبہ مضحکہ خیز ہیں۔ صرف یہ وہ لوگ ہیں جو یہ بات خوب جانتے ہیں کہ یہ مال و دولت انہیں آخرت کے روز نہیں بچا سکے گی۔ اسی لئے وہ اس دنیا کی قیمتی چیزوں کا تعاقب ہی نہیں کرتے۔ ایسے اچھے انسانوں سے آپ یہ توقع نہیں رکھ سکتے کہ وہ اللہ کی نافرمانی کریں گے۔ یہ لوگ اللہ کے وجود کو کبھی فراموش نہیں کرتے اسی لئے وہ جو کچھ انہیں عطا کرتا ہے اس کا یہ شکر ادا کرتے ہیں۔ اس کے بدلے میں اللہ ان سے عزت واحترام اور آرام دہ زندگی کا وعدہ فرماتا ہے۔ وہ لوگ جو اللہ پر بھروسہ کرتے ہیں اور اس کی بندگی اور غلامی میں زندگی بسر کرتے ہیں جو ان کے نزدیک مقصد حیات ہے، وہ اس حقیقت سے آگاہ ہوتے ہیں کہ دنیاوی چیزیں ان کو ایک محدود اور مختصر سے وقت کیلئے دی گئی ہیں اور یہ کہ ان دنیاوی چیزوں کی ان دائمی اور کثرت سے دی جانے والی دائمی چیزوں کے مقابلے میں کوئی حیثیت نہیں ہے جن کا اللہ نے ان سے وعدہ کر رکھا ہے۔ دولت کی وجہ سے ایسے لوگ اس دنیا کی زندگی کے ساتھ کبھی گہری وابستگی کا مظاہرہ نہیں کرتے۔ اس کے برعکس یہ تو انہیں اللہ کا زیادہ شکرگزار بناتی ہیں اور وہ اس کے زیادہ قریب آجاتے ہیں۔

وہ ہر ایک کے ساتھ ہر معاملے میں عدل کرتے ہیں اور جو کچھ اللہ نے ان کو عطا کر رکھا ہے

کوشش کرتے ہیں کہ اس سے اپنے اللہ کو خوش اور راضی رکھ سکیں۔ بجائے اس دنیا میں دولت سے لطف اندوز ہونے کے ان کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ ایسی قرآنی اقدار حاصل کرلیں جن کی ان سے توقع کی جاتی ہے۔ وہ اس حقیقت سے پوری طرح باخبر ہوتے ہیں کہ ان کا اصل مقام و مرتبہ اور تعریف یہ ہوگی کہ انہیں اللہ کا قرب حاصل ہو۔ پیغمبر خدا حضرت سلیمانؑ نے ایسی صفات کا مظاہرہ کر کے بطور ایک قابل احترام مومن کے تمام انسانوں کیلئے ایک مثال قائم کی۔ ان کے پاس دولت اور اختیارات اعلیٰ کی کمی نہ تھی مگر پھر بھی انہوں نے اس بات کا صاف صاف اظہار فرمادیا کہ انہوں نے اس دولت کے حصول کی کوشش کیوں کی تھی:

فَقَالَ اِنِّیٓ اَحْبَبْتُ حُبَّ الْخَیْرِ عَنْ ذِکْرِ رَبِّیْ ج

''میں نے اس مال کی محبت اپنے ربّ کی یاد کی وجہ سے اختیار کی ہے'' (سورۃ صٓ:32)

جب لوگ یہ سمجھ نہیں پاتے کہ دنیاوی چیزوں کو اس دنیا میں کیوں تخلیق کیا گیا ہے تو وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ وہ مال و اسباب کو صرف ساٹھ ستر برس کے عرصے تک استعمال کریں گے۔ وہ بھی اس صورت میں جب انہیں اتنے برس تک زندہ رہنے کا موقعہ ملا۔ اور پھر اپنے محلات' کاریں' اولاد اپنے پیچھے اس دنیا میں چھوڑ جائیں گے۔ انہوں نے یہ کبھی نہیں سوچا کہ ان کو اپنی اپنی قبر میں تنہا دفن کیا جائے گا۔ وہ عمر بھر اس امارت و دولت مندی کی خواہش کرتے ہیں جس سے کبھی لطف اندوز نہیں ہو سکتے۔

تاہم وہ جو دولت دنیا کو مسیحا سمجھتے ہیں اور اپنے خالق کی طرف سے غفلت برتتے ہیں انہیں اس دنیا میں اور آخرت میں بڑے تلخ اور تکلیف دہ رنج و غم کا سامنا کرنا پڑتا ہے:

اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا لَنْ تُغْنِیَ عَنْھُمْ اَمْوَالُھُمْ وَلَآ اَوْلَادُھُمْ مِّنَ اللّٰہِ شَیْئًا ط وَ اُولٰٓئِکَ ھُمْ وَقُوْدُ النَّارِ o

''جن لوگوں نے کفر کا رویہ اختیار کیا ہے انہیں اللہ کے مقابلے میں نہ ان کا مال کچھ کام دے گا نہ اولاد۔ وہ دوزخ کا ایندھن بن کر رہیں گے''۔ (سورۃ آلِ عمران : 10)

وہ لوگ جو دنیاوی مال و اسباب کے لئے لالچ کا مظاہرہ کرتے ہیں قرآن ان کے انجام کی منادی اس طرح کرتا ہے:

اَلَّذِیْ جَمَعَ مَالًا وَّ عَدَّدَہٗ o یَحْسَبُ اَنَّ مَالَہٗٓ اَخْلَدَہٗ o کَلَّا لَیُنْۢبَذَنَّ

فِی الْحُطَمَةِ o وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الْحُطَمَةُ o نَارُ اللّٰهِ الْمُوْقَدَةُ o الَّتِیْ تَطَّلِعُ عَلَی الْاَفْـِٕدَةِ o اِنَّهَا عَلَیْهِمْ مُّؤْصَدَةٌ o فِیْ عَمَدٍ مُّمَدَّدَةٍ o

''جس نے مال جمع کیا اور اسے گن گن کر رکھا۔ وہ سمجھتا ہے کہ اسکا مال ہمیشہ اس کے پاس رہے گا۔ ہرگز نہیں وہ شخص تو چکنا چور کر دینے والی جگہ میں پھینک دیا جائے گا اور تم کیا جانو کہ کیا ہے وہ چکنا چور کر دینے والی وہ جگہ؟ اللہ کی آگ خوب بھڑکائی ہوئی' جو دلوں تک پہنچے گی۔ وہ ان پر ڈھانک کر بند کر دی جائے گی (اس حالت میں کہ وہ) اونچے اونچے ستونوں میں (گھرے ہوئے ہوں گے)''۔ (سورۃ الھمزۃ : 2-9)

حقیقی دولت تو ان مومنین کی ہے جو اس دنیا کے مال واسباب کے لئے اندرونی دلچسپی ظاہر نہیں کرتے اور اس بات پر یقین کامل رکھتے ہیں کہ صرف اللہ ہی انسان کو ہر شے عطا کرتا ہے۔ یہ واقعی وہ لوگ ہیں جو صحیح معنوں میں اس دنیا میں متمول ہوتے ہیں۔ یہ اپنی زندگیوں کو صرف پچاس ساٹھ میں محدود نہیں کرتے۔ مومنین وہ بہترین تجارت کرتے ہیں جس میں اس زندگی کے بدلے میں انہیں جنت حاصل ہو جاتی ہے۔ وہ عارضی دولت پر مستقل دولت کو ترجیح دیتے ہیں۔ اللہ اس بارے میں درج ذیل سورۃ میں یوں مطلع فرماتے ہیں:

اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَنْفُسَهُمْ وَ اَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ ط یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ فَیَقْتُلُوْنَ وَ یُقْتَلُوْنَ تف وَعْدًا عَلَیْهِ حَقًّا فِی التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِیْلِ وَالْقُرْاٰنِ ط وَمَنْ اَوْفٰی بِعَهْدِهٖ مِنَ اللّٰهِ فَاسْتَبْشِرُوْا بِبَیْعِكُمُ الَّذِیْ بَایَعْتُمْ بِهٖ ط وَ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ o

''حقیقت یہ ہے کہ اللہ نے مومنوں سے ان کے نفس اور ان کے مال جنت کے بدلے خرید لئے ہیں۔ وہ اللہ کی راہ میں لڑتے اور مارتے مرتے ہیں ان سے (جنت کا وعدہ) اللہ کے ذمے ایک پختہ وعدہ ہے۔ توراۃ' انجیل اور قرآن میں۔ اور کون ہے جو اللہ سے بڑھ کر اپنے عہد کا پورا کرنے والا ہو؟ پس خوشیاں مناؤ اپنے اس سودے پر جو تم نے خدا سے چکا لیا ہے۔ یہی سب سے بڑی کامیابی ہے''۔ (سورۃ التوبہ : 111)

ان حقائق کو نظر انداز کرتے ہوئے جو لوگ اس دنیا سے چمٹے بیٹھے ہیں ان پر جلد یہ بات واضح ہو جائے گی کہ صراط مستقیم پر کون تھے۔

شادی

شادی ہر انسان کی زندگی میں ایک اہم موڑ ہوتا ہے۔ ہر نوجوان لڑکا اور لڑکی اپنے خوابوں کے ہمسفر سے ملنے کے آرزومند اور منتظر رہتے ہیں۔ اچھے ہمسفر کا مل جانا زندگی کی بڑی کامیابی تصور ہوتی ہے اور نوجوان ایسے ہمسفر کی تلاش میں ''دیوانے'' ہوئے پھرتے ہیں۔ تاہم ان لاعلم معاشروں میں، جہاں لوگ قرآنی طرز زندگی کو قبول نہیں کرتے، مرد اور عورت کے درمیان تعلقات کی بنیاد بڑی غیر مستحکم اور کمزور ہوتی ہے: ''دوستیاں (مرد و زن کے درمیان) ایسے رومانوی تعلقات کی بنیاد پر استوار ہوتی ہیں جن میں دونوں جذباتی تسکین کے خواہاں ہوتے ہیں مگر شادیاں عموماً باہمی مادی فوائد کی بنیاد پر ہوتی ہیں۔ بہت سی خواتین ایسے متمول مردوں کی تلاش میں رہتی ہیں جہاں ان کو اعلیٰ معیار زندگی ملنے کی توقع ہو۔ اس مقصد کیلئے ایک عورت عمر بھر کیلئے اس مرد کی بیوی بننے کیلئے بھی تیار ہو جاتی ہے جس سے اس کو کوئی محبت نہیں ہوتی۔ دوسری طرف مرد جس عورت کو اپنی بیوی بنانا چاہتا ہے وہ اسے اکثر ''خوبصورت'' ہونے کی بنا پر قبول کر لیتا ہے۔

چنانچہ ایک لاعلم معاشرے کے نقطہ نظر کے پیچھے جو دلیل ہوتی ہے وہ ایک اہم حقیقت سے غفلت برت رہی ہوتی ہے۔ یہ تمام مادی اقدار بالآخر تباہ ہو جاتی ہیں۔ اللہ چاہے تو ایک ساعت کے اندر اندر انسان کی ساری خوش نصیبی کو بدنصیبی میں تبدیل کر سکتا ہے، اسی طرح حسن و جمال کے ضائع ہونے میں چند سیکنڈ لگتے ہیں۔

مثال کے طور پر شہر میں مقیم ہونے کے حوالے سے ہم روزانہ کام پر آتے جاتے ہیں اس دوران ہمیں کسی وقت بھی کوئی حادثہ پیش آ سکتا ہے جس سے ہمارے خوبصورت چہرے پر زخموں کے ڈراؤنے اور انمٹ نشان رہ جاتے ہیں۔ وقت کے گزرنے کے ساتھ ساتھ ہماری صحت، قوت اور خوبصورتی کو نقصان پہنچتا ہے۔ اس قسم کے ناگہانی حالات میں ایک ایسے نظام سے کیا توقعات رکھی جا سکتی ہیں جس میں خالصتاً مادی اقدار کا سکہ چلتا ہو؟ مثال کے طور پر ایک ایسے انسان کے بارے میں تصور کریں جو کسی عورت سے اس کے حسن و جمال پر فریفتہ ہو کر شادی کرتا ہے۔ اس عورت کا چہرہ کسی حادثے میں بری طرح زخمی ہو جائے تو وہ شخص کیا سوچے گا؟ جب اس خاتون کے چہرے پر بڑھاپے کی جھریاں آ جائینگی تو کیا وہ اسے چھوڑ دے گا؟ بیشک مادہ پرستانہ سوچ کے

غیر معقول جوابات ہی ملیں گے۔

ایک ایسی شادی زیادہ قیمتی بن جاتی ہے جب اللہ کی خوشنودی کی خاطر اس کا ارادہ کیا جاتا ہے۔ بصورت دیگر یہ اس دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی ایک بوجھ بن جائے گا۔ اگر اس دنیا میں نہیں تو انسان آخرت میں یہ بات ضرور سمجھ جاتا ہے کہ یہ انسانی روح کیلئے ایک ناموزوں راستہ ہے۔ مگر اس وقت بہت دیر ہو چکی ہوگی۔ حشر کے روز یہ شخص اس عورت کو' جو دنیا میں اس کی بیوی تھی' اپنی نجات کیلئے تاوان کے طور پر دینے پر تیار ہوگا۔ اس روز کا خوف اس دنیا کے تمام رشتوں کو بے معنی بنا دے گا۔ خاندان کے قریبی افراد کے درمیان موجود رشتوں کے بارے میں' قیامت کے روز کے حوالے سے اللہ درج ذیل سورۃ میں بڑی تفصیل کے ساتھ ارشاد فرماتے ہیں:

يُبَصَّرُوْنَهُمْ ط يَوَدُّ الْمُجْرِمُ لَوْ يَفْتَدِىْ مِنْ عَذَابِ يَوْمِئِذٍۢ بِبَنِيْهِ ٥ وَصَاحِبَتِهٖ وَاَخِيْهِ ٥ وَ فَصِيْلَتِهِ الَّتِىْ تُئْوِيْهِ ٥

''حالانکہ وہ ایک دوسرے کو دکھائے جائینگے۔ مجرم چاہے گا کہ اس دن کے عذاب سے بچنے کیلئے اپنی اولاد کو' اپنی بیوی کو' اپنے بھائی کو' اپنے قریب ترین خاندان کو جو اسے پناہ دینے والا تھا فدیے میں دے دے''۔ (سورۃ المعارج : 11-13)

ان آیات سے پتہ چلتا ہے کہ لوگ یوم حساب عورتوں' دوستوں' بھائیوں یا بہنوں کو کوئی اہمیت نہیں دینگے۔ اپنے آپ کو بچانے کی ناکام کوشش میں ہر انسان اپنے خاندان کے قریبی افراد کو اور رشتہ داروں کو تاوان کے طور پر دے دینے کیلئے رضامند ہوگا۔ مزید یہ کہ یہ لوگ ایک دوسرے کو لعن طعن بھی کرینگے کہ انہوں نے اس بھیانک انجام سے متعلق ایک دوسرے کو کبھی متنبہ نہ کیا۔ قرآن حکیم میں ابولہب اور اس کی بیوی کا معاملہ بیان فرمایا گیا ہے' جو دائمی سزا کے مستحق تھے:

تَبَّتْ يَدَآ اَبِىْ لَهَبٍ وَّتَبَّ ٥ مَآ اَغْنٰى عَنْهُ مَالُهٗ وَمَا كَسَبَ ٥ سَيَصْلٰى نَارًا ذَاتَ لَهَبٍ ٥ وَّامْرَاَتُهٗ ط حَمَّالَةَ الْحَطَبِ ٥ فِىْ جِيْدِهَا حَبْلٌ مِّنْ مَّسَدٍ ٥

''ٹوٹ گئے ابولہب کے ہاتھ اور نامراد ہو گیا وہ۔ اس کا مال اور جو کچھ اس نے کمایا وہ اس کے کسی کام نہ آیا۔ ضرور وہ شعلہ زن آگ میں ڈالا جائے گا اور (اس کے ساتھ) اس کی جورو بھی۔ لگائی بجھائی کرنے والی' اس کی گردن میں مونجھ کی رسی ہوگی''۔ (سورۃ اللھب : 1-5)

شادی کی وہ قسم جو اللہ کی موجودگی میں قابل قبول ہو بالکل ہی مختلف معیار پر کی جاتی ہے

ایک لاعلم معاشرے میں جس قسم کی شادیاں ہوتی ہیں ان کے برعکس، جہاں لوگ اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کی کوشش میں ہوتے ہیں، معیار دولت، شہرت یا خوبصورتی نہیں ہوتی بلکہ شادی کرنے کا ارادہ اللہ کی خوشنودی کے حصول کی خاطر کیا جاتا ہے۔ مومنوں کیلئے واحد معیار تقویٰ ہے۔ دوسرے لفظوں میں جس کی ممانعت ہے اس سب سے پرہیز اور اس سب کی تکمیل جس کا حکم ہے اور اللہ کا خوف۔ اس کے نتیجے میں ایک مومن صرف اس عورت سے شادی کر سکتا ہے جو اللہ کی اطاعت و فرمانبرداری کا مظاہرہ کرتی ہو اور یہی بات ایک عورت پر صادق آتی ہے جس نے کسی مرد سے شادی کا فیصلہ کیا ہو لوگ اس قسم کی شادی میں اطمینان اور خوشی پاتے ہیں۔ ایک قرآنی آیت میں اس معاملے کا ذکر اس طرح فرمایا گیا ہے:

وَ مِنْ اٰیٰتِہٖٓ اَنْ خَلَقَ لَکُمْ مِّنْ اَنْفُسِکُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْکُنُوْٓا اِلَیْھَا وَ جَعَلَ بَیْنَکُمْ مَّوَدَّۃً وَّ رَحْمَۃً ط اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّتَفَکَّرُوْنَ o

''اور اس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ اس نے تمہارے لئے تمہاری ہی جنس سے بیویاں بنائیں تاکہ تم ان کے پاس سکون حاصل کرو۔ اور تمہارے درمیان محبت اور رحمت پیدا کر دی۔ یقیناً اس میں بہت سی نشانیاں ہیں ان لوگوں کیلئے جو غور و فکر کرتے ہیں''۔ (سورۃ الروم : 21)

جب تقویٰ ازدواجی بندھن کی بنیاد ٹھہرے تو پھر مومنوں کو آخرت میں یقیناً ایک خوشگوار زندگی سے ہمکنار کیا جائے گا۔ یہ لوگ عمر بھر ایک دوسرے کو نیکی اور بھلائی کی تلقین کرتے رہتے ہیں اور جنت کی طرف ایک دوسرے کی رہنمائی بھی کرتے ہیں۔ یہ لوگ دائمی دوستی کے رشتے میں بھی منسلک ہو جاتے ہیں۔ ان کے تعلقات کا ذکر درج ذیل سورۃ میں اس طرح فرمایا گیا ہے:

وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بَعْضُھُمْ اَوْلِیَآءُ بَعْضٍ یَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ یَنْھَوْنَ عَنِ الْمُنْکَرِ وَ یُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوۃَ وَ یُؤْتُوْنَ الزَّکٰوۃَ وَ یُطِیْعُوْنَ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ ط اُولٰٓئِکَ سَیَرْحَمُھُمُ اللّٰہُ ط اِنَّ اللّٰہَ عَزِیْزٌ حَکِیْمٌ o

''مومن مرد اور عورتیں، یہ سب ایک دوسرے کے رفیق ہیں۔ بھلائی کا حکم دیتے اور برائی سے روکتے ہیں، نماز قائم کرتے ہیں، زکوٰۃ دیتے ہیں اور اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت کرتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جن پر اللہ کی رحمت نازل ہو کر رہے گی۔ یقیناً اللہ سب پر غالب اور حکیم و دانا ہے''۔ (سورۃ التوبہ : 71)

اولاد

انسانوں کی یہ بہت بڑی آرزو ہوتی ہے کہ ان کے مرنے پر پیچھے ان کے بیٹے رہ جائیں جو مستقبل میں خاندان کا نام زندہ رکھ سکیں گے۔ تاہم اگر اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کی کوشش نہ کی جائے تو پھر یہ آرزو انسان کو اللہ کے راستے میں اُتار دیتی ہے۔ انسان کی آزمائش اولاد سے کی جاتی ہے: اس کا مطلب یہ ہوا کہ انسان سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ اللہ کی خوشنودی حاصل کرے گا۔

اِنَّمَآ اَمْوَالُکُمْ وَ اَوْلَادُکُمْ فِتْنَۃٌ ط وَاللّٰہُ عِنْدَہٗٓ اَجْرٌ عَظِیْمٌ o

''تمہارے مال اور تمہاری اولاد تو ایک آزمائش ہیں اور اللہ ہی ہے جس کے پاس بڑا اجر ہے''۔ (سورۃ التغابن : 15)

اس آیت میں لفظ ''آزمائش'' بڑا اہم ہے۔ بہت سے لوگوں کے لئے اولاد کا ہونا زندگی کے ایک بہت بڑے مقصد کا پورا ہونا ہے۔ مگر قرآنی حوالے سے ایک مومن اولاد کی خواہش محض اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کیلئے کرتا ہے۔ وگرنہ صرف اپنی اس آرزو کی تسکین کیلئے کہ ایک بچہ ہو اور بچہ پیدا ہو جائے تو اس کا مطلب اللہ کے ساتھ دوسروں کو شریک ٹھہرانا ہوگا۔ وہ لوگ جو اصل مقصد بھلا بیٹھتے ہیں اور اولاد کو زندگی کا حتمی مقصد ٹھہراتے ہیں ان کی مثال قرآن پاک میں اس طرح پیش کی گئی ہے:

ھُوَ الَّذِیْ خَلَقَکُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَۃٍ وَّجَعَلَ مِنْھَا زَوْجَھَا لِیَسْکُنَ اِلَیْھَا ج فَلَمَّا تَغَشّٰھَا حَمَلَتْ حَمْلًا خَفِیْفًا فَمَرَّتْ بِہٖ ج فَلَمَّآ اَثْقَلَتْ دَّعَوَا اللّٰہَ رَبَّھُمَا لَئِنْ اٰتَیْتَنَا صَالِحًا لَّنَکُوْنَنَّ مِنَ الشّٰکِرِیْنَ o فَلَمَّآ اٰتٰھُمَا صَالِحًا جَعَلَا لَہٗ شُرَکَآءَ فِیْمَآ اٰتٰھُمَا ج فَتَعٰلَی اللّٰہُ عَمَّا یُشْرِکُوْنَ o اَیُشْرِکُوْنَ مَا لَا یَخْلُقُ شَیْئًا وَّ ھُمْ یُخْلَقُوْنَ o

''وہ اللہ ہی ہے جس نے تمہیں ایک جان سے پیدا کیا اور اسی کی جنس سے اس کا جوڑا بنایا تاکہ اس کے پاس سکون حاصل کرے۔ پھر جب مرد نے عورت کو ڈھانک لیا تو اسے ایک خفیف سا حمل رہ گیا جسے لئے وہ چلتی پھرتی رہی پھر جب وہ بوجھل ہوگئی تو دونوں نے مل کر اپنے ربّ سے دُعا کی کہ اگر تو نے ہم کو اچھا سا بچہ دیا تو ہم تیرے شکر گزار ہوں گے۔ مگر جب اللہ نے ان کو ایک صحیح وسالم بچہ دے دیا تو وہ اس کی بخشش وعنایت میں دوسروں کو اس کا شریک ٹھہرانے لگے۔

اللہ بہت بلند و برتر ہے ان مشرکانہ باتوں سے جو یہ لوگ کرتے ہیں۔ کیسے نادان ہیں یہ لوگ کہ ان کو خدا کا شریک ٹھہراتے ہیں جو کسی چیز کو پیدا نہیں کرتے بلکہ خود پیدا کئے جاتے ہیں"۔

(سورۃ الاعراف : 189-191)

مومن اللہ سے اولاد صرف اس کی خوشنودی کیلئے طلب کرتے ہیں۔ قرآن پاک میں کچھ ایسے پیغمبروں کا ذکر ہے جنہوں نے اللہ سے اس کی خوشنودی کیلئے اولاد طلب کی تھی۔ ان میں سے ایک مثال حضرت عمرانؑ کی بیوی کی ہے:

اِذْ قَالَتِ امْرَاَتُ عِمْرٰنَ رَبِّ اِنِّیْ نَذَرْتُ لَکَ مَا فِیْ بَطْنِیْ مُحَرَّرًا فَتَقَبَّلْ مِنِّیْ ج اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ o

"جو میرے پیٹ میں ہے تیری نذر کرتی ہوں۔ وہ تیرے ہی کام کیلئے وقف ہوگا میری اس پیشکش کو قبول فرما۔ تو سننے اور جاننے والا ہے"۔ (سورۃ آل عمران : 35)

پیغمبر خدا حضرت ابراہیمؑ کی دُعا بھی مومنوں کیلئے ایک مثال پیش کرتی ہے:

رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَیْنِ لَکَ وَ مِنْ ذُرِّیَّتِنَآ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّکَ ص وَاَرِنَا مَنَاسِکَنَا وَتُبْ عَلَیْنَا ج اِنَّکَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ o

"اے ربّ ہم دونوں کو اپنا مسلم (مطیع فرمان) بنا، ہماری نسل سے ایک ایسی قوم اُٹھا جو تیری مسلم ہو، ہمیں عبادت کے طریقے بتا اور ہماری کوتاہیوں سے درگزر فرما۔ تو بڑا معاف کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے"۔ (سورۃ البقرۃ : 128)

اس آیت کے مطابق اولاد کی خواہش اگر اللہ کی اطاعت و فرمانبرداری کی طلب کی خاطر ہو تو یہ اللہ کی عبادت کی ایک شکل بن جاتی ہے۔ تاہم اگر اللہ کی مہربانی اور اس کا کرم حاصل کرنے کے علاوہ کوئی ارادہ ہو تو انسان کو اس دنیا میں اور آخرت میں اس کے سنگین نتائج بھگتنا ہوتے ہیں۔ مومنوں کے نزدیک اولاد انہیں اللہ کی طرف سے عطا کی جاتی ہے۔ اس لئے بچوں کی پیدائش پر وہ اسے کوئی ذاتی تفاخر کی بات نہیں سمجھتے۔ نہ اسے وہ اپنی کامیابی سمجھتے ہیں، نہ ذہانت و عقلمندی کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ اللہ نے یہ صفات بچے کو ودیعت کی ہیں۔ ایسا غرور و تکبر اللہ کے راستے سے بھٹک جانے کے مترادف ہوتا ہے۔

اس طرح کی سوچ کے آخرت میں بڑے مہلک اور ضرر رساں نتائج نکلتے ہیں۔ یوم حساب

انسان اپنے بیٹے' بیوی اور خاندان کے قریبی عزیزوں کو اپنی دائمی نجات کیلئے بطور تاوان دینے پر رضامند ہوگا۔ خوفناک سزا سے بچنے کیلئے انسان فوری طور پر اپنے پیاروں کو بھی چھوڑ دینے پر تیار ہوجاتا ہے۔ مگر حشر کے دن دائمی سزا سے بچنے کی خاطر اس قسم کے کام بھی کوئی امید نہ دلا سکیں گے۔

نہ صرف آخرت میں بلکہ اس دنیا میں بھی ایک لاعلم معاشرے کے لوگوں کیلئے اولاد بہت سے مسائل کا باعث بن جاتی ہے۔ پیدائش سے ہی بچے کی پرورش والدین کیلئے ذمہ داریوں کا ایک بھاری بوجھ بن جاتی ہے۔ خاص طور پر ایک حاملہ ماں کیلئے یہ ایک بڑا مشکل تجربہ ہوتا ہے۔ سب سے پہلے تو یہ خبر ملتے ہی کہ وہ ایک بچے کی ماں بننے والی ہے اسے اپنا طرزِ زندگی بالکل تبدیل کرنا ہوتا ہے۔ اسے اپنی ترجیحات کا از سرِ نو تعین کرنا ہوتا ہے۔ اس حوالے سے اسے اس متوقع بچے کی ضروریات کا سب سے زیادہ خیال رکھنا ہوتا ہے جو ابھی رحم مادر میں ہوتا ہے۔ اس کی کھانے پینے کی عادات' سونے کا طریقہ مختصر یہ کہ اس کی ذاتی زندگی مکمل طور پر تبدیل ہو جاتی ہے۔ حمل کی مدت کے اختتام پر ماں کیلئے روزمرہ کا کام کرنا اور معمولی سا جسم کو حرکت دینا بھی مشکل ہو جاتا ہے۔ مگر بڑی مشکلات کا آغاز بچے کی پیدائش کے بعد ہوتا ہے۔ ماں اپنا سارا وقت بچے کی نگہداشت میں خرچ کرتی ہے۔ بچے کی طرف سے ماں کو اپنی ذاتی ضرورتوں اور کام کیلئے بہت کم وقت ملتا ہے۔ چنانچہ ماں اس وقت کے انتظار میں رہتی ہے جب بچہ اپنی ضروریات کا خیال رکھنے کے قابل ہو جائے گا۔ اس اثناء میں ماں کو پتہ ہی نہیں چلتا کہ برسوں پر مشتمل وقت کسقدر تیزی سے گزر گیا۔ اگر ایسا اللہ کی خوشنودی کیلئے کیا گیا ہو تو یہ طویل وقت بھی عبادت کی ایک شکل بن جاتا ہے۔ مگر ایک ایک لاعلم معاشرے کے لوگوں کیلئے یہ سال سوائے بیکاری پریشانی اور تکلیف کے اور کچھ بھی نہیں ہوتے۔

ایک لاعلم معاشرے میں والدین عموماً اس وقت مایوسی کا شکار ہو جاتے ہیں جب وہ اپنے کنبے میں اضافہ کرتے ہیں' ان کے ہاں پیدا ہونے والا بچہ خودغرض اور مطلب پرست شخصیت کا حاصل ہوتا ہے۔ اپنی خودغرضانہ غلط رہنمائی اور مطلب پرستانہ مقاصد کی وجہ سے وہ والدین کی ضرورتوں میں صرف اس وقت دلچسپی ظاہر کرتا ہے جب اس میں اسکا کوئی مفاد ہو۔ اس کے والدین جو اب بوڑھے چکے ہیں' ضعیف العمری کے مسائل سے دوچار ہوتے ہیں۔ انہیں اس حقیقت کا زندگی میں بہت دیر سے احساس ہوتا ہے۔ تاہم والدین بننے کے ابتدائی دور میں وہ یہ

خیال کرتے ہیں کہ جب ان کے بچے بڑے ہو جائیں گے تو مشکل وقت میں ان کی مدد کریں گے مگر اس توقع کے برعکس وہ اپنے آپ کو ایسے موقعوں پر بوڑھوں کیلئے بنائے گئے فلاحی گھروں میں پاتے ہیں۔

اللہ نے قرآن حکیم میں ایک ایسا نظام پیش کیا ہے جس کے مطابق مومنوں کی اولاد اپنے والدین کا بہت خیال رکھتی ہے۔ اللہ چاہتا ہے کہ بچے اپنے والدین کی عزت کریں اور ان سے رحمدلی سے پیش آئیں خصوصاً جب وہ بوڑھے ہو جائیں:

وَقَضٰی رَبُّکَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِیَّاہُ وَ بِالْوَالِدَیْنِ اِحْسَانًا ط اِمَّا یَبْلُغَنَّ عِنْدَکَ الْکِبَرَ اَحَدُھُمَآ اَوْ کِلٰھُمَا فَلَا تَقُلْ لَّھُمَآ اُفٍّ وَّلَا تَنْھَرْھُمَا وَ قُلْ لَّھُمَا قَوْلًا کَرِیْمًا o وَ اخْفِضْ لَھُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَۃِ وَ قُلْ رَّبِّ ارْحَمْھُمَا کَمَا رَبَّیٰنِیْ صَغِیْرًا o

”تیرے ربّ نے فیصلہ کر دیا ہے کہ تم لوگ کسی کی عبادت نہ کرو مگر صرف اس کی۔ والدین کے ساتھ نیک سلوک کرو۔ اگر تمہارے پاس ان میں سے کوئی ایک یا دونوں بوڑھے ہو کر رہیں تو انہیں اُف تک نہ کہو نہ انہیں جھڑک کر جواب دو بلکہ ان سے احترام کے ساتھ بات کرو اور نرمی اور رحم کے ساتھ ان کے سامنے جھک کر رہو اور دُعا کیا کرو کہ پروردگار ان پر رحم فرما جس طرح انہوں نے رحمت و شفقت کے ساتھ مجھے بچپن میں پالا تھا“ (سورۃ بنی اسرائیل : 23-24)

جیسا کہ ہمیں ان آیات سے پتہ چلتا ہے قرآنی اقدار کی روشنی میں مومنوں کیلئے بچوں کو پرورش ایک قابل اعزاز بات ہے۔ تاہم ایک لاعلم معاشرے میں اگر منکرین خدا بچوں کو اس کے برعکس ذہنیت کا مالک بنا دیتے ہیں تو پھر یہ اس دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی ایک سعیِ لاحاصل ہو گی۔ مومن اس وقت بھی اللہ کی خوشنودی حاصل کر لیتے ہیں جب ان کا بچہ اس قرآنی تعلیم پر عمل نہیں کرتا جو اسے دی گئی تھی۔ والدین کا صرف اتنا فرض بنتا ہے کہ اپنے بچوں کو قرآنی تعلیم دے دیں اور پھر نتیجہ اللہ پر چھوڑ دیں۔ اللہ کے سوا لوگوں کا کوئی محافظ و مددگار نہیں ہے۔

وہ والدین جو اپنے بچوں سے دنیاوی فوائد حاصل کرنے کے متمنی ہوتے ہیں ان کو اولاد سے نہ اس دنیا میں کوئی مدد ملتی ہے نہ آخرت میں۔

لِکُلِّ امْرِیءٍ مِّنْھُمْ یَوْمَئِذٍ شَاْنٌ یُّغْنِیْہِ o

''اُن میں سے ہر شخص پر اس روز ایسا وقت آ پڑے گا کہ اسے اپنے سوا کسی کا ہوش نہ ہوگا''
(سورۃ عبس : 37)

جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ انسان کو اپنے خالق کی اطاعت کیلئے پیدا کیا گیا ہے زندگی بھر اس کے اِردگرد کی ہر شے سے اس کی آزمائش کی جاتی ہے۔ موت کے بعد انسان کا اس کے کاموں کی بنیاد پر حساب لیا جائے گا۔ پھر اسے یا تو انعام میں جنت دی جائے گی یا سزا کے طور پر دوزخ۔ مختصر یہ کہ حسن وخوبصورتی اور اولاد تقویٰ کے مقابلے میں کوئی حقیقت نہیں رکھتے۔ ''اللہ کا خوف'' اصل اہمیت اور قدر و قیمت رکھتا ہے۔

وَمَآ اَمْوَالُكُمْ وَلَآ اَوْلَادُكُمْ بِالَّتِیْ تُقَرِّبُكُمْ عِنْدَنَا زُلْفٰۤی اِلَّا مَنْ اٰمَنَ وَ عَمِلَ صَالِحًا ز فَاُولٰٓئِكَ لَهُمْ جَزَآءُ الضِّعْفِ بِمَا عَمِلُوْا وَهُمْ فِی الْغُرُفٰتِ اٰمِنُوْنَ ○

''یہ تمہاری دولت اور تمہاری اولاد نہیں ہے جو تمہیں ہم سے قریب کرتی ہو۔ ہاں مگر جو ایمان لائے اور نیک عمل کرے یہی لوگ ہیں جن کیلئے عمل کی دہری جزا ہے اور وہ بلند و بالا عمارتوں میں اطمینان سے رہیں گے''۔ (سورۃ سبا : 37)

اِنَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا لَنْ تُغْنِیَ عَنْهُمْ اَمْوَالُهُمْ وَ لَآ اَوْلَادُهُمْ مِّنَ اللّٰهِ شَیْئًا ط وَ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ج هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ ○

''وہ لوگ جنہوں نے کفر کا رویہ اختیار کیا تو اللہ کے مقابلے میں ان کو ان کا مال کچھ کام دے گا نہ اولاد وہ تو آگ میں جانے والے لوگ ہیں اور آگ ہی میں ہمیشہ رہیں گے''۔

(سورۃ آل عمران : 116)

فَلَهُمْ عَذَابٌ مُّهِیْنٌ ○ لَنْ تُغْنِیَ عَنْهُمْ اَمْوَالُهُمْ وَلَآ اَوْلَادُهُمْ مِّنَ اللّٰهِ شَیْئًا ط اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ط هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ ○

''اس پر ان کیلئے ذلت کا عذاب ہے۔ اللہ سے بچانے کیلئے نہ اُن کے مال کچھ کام آئیں گے نہ ان کی اولاد۔ وہ دوزخ کے یار ہیں اُسی میں وہ ہمیشہ رہیں گے''۔

(سورۃ المجادلۃ : 17-16)

قدرتی خطرات و آفات

یہ دنیا سب کچھ ہے مگر پرسکون نہیں ہے۔ ہم سب دونوں طرح کے اندرونی اور بیرونی قدرتی خطرات کی زد میں رہتے ہیں۔ شہاب ثاقب اور سیارچے بھی کسی حد تک خلاء سے اس دنیا کے لئے خطرات کا باعث بنتے ہیں۔ جہاں تک اس کرۂ ارض کا تعلق ہے اس سیارے کا اندرونی مرکزی حصہ پگھلے ہوئے مادوں سے بنا ہے۔ زمین کا یہ حصہ جو ہماری نظروں سے اوجھل رہتا ہے اسے ''شعلہ خیز مرکزی حصہ'' کہنا مبالغہ نہ ہوگا۔ ایک ایسی فضا بھی ہے جو زمین کے گرد موجود ہے جسے بیرونی خطرات کے مقابلے میں ایک ''ڈھال'' کہنا درست ہوگا۔ تاہم اس زمین کا کوئی حصہ بھی ایسا نہیں ہے جو فضائی قوتوں مثلاً طوفان باراں اور طوفانِ گرد سے محفوظ ہو۔

قدرتی خطرات و آفات کسی وقت بھی حملہ آور ہو سکتے ہیں۔ ان سے جان و مال کو بہت نقصان پہنچ سکتا ہے۔ عموماً انہیں ''قدرتی آفات'' کہا جاتا ہے جن میں زلزلے' آسمانی بجلی کا گرنا' بارشی سیلاب اور جنگل کی آگ' تیزابی بارشیں اور سمندری طوفانی لہریں شامل ہیں۔ جن کی شدت اور اثرات مختلف ہوتے ہیں ان تمام آفات میں ایک شے مشترک ہے کہ یہ سب کے سب چند لمحوں میں پورے شہر کو آبادی سمیت کھنڈر میں بدل دیتی ہے اور جو بات سب سے اہم ہے وہ یہ ہے کہ کسی انسان میں اتنی قوت نہیں ہوتی کہ وہ ان میں سے کسی ایک آفت سے لڑ سکے۔

بڑے پیمانے پر تباہی ایک ایسا ورثہ ہے جو یہ آفات اس سیارے پر چھوڑ جاتی ہیں۔ تاہم کوئی سی بھی آفت ہمیشہ زمین کے کسی خاص خطے کو متاثر کرتی ہے۔ ہمیں دست قدرت کے قائم کیے ہوئے توازن کا شکر گزار ہونا چاہئے جو اللہ کی تخلیق ہے۔ زمین پر تمام جانداروں بشمول

انسانوں کیلئے ایک اہم تحفظ موجود ہوتا ہے۔ اس تحفظ کے باوجود ایک تباہ کن قدرتی آفت کا امکان کہیں چھپا رہتا ہے۔ اللہ ان آفات کو اس لئے نازل فرماتا ہے تاکہ ہم یہ جان سکیں کہ ہماری بستیاں کبھی کبھی کسقدر غیر محفوظ ہوتی ہیں۔ ایسی آفات تمام بنی نوع انسان کیلئے یاددہانیاں ہوتی ہیں کہ انسانوں کو اپنے اس سیارے پر کوئی کنٹرول حاصل نہیں جس پر وہ رہتے ہیں۔ اسی طرح ہر آفت ہمیں ہماری پیدائشی کمزوری سے بھی آگاہ کرتی ہے یہ یقیناً ان لوگوں کیلئے انتباہ ہوتا ہے جو ایسے واقعات پر غور کرتے ہیں اور دوسروں کے تجربات سے سبق سیکھتے ہیں۔

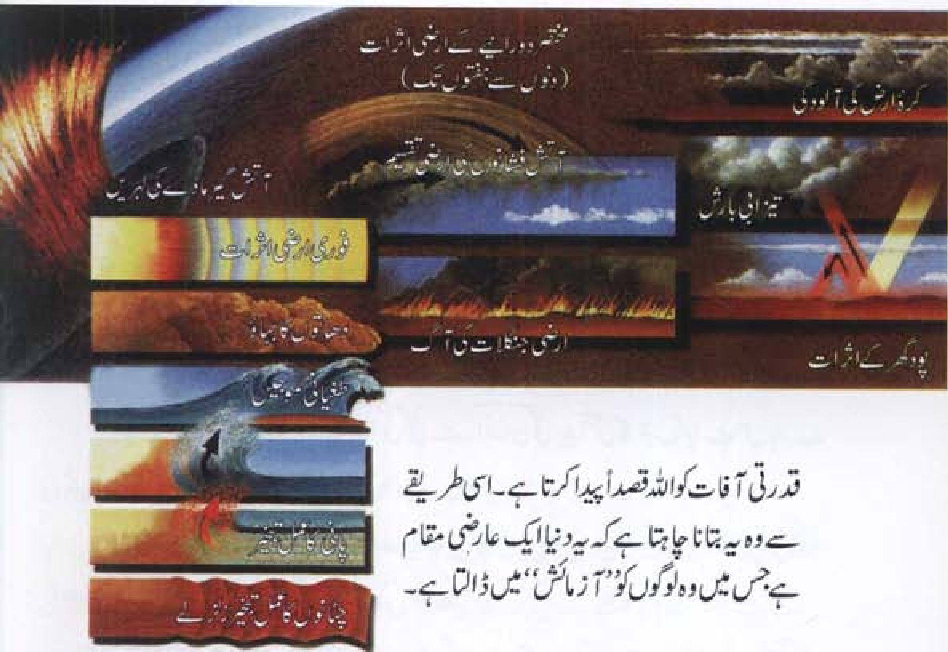
قدرتی آفات سے انسان دوسرے کون سے سبق سیکھتا ہے؟

یہ دنیا بطور خاص انسان کیلئے پیدا کی گئی ہے۔ انسان کی پیدائش کا سبب کیا ہے اس بارے میں درج ذیل سورۃ میں ارشادِ باری تعالیٰ اس طرح ہوتا ہے:

وَهُوَ الَّذِىْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِىْ سِتَّةِ اَيَّامٍ وَّكَانَ عَرْشُهٗ عَلَى الْمَآءِ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ط

''اور وہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دن میں پیدا کیا۔ جب کہ اس سے پہلے اس کا عرش پانی پر تھا تاکہ تم کو آزما کر دیکھے تم میں کون بہتر عمل کرنے والا ہے''۔ (سورۃ ھود: 7)

اس ''آزمائش'' کی ترکیب کافی مفصل ہے۔ ہر واقعہ اس خوبصورت ترکیب کا ایک حصہ ہے۔ مزید یہ کہ ان قدرتی مظاہر میں سے کوئی بھی الل ٹپ ظہور پذیر نہیں ہو جاتا۔ ان سب کی کوئی نہ کوئی سائنسی توجیہ موجود ہے۔ مثال کے طور پر کرۂ ارض کی کشش ثقل ہمیں بتاتی ہے کہ ہم تیر کر خلاء میں کیوں نہیں پہنچ جاتے۔ جب آبی بخارات ایک خاص درجہ حرارت پر پہنچتے ہیں تو بارش برستی ہے۔ اسی قسم کا سبب یا علت موت کے وقت بھی سامنے آتی ہے۔ حادثات یا بیماری۔ انسان کیوں مرجاتا ہے، حادثات کیوں پیش آتے ہیں، بیماریاں کیوں آتی ہیں۔ اس کیلئے بیشمار اسباب و علل بیان کی جاسکتی ہیں مگر اصل بات جو اہم ہے وہ یہ نہیں کہ ان اسباب کی تعداد کیا ہے بلکہ اس نظام کا قابل بھروسہ ہونا زیادہ اہم ہے جس پر ان اسباب اور نتائج کا دارومدار ہے۔ اس نظام کا ایک خاص پہلو زیادہ اہم ہے، ہر واقعہ اس طرح مختلف مراحل سے گزر کر پیش آتا ہے کہ انسانی ذہن اسے پوری طرح سمجھ لیتا ہے۔ اللہ انسان کو قدرتی آفات کے ذریعے متنبہ کرتا ہے۔ مثال کے طور پر ہزاروں عورتیں، بچے اور نوجوان زلزلے کا شکار ہو جاتے ہیں جبکہ بیشمار زخمی ہو جاتے ہیں۔ وہ



قدرتی آفات کو اللہ قصداً پیدا کرتا ہے۔ اسی طریقے سے وہ یہ بتانا چاہتا ہے کہ یہ دنیا ایک عارضی مقام ہے جس میں وہ لوگوں کو ''آزمائش'' میں ڈالتا ہے۔

لوگ جو اللہ کے انتباہ کی پرواہ نہیں کرتے وہ ان واقعات کو قدرتی مظاہر کا نام دیتے ہیں اور یہ بات ان کی سمجھ میں بہت کم آتی ہے کہ اللہ انہیں خاص مقصد کیلئے پیدا کرتا ہے۔ آیئے اس پر ایک لمحے کیلئے غور وخوض کرتے ہیں۔ اس وقت کیا ہوگا جب ایک زلزلے میں صرف وہ لوگ ہلاک ہوں جو گنہگار ہیں؟ ایسا ہو جائے تو پھر بنی نوع انسان کی آزمائش کی معقول بنیاد نہیں بنتی۔ اسی لئے اللہ ان میں سے ہر ایک مظہر قدرت یا آفت کو ''قدرتی'' ترکیب کے ساتھ نازل کرتا ہے۔ صرف وہ لوگ جو اللہ کی موجودگی پر ایمان رکھتے ہیں اور اس کی تخلیق کو اچھی طرح سمجھتے ہیں ان کی عقل میں یہ بات آسکتی ہے کہ اس قدرتی آفت کے پس پردہ کیا ربانی دلیل موجود ہے۔ درج ذیل سورۃ میں اللہ فرماتا ہے کہ وہ انسان کو اچھے اور بُرے دونوں قسم کے واقعات سے آزماتا ہے:

كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ ط وَ نَبْلُوْكُمْ بِالشَّرِّ وَ الْخَيْرِ فِتْنَةً ط وَ اِلَيْنَا تُرْجَعُوْنَ o

''ہر جاندار کو موت کا مزہ چکھنا ہے اور ہم اچھے اور بُرے حالات میں ڈال کر تم سب کی آزمائش کر رہے ہیں۔ آخرکار تمہیں ہماری طرف پلٹنا ہے''۔ (سورۃ الانبیاء : 35)

ایک آفت کے دوران بہت سے لوگ متاثر ہوتے ہیں۔ یہی اس آزمائش کو سمجھنے میں ایک

معما ہے۔ انسان کے ذہن میں ہر وقت یہ بات رہنی چاہئے اللہ ایک ایسا منصف ہے جو ہر بات جانتا ہے اور وَ قُضِيَ بَيْنَهُمْ بِالْحَقِّ ''لوگوں کے درمیان ٹھیک حق کے ساتھ فیصلہ سنا دیا جائے گا'' (سورۃ الزمر : 75)

اس دنیا میں انسان کو جو جو واقعات بھی پیش آتے ہیں وہ اس کی آزمائش کا ایک حصہ ہیں۔ وہ لوگ جو سچے دل سے اللہ پر ایمان رکھتے ہیں وہ اس پہیلی کی تہہ تک پہنچ سکتے ہیں۔ جب کبھی ان پر کوئی افتاد آتی ہے وہ صرف اللہ کی طرف رجوع کرتے اور اس سے توبہ کے خواستگار ہوتے ہیں۔ وہ اللہ کے مطیع وفرمانبردار بندے ہوتے ہیں اور اللہ کے اس وعدے سے آگاہ ہوتے ہیں:

وَ لَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَ نَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ ؕ وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ ۝ الَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ ۙ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ۝ اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَ رَحْمَةٌ ۫ وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ ۝

''ہم ضرور تمہیں خوف وخطر، فاقہ کشی، جان و مال کے نقصانات اور آمدنیوں کے گھاٹے میں مبتلا کر کے تمہاری آزمائش کریں گے۔ ان حالات میں جو لوگ صبر کریں اور جب کوئی مصیبت پڑے تو کہیں کہ ہم اللہ ہی کے ہیں اور اللہ ہی کی طرف ہمیں پلٹ کر جانا ہے۔ انہیں خوشخبری دے دو۔ ان پر ان کے ربّ کی طرف سے بڑی عنایات ہوں گی۔ اس کی رحمت ان پر سایہ کرے گی اور ایسے ہی لوگ راست رو ہیں''۔ (سورۃ البقرۃ : 155-157)

جیسا کہ سورۃ البقرۃ کی ان آیات میں بتایا گیا ہے کہ تمام انسان جن میں مومنین اور منکرین خدا دونوں شامل ہیں، سب کو مختلف طرح سے آزمایا جاتا ہے: کبھی تو قدرتی آفت کے ذریعے اور کبھی کبھی بیماری یا حادثے کے ذریعے جن کا ہم شکار ہوتے ہیں۔ ایسی آفات انفرادی سطح پر اور معاشروں کی سطح پر حملہ آور ہوتی ہیں جس سے مادی نقصان کے علاوہ روحانی پریشانیوں کا بھی سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ایک امیر آدمی دیوالیہ ہو سکتا ہے۔ ایک خوبصورت لڑکی کے چہرے پر ایک گہرا زخم آ سکتا ہے یا ایک ہنستا بستا شہر زلزلے میں تباہ ہو کر ملبے کا ڈھیر بن جاتا ہے۔ یہ سب کے سب ایسے واقعات ہیں جو صاف صاف ظاہر کرتے ہیں کہ کس طرح مختلف واقعات کسی بھی وقت ہماری زندگیوں کو بدل دیتے ہیں۔

لوگوں کو چاہئے کہ ایسے واقعات سے درس عبرت حاصل کریں۔ بیشک اللہ نے کوئی شے بھی بے مقصد پیدا نہیں کی۔ ہر آفت انسانوں کیلئے ایک یاددہانی ہوتی ہے۔ جس کا مقصد انہیں اس گمراہی سے بچانا ہوتا ہے، جس میں وہ گھرے ہوتے ہیں۔ قرآن میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہوتا ہے کہ دنیا میں کوئی بات اس کی اجازت کے بغیر ظہور پذیر نہیں ہو سکتی:

مَآ اَصَابَ مِنْ مُّصِيْبَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَمَنْ يُّؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ يَهْدِ قَلْبَهٗ ؕ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ۝

"کوئی مصیبت کبھی نہیں آتی مگر اللہ کے اذن سے ہی آتی ہے، جو شخص اللہ پر ایمان رکھتا ہو اللہ اس کے دل کو ہدایت بخشتا ہے۔ اللہ کو ہر چیز کا علم ہے۔ (سورۃ التغابن : 11)

وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تَمُوْتَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ كِتٰبًا مُّؤَجَّلًا ؕ وَمَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الدُّنْيَا نُؤْتِهٖ مِنْهَا ۚ وَمَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الْاٰخِرَةِ نُؤْتِهٖ مِنْهَا ؕ وَسَنَجْزِي الشّٰكِرِيْنَ ۝

"کوئی ذی روح اللہ کے اذن کے بغیر نہیں مر سکتا۔ موت کا وقت تو لکھا ہوا ہے۔ جو شخص ثواب دنیا کے ارادے سے کام کرے گا اس کو ہم دنیا ہی میں سے دیں گے اور جو ثواب آخرت کے ارادے سے کام کرے گا وہ آخرت کا ثواب پائے گا۔ اور شکر کرنے والوں کو ہم ان کی جزا ضرور عطا کریں گے۔ (سورۃ آل عمران : 145)

ان آفات سے انسان ایک اور سبق یہ سیکھتا ہے کہ وہ جو اس زمین پر اپنے آپ کو بڑا طاقتور سمجھتا پھرتا ہے اسے یہ حقیقت معلوم ہوتی ہے کہ وہ تو بہت کمزور ہے اور اسمیں اتنی طاقت ہی نہیں کہ ان آفات کا مقابلہ کر سکے۔ جو اللہ کے حکم سے ایک لمحے کے اندر اندر اسے آلیتی ہیں۔ انسان ایسے موقعوں پر نہ تو اپنی مدد کر سکتا ہے نہ کسی اور کی۔ بیشک اللہ ہی قادر مطلق ہے۔ اسے درج ذیل سورۃ میں یوں بیان فرمایا ہے:

وَاِنْ يَّمْسَسْكَ اللّٰهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهٗٓ اِلَّا هُوَ ؕ وَاِنْ يَّمْسَسْكَ بِخَيْرٍ فَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝

"اگر تمہیں اللہ کسی قسم کا نقصان پہنچائے تو اس کے سوا کوئی نہیں جو تمہیں اس نقصان سے بچا سکے اور اگر وہ تمہیں کسی بھلائی سے بہرہ مند کرے تو وہ ہر چیز پر قادر ہے"۔ (سورۃ الانعام : 17)

اس باب میں ہم ان مختلف قسم کی آفات کا ذکر کریں گے جو کرۂ ارض پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ مقصد یہ ہے کہ لوگوں کو یہ یاد دلایا جائے کہ یہ دنیا ایک ایسی جگہ نہیں ہے جس سے اندھا دھند محبت کی جائے۔ یہ واقعات بتاتے ہیں کہ ہمیں اللہ کی مدد اور رہنمائی کی کس قدر ضرورت ہے۔ جیسا کہ اس آیت قرآنی میں ارشاد ہوا: وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّ لَا نَصِيْرٍ ۝ ''اور اللہ سے بچانے والا کوئی سرپرست اور مددگار تمہارے لئے نہیں ہے''۔ (سورۃ العنکبوت : 22)

زلزلے

زلزلے کرۂ ارض پر سب سے زیادہ تباہ کن قدرتی طاقتیں ہیں۔ انسانی جانوں کا سب سے زیادہ نقصان زلزلوں کے دوران ہوتا ہے۔ تحقیق سے یہ بات معلوم ہوئی ہے کہ ہر دو منٹوں کے درمیان دنیا میں کہیں نہ کہیں زمین میں ضرور دراڑیں پڑتی ہیں۔ حاصل شدہ اعداد و شمار کے مطابق کرۂ ارض سال میں کئی ملین مرتبہ جھٹکے محسوس کرتی ہے۔ اوسطاً ان میں سے تین سو ہزار زلزلے معمولی قسم کے ہوتے ہیں۔ ان میں جھٹکے اتنی معمولی سی نوعیت کے ہوتے ہیں کہ ان سے کوئی تباہی نہیں ہوتی۔ ان میں سے بیس زلزلے اسقدر طاقتور ہوتے ہیں کہ زمین کو ہلا کر رکھ دیتے ہیں۔ تاہم چونکہ یہ زیادہ گنجان آباد علاقوں میں نہیں آتے اس لئے اگر ایسا ہو بھی تو چند لوگ لقمہ اجل بنتے ہیں اور ان سے اقتصادی نقصان بہت کم ہوتا ہے۔ ان میں سے صرف پانچ زلزلے ایسے ہوتے ہیں جو عالیشان اور فلک بوس عمارتوں کو ملبے کے ڈھیروں میں تبدیل کر دیتے ہیں۔

اس ساری معلومات سے پتہ چلتا ہے کہ لوگ زیادہ زلزلوں کا شکار نہیں ہوتے۔ بیشک اللہ بنی نوع انسان کو ان آفات سے تحفظ بخشتا ہے۔

ہمارے اس دور میں کوئی ایک شہر یا صوبہ نقصان دہ زلزلے سے متاثر ہوتا ہے تاہم اگر اللہ چاہے تو ہماری اس پوری زمین پر زلزلہ کسی وقت بھی آ سکتا ہے۔ ایسی صورت میں کرۂ ارض پر موجود ساری انسانی آبادی صفحہ ہستی سے مٹ جائے۔ زمین کی ساخت زلزلوں کی زد میں رہتی ہے۔ زمین کے اندر اور سطح زمین کے اُوپر موجود چٹانیں کسی بھی وقت اچانک حرکت میں آ سکتی ہیں۔ جس سے ایسی تباہی و بربادی کا امکان رہتا ہے جس سے بچنا ممکن ہی نہ ہو۔

زلزلے کا زمین کی قسم سے کوئی تعلق نہیں ہے، جس سے کہ زلزلے سے متعلق لہریں جو اس

کے درمیان سے گزر رہی ہیں اس کے اثرات کو بڑھا دیں۔ایک زلزلہ تو اس وقت بھی آ سکتا ہے جب اس کیلئے قدرتی حالات موجود نہ بھی ہوں۔ اللہ جب چاہے زلزلہ آ سکتا ہے۔ چنانچہ اللہ زمین کے کچھ حصوں میں عدم تحفظ اور عدم استحکام پیدا کر دیتا ہے۔ یہ لوگوں کو یاد دلانے کیلئے ہوتا ہے کہ کسی وقت بھی ایک غیر متوقع واقعہ ان کی زندگیوں کو خطرے میں ڈال سکتا ہے۔قرآن پاک میں اللہ نے لوگوں کو ایک ممکنہ آفت کے بارے میں یوں متنبہ فرمایا ہے:

اَفَاَمِنَ الَّذِیْنَ مَکَرُوا السَّیِّاٰتِ اَنْ یَّخْسِفَ اللّٰہُ بِھِمُ الْاَرْضَ اَوْ یَاْتِیَھُمُ الْعَذَابُ مِنْ حَیْثُ لَا یَشْعُرُوْنَ٥

''پھر کیا وہ لوگ جو (دعوت پیغمبر کی مخالفت میں) بدتر سے بدتر چالیں چل رہے ہیں اس بات سے بالکل ہی بے خوف ہو گئے ہیں کہ اللہ ان کو زمین میں دھنسا دے یا ایسے گوشے سے ان پر عذاب لے آئے جدھر سے اس کے آنے کا ان کو وہم و گمان تک نہ ہو''۔ (سورۃ النحل : 45)

یہ زلزلے جو زمین کو صرف چند سیکنڈوں کے لئے جھٹکا دیتے ہیں گھنٹوں تک بلکہ دنوں تک پھیل سکتے ہیں۔ایک تباہ کن آفت سے نکلتے ہی لوگ ایک دوسری آفت کا شکار ہو سکتے ہیں۔ایسا کرنا اللہ کیلئے بیشک بہت آسان ہے۔تاہم وہ اپنے رحم و کرم کی وجہ سے انسان کو تحفظ بخشتا ہے اور ایسی آفات سے اسے اکثر و بیشتر یاد دلاتا رہتا ہے کہ اسے اپنی زندگی پر کسی قسم کا اختیار حاصل نہیں ہے۔

اس موقعہ پر ایک ایسے بڑے زلزلے کو یاد رکھنا مفید ہوگا جو بیسویں صدی میں آیا تھا۔

جاپان کے شہر کوبے میں ٹیکنالوجی شکست کھا گئی

اس دور کی ترقی یافتہ سائنس اور ٹیکنالوجی انسان کے دل و دماغ میں یہ تاثر پیدا کرتی ہے کہ اس نے فطرت پر قابو پا لیا ہے۔مگر پھر بھی ان لوگوں کو جلد ہی بے حد مایوسی ہوتی ہے جو اس طرح کا تصور کرتے ہیں۔ٹیکنالوجی اللہ کا عطا کردہ ایک ایسا اوزار ہے جو انسان کی خدمت کیلئے ہے اور جس کا پورا پورا کنٹرول اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ بہت سے واقعات ظاہر کرتے ہیں کہ ترقی یافتہ ٹیکنالوجی کے کئی شعبے فطرت پر حکومت کرنے میں ناکام ہو گئے ہیں۔مثال کے طور پر ''زلزلوں سے بچنے کی ٹیکنالوجی'' جس کے موجد جاپانی سائنسدان تھے' کے باوجود جاپان کا شہر کوبے وسیع

پیمانے پر زلزلے کی زد میں آ گیا تھا جو 1995ء میں 20 سیکنڈ کی شدید ہلا دینے والی لہروں کی رفتار سے آیا تھا۔ زلزلوں سے محفوظ رہنے کیلئے دنیا کی زیادہ تر عمارات جنہیں زلزلوں کے جھٹکے برداشت کر کے صحیح سلامت کھڑا رہنے کے طریقے سے تعمیر کیا گیا تھا ایک 6.9 کی رفتار سے آنے والے زلزلے میں زمین بوس ہو گئی تھیں۔ گذشتہ تیس برس میں جاپانی حکومت نے ایک تحقیق پر 40 ٹریلین ڈالر کی خطیر رقم خرچ کی تا کہ ایک ایسا پہلے سے باخبر کر دینے والا نظام بنا لیں جس سے زلزلوں سے محفوظ رہا جا سکے۔ مگر ان کوششوں کا کوئی خاطر خواہ نتیجہ نہ نکلا۔ اب جبکہ بیسویں صدی ختم ہونے کو ہے سائنسدان اب تک ایسے نظام وضع نہیں کر سکے جن سے زلزلوں کے تباہ کن نتائج سے بچنے کے لئے ہر وقت انتباہ کیا جا سکے۔ اس کی ایک حالیہ مثال جاپان کا شہر کوبے تھا جہاں یہ پتہ چلا کہ کس قدر غیر متوقع طور پر شدید زلزلے نے اس جدید صنعتی شہر کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔

عوام کو یہ یقین دہانی کرائی گئی تھی کہ بڑے بڑے زلزلوں کی آمد سے قبل ان کے بارے میں پیشینگوئی کرنے کی جدید ٹیکنالوجی تیار کر لی گئی ہے جو انہیں تباہی و بربادی سے بچا لے گی۔ مگر اس تباہی کے بعد جس نے کوبے شہر کو ملبے کے ڈھیروں میں تبدیل کر دیا تھا یہ بات ثابت ہو گئی تھی کہ ابھی تک انسان کوئی بھی ایسی ٹیکنالوجی تیار نہیں کر سکا جو لوگوں کو آنے والے خطرے سے قبل از وقت چوکنا کر دے۔ یہ بات بھی ظاہر ہوئی کہ وہ مرکز زلزلہ جو کوبے شہر کے صنعتی حصے سے 15 میل جنوب مغرب میں تھا' اس سے "زلزلے سے محفوظ رہنے والی" عمارتیں کوئی مدافعت نہ کر سکی تھیں۔

زلزلے سے متاثر ہونے والے علاقے میں کوبے اور اوساکا کے گنجان آباد شہر شامل تھے۔ اسی لئے ایک ایسی ہولناک تباہی و بربادی ہوئی جس میں 5200 انسان لقمہ اجل بن گئے اور 300,000 افراد زخمی ہوئے۔ کل نقصان کا تخمینہ 200 بلین ڈالر لگایا گیا تھا۔

ایسی آفت سے یقیناً سبق سیکھنے چاہئیں۔ شہر میں بسنے والے عیش و آرام کی زندگی گزار رہے تھے مگر اس تباہی کے بعد انہیں اچانک بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ وہ جس صدمے سے دم بخود تھے اس میں ان کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ زندہ رہ کر اب وہ لوگ کیا کریں گے۔ اب تو مستقبل کے صرف منصوبے ہی بنائے جا سکتے تھے۔



کوبے جاپان کا دوسرا سب سے زیادہ آباد صنعتی شہر تھا۔ یہ ٹوکیو کے بعد دوسری بہت اہم بندرگاہ بھی تھی۔ 17 جنوری 1995ء کو صبح کے پانچ بجکر چھیالیس منٹ پر بیس سیکنڈوں کی شدید جھٹکے دینے والی لہروں نے اسے ہولناک تباہی سے دوچار کر دیا تھا۔ صرف بیس سیکنڈوں میں لوگوں کی عمر بھر کی املاک جو انہوں نے بڑی محنت سے بنائی تھیں تباہ و برباد ہو گئی تھیں۔







آندھیاں، جھکڑ اور طوفانِ گردو باد

آندھیاں، جھکڑ اور طوفانِ گردوباد وہ قدرتی آفات ہیں جن سے لوگوں کا اکثر و بیشتر واسطہ پڑتا ہے۔ ہر سال یہ آفات اور ان کے بعد کے نتائج ہزاروں انسانی جانیں ضائع کرتے ہیں۔ یہ اسقدر تیز و تند ہوائیں ہوتی ہیں جو شہروں کو نقصان پہنچاتیں، لوگوں کو مار ڈالتی اور زخمی کر دیتی ہیں۔ ہزاروں درختوں، جھونپڑیوں، ٹیلی فون کے کھمبوں، کاروں اور عمارات تک کو اُڑا کر میلوں دور پھینک دیتی ہیں۔ بڑے بڑے طوفانِ گردوباد خاص طور پر سمندری لہروں کو اچانک بلند کر دیتے ہیں۔ ایسے طاقتور طوفان لہروں کو سینکڑوں میل فی گھنٹے کی رفتار سے ساحل سمندر سے ٹکراتے ہیں۔ ایسے حالات میں سمندر کا پانی ساحلوں سے اچھل کر خشک زمین تک پہنچ جاتا ہے اور ڈیلٹائی خطوں میں شدید سیلاب آ جاتے ہیں۔ ٹھنڈی ہواؤں کے جھونکے جب تیز و تند آندھیوں میں تبدیل ہو جاتے ہیں تو وہ عمارات تک کو اپنی جگہ سے ہٹا دیتے ہیں۔ یہ ہمیں سوچنے پر مجبور کرتی ہیں کہ وہ کون سی عظیم طاقت ہے جو یہ سب کچھ کرنے پر قادر ہے۔ زلزلوں پر جن صفحات میں بحث کی گئی وہاں اسی علت و سبب پر گفتگو کی گئی ہے اور یہی بات آندھیوں اور طوفان گردوباد پر بھی صادق آتی ہے۔ اگر اللہ چاہتا تو انسان ان قدرتی آفات سے تھوڑے تھوڑے وقفوں کے بعد دوچار ہو سکتا تھا۔ ایسا ہو سکتا تھا کہ جب انسان ابھی ان آفات کی تباہ کاریوں سے سنبھل ہی رہے ہوتے تو کوئی نئی آفت انہیں آ گھیرتی۔ قرآن پاک میں اللہ انسان کو یاد دلاتا ہے کہ ہوائیں اسی کے اختیار اور قبضۂ قدرت میں ہیں:

ءَ اَمِنْتُمْ مَّنْ فِي السَّمَآءِ اَنْ يَّخْسِفَ بِكُمُ الْاَرْضَ فَاِذَا هِيَ تَمُوْرُ ۝ اَمْ اَمِنْتُمْ مَّنْ فِي السَّمَآءِ اَنْ يُّرْسِلَ عَلَيْكُمْ حَاصِبًا ط فَسَتَعْلَمُوْنَ كَيْفَ نَذِيْرِ ۝ وَ لَقَدْ كَذَّبَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَكَيْفَ كَانَ نَكِيْرِ ۝

"کیا تم اس سے بے خوف ہو کہ وہ جو آسمان میں ہے تمہیں زمین میں دھنسا دے اور یکا یک یہ زمین ہچکولے کھانے لگے؟ کیا تم اس سے بے خوف ہو کہ وہ جو آسمان میں ہے تم پر پتھراؤ کرنے والی ہوا بھیج دے؟ پھر تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ میری تنبیہ کیسی ہوتی ہے۔ اور جو لوگ ان سے پہلے تھے انہوں نے بھی جھٹلا دیا تھا سو (دیکھ لو کہ) میرا کیسا عذاب ہے"۔

(سورۃ الملک : 16-18)

تاہم اللہ ہی انسان کو آفات اور ان کی ہولناک تباہیوں سے محفوظ رکھتا ہے۔ وہ ان کی طرف کبھی کبھی تیز و تند طوفان بھیجتا ہے۔ یہ یقیناً انسان کو تنبیہ کرنے کیلئے ہے اور اصل مقصد تو انسانوں کو یہ یاد دلانا ہے کہ ان کی زندگی کا حقیقی مقصد یہ ہے کہ وہ اللہ کے مطیع و فرمانبردار بندے بن کر رہیں اور یہ کہ اللہ کی طاقت کے سامنے وہ بالکل بے بس ہیں اور یوم حساب ان کا فیصلہ ہوگا۔

آتش فشاں

جس طرح زمین اچانک ہچکولے کھانے لگتی ہے اسی طرح زمین کے اندر کی اور سطح زمین کی چٹانیں پھٹ جاتی ہیں اور آتش فشاں لاوا اگلنے لگتے ہیں جو قدرتی آفات کی ایک اور صورت ہے۔ آج کل دنیا بھر کے گرد 1500 ایسے آتش فشاں ہیں جو لاوا اگلتے ہیں۔ ان میں سے 550 تو زمین پر ہیں جبکہ بقیہ سمندروں کی تہ میں ہیں۔ یہ آتش فشاں کسی بھی وقت پھٹ سکتے ہیں جس سے بڑے پیمانے پر تباہ و بربادی ہوتی ہے' اس بارے میں قبل از وقت کسی کو بھی کچھ پتہ نہیں ہوتا۔ جب ان میں سے لاوا نکلتا ہے تو قرب و جوار کے شہریوں کو لقمہ اجل بنا لیتا ہے' نیز فصلیں تباہ ہو جاتی ہیں اور کھیتیاں راکھ بن جاتی ہیں۔

اس صدی اور تاریخ کے ابتدائی دور میں کچھ ایسی ہی تباہ کاریوں نے جو آتش فشاں کے پھٹنے سے وجود میں آئیں' انسانی ذہنوں پر انمٹ نقوش چھوڑے ہیں۔ ان سے نقشہ عالم پر سے بہت شہروں کے نام و نشان مٹ گئے تھے اور لاتعداد انسان ہلاک ہو گئے تھے۔ تاریخ نے جن آتش فشانوں کے پھٹنے کے ہولناک مناظر دیکھے ان سے انسان کو یقیناً سبق سیکھنے چاہئیں۔ مثال کے طور پر اٹلی میں واقع کوہ ویسوویس (Mount Vesuvius) کے لاوے نے پمپیائے (Pompeii) شہر کو زمین میں دفن کر دیا تھا جہاں کے لوگ مکمل فسق و فجور اور عیاشی کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ 24 اگست 79 سی ای کو اس ہنستے بستے شہر کے 20,000 انسان آتشی مادے سے دم گھٹ جانے کی وجہ سے ہلاک ہو گئے تھے۔

ہمارے آج کے اس عہد میں آتش فشانوں کی خوابیدگی اکثر و بیشتر اچانک اور غیر متوقع طور پر پھٹ پڑتی ہے جس سے آتشی مادہ ہوا میں ہزاروں فٹ بلندی تک اُڑ کر چلا جاتا ہے۔ اس اثناء میں یہ لاوا ایسے علاقوں میں بہہ کر چلا جاتا ہے جہاں جو چیز بھی اس کی زد میں آتی ہے اسے شدید

روری1988ء میں ایک طوفان گردوباد
نے فلوریڈا کو سخت نقصان پہنچایا تھا۔ اس
لوفان نے عمارات کو زمین بوس کر دیا اور
گاڑیوں کو اُٹھا کر عمارتوں کی چھتوں پر پھینک
یا۔ (اگلی اور نیچے دی گئی تصویر) گاڑیاں
ور گھروں کا ساز و سامان جسے طوفانِ گردوباد
نے بکھیر دیا ہے۔





ایک شدید طوفان گردو باد (Tornado) جو گھروں کو اُڑا کر لے گیا اور جس نے ایک پورے شہر کو ملبے کے ڈھیروں میں تبدیل کر دیا تھا۔



فروری 1988ء میں فلوریڈا میں ایک طوفان گردو باد کے بعد تیز رفتار کشتیاں (پاور بوٹس) کا ڈھیر

نقصان پہنچتا ہے۔ لاوا جب پھوٹ بہتا ہے تو اس سے ایک اور برا اثر یہ پیدا ہوتا ہے کہ مہلک گیسوں کے بادل فضا میں پھیل جاتے ہیں اور ہوائیں راکھ کو اپنے ساتھ اُڑا کر آباد علاقوں میں لے جاتی ہیں۔ ان خوفناک ہواؤں کی رفتار بعض اوقات 90 میل فی گھنٹہ ہوتی ہے۔ یہ ہر شے کو نذر آتش کر دیتی ہیں اور یہ شہروں پر اس طرح چھا جاتی ہیں جس طرح سورج کی تمازت کو روکنے والے شامیانے۔

جزائر شرق الہند میں واقع ایک KRAKATAU نامی جزیرے میں 1883ء میں ایک ہولناک ترین تباہی پھیلی تھی۔ اس نے ایک ایسی صوتی لہر کو جنم دیا تھا جو 3,000 میل دور تک سنی گئی تھی۔ لاوا اُبل کر 125 فٹ بلندی تک فضا میں چلا گیا تھا۔ سمندر کی طوفانی لہروں نے ساحل پر واقع 165 دیہات مہندم کر دیئے تھے جس سے 36,000 افراد ہلاک ہو گئے۔

آتشاں فشاں صرف زیادہ لوگوں کو لقمہ اجل بنانے کی وجہ سے ہی یاد نہیں رکھے جاتے بلکہ یہ اس لئے بھی نہیں بھولتے کیونکہ ان کے پھٹ جانے کا عمل بڑا تباہ کن ہوتا ہے۔ اس کی ایک مثال Nevado Del Ruiz کا پھٹ جانا ہے۔ یہ کم شدت کے آتش فشاں کے پھٹ جانے کا عمل تھا۔ کوہ سینٹ ہیلنز (Mount St Helens) کے لاوا اُگلنے کے مقابلے میں اس کی شدت صرف 3% تھی۔ تقریباً 150 برس خاموش رہنے کے بعد Nevado Del Ruiz نے لاوا اگلا تھا جس سے اس کی چوٹیوں پر یخ بستہ ساری برف پگھل گئی تھی۔

کیچڑ کا دریا جو کوہ آتش فشاں کی ڈھلوان سے نیچے بہہ کر آیا اور دریائے Lagunille کی وادی میں پہنچا اسقدر تباہ کن تھا کہ کولمبیا کے شہر آرمرو (Armero) میں 20,000 انسان ہلاک ہو گئے۔ ان کا مقدر گرم لاوے کے کیچڑ کی قبریں بنی تھیں۔ جب سے کوہ پیلی (Mount Pelee) نے 1902ء میں سینٹ پیئر (St Pierre) کو تباہ کیا تھا اسے بدترین آتش فشانی تباہی و بربادی تصور کیا جاتا تھا۔ کوہ پیلی نے جب سینٹ پیئر میں آتشی لہر پھینکی تو 30,000 جانیں لے لی تھیں۔

اللہ اس طرح کے واقعات پیش کرتا ہے جن میں اسقدر اچانک انسان مختلف آفات سے موت کا شکار ہو جاتے ہیں۔ وہ دراصل انسان کو اس بات پر غور و فکر کرنے کی ترغیب دیتا ہے کہ اس کرۂ ارض پر اس کی زندگی کا مقصد کیا ہے۔

یہ واقعات انتباہ کا کام کرتے ہیں۔ اس انسان سے جو اللہ کا تصور کر سکتا ہے اس کے عوض جو توقع کی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ وہ اپنی پچاس ساٹھ سالہ زندگی میں راہ مستقیم سے نہ ہٹ جائے اور آخرت کی دائمی زندگی کو نظر انداز نہ کرے۔ ہمیں اس حقیقت کو کبھی نہ بھولنا چاہئے کہ ایک نہ ایک روز موت تو ہر انسان کو آنی ہے، پھر اس روز ہر انسان کا حساب اللہ کے روبرو ہوگا:

يَوْمَ تُبَدَّلُ الْاَرْضُ غَيْرَ الْاَرْضِ وَ السَّمٰوٰتُ وَ بَرَزُوْا لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ ٥

''زمین اور آسمان بدل کر کچھ کے کچھ کر دیئے جائینگے اور سب کے سب اللہ واحد قہار کے سامنے بے نقاب حاضر ہو جائینگے''۔ (سورۃ ابراہیم : 48)

سمندری آتش فشاں

سمندری آتش فشانی لہریں سمندر کے اندر اچانک آتش فشاں کے پھٹنے سے پیدا ہوتی ہیں۔ ان آتش فشانی لہروں میں سے کچھ اتنی ہی تباہ کن ہوتی ہیں جتنے ایٹم بم۔



(بائیں جانب) ایک آتش فشاں لاوا اُگل رہا ہے۔ (نیچے) لاوے کے ایک سمندر کے درمیان موجود ایک بس پمپائے (Pompeii) کی تباہی کی یاد دلاتی ہے۔





جون 1991ء میں کوہ پیناٹوبو (Mount Pinatubo) سے نکلنے والے ان سیاہ بادلوں نے پورے افق کو اپنے اندر چھپا لیا' جن میں راکھ سے بھری ہوئی گیس شامل تھی۔ یہ ایک مہلک آتشی لاوے کی لہر تھی جو اس پہاڑ سے خارج ہوئی تھی۔ اسے بیسویں صدی کی سب سے بڑی آتش فشانی تباہی سمجھا گیا ہے۔ (نیچے بائیں) کوہ پیناٹوبو کے گرد بسنے والے لوگ اپنے آپ کو راکھ کی بارش سے بچانے کیلئے چھتریاں استعمال کر رہے ہیں۔

سیلاب

بے شک اللہ ان آفات کو پیدا کر کے انسان کو ''انتباہ'' کرتا ہے۔قوت وطاقت میں اس ذات باری تعالیٰ کا کوئی ثانی نہیں اور وہ ہر شے پر قادر ہے۔اللہ نے اس کی تصدیق قرآن پاک کی اس آیت میں یوں فرمادی ہے:

قُلْ هُوَ الْقَادِرُ عَلٰٓى اَنْ يَّبْعَثَ عَلَيْكُمْ عَذَابًا مِّنْ فَوْقِكُمْ اَوْ مِنْ تَحْتِ اَرْجُلِكُمْ

''وہ اس پر قادر ہے کہ تم پر کوئی عذاب اُوپر سے نازل کردے یا تمہارے قدموں کے نیچے سے برپا کردے''۔ (سورۃ الانعام : 65)

دنیا کے اِردگرد بہت سے تباہ کن طبعی خطرات موجود ہیں' یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس سے انکار کی کوئی گنجائش نہیں۔ان عذابوں کی شکل میں وہ انسان سے چند سیکنڈوں میں وہ سب کچھ واپس لے سکتا ہے جو اس ذات مہربان نے انسان کو عطا کر رکھا ہے۔یہ آفات کہیں بھی کسی بھی وقت نازل ہوسکتی ہیں یہ اس بات کی دلیل ہے کہ دنیا میں کوئی بھی ایسی جگہ نہیں ہے جو انسان کو ان آفات سے تحفظ کی ضمانت دے سکتی ہو۔اس بارے میں درج ذیل سورۃ میں ارشاد باری تعالیٰ اس طرح ہوتا ہے:

اَفَاَمِنَ اَهْلُ الْقُرٰٓى اَنْ يَّاْتِيَهُمْ بَاْسُنَا بَيَاتًا وَّ هُمْ نَآئِمُوْنَ ۝ اَوَ اَمِنَ اَهْلُ الْقُرٰٓى اَنْ يَّاْتِيَهُمْ بَاْسُنَا ضُحًى وَّ هُمْ يَلْعَبُوْنَ ۝ اَفَاَمِنُوْا مَكْرَ اللّٰهِ ۚ فَلَا يَاْمَنُ مَكْرَ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْخٰسِرُوْنَ ۝

''پھر کیا بستیوں کے لوگ اب اس سے بے خوف ہو گئے ہیں کہ ہماری گرفت کبھی

آتش فشاں کے پھٹنے سے تیز وتند آبی لہریں ساحلی شہروں کو بسا اوقات تباہ و برباد کردیتی ہیں۔





1997-98 میں ایلنینو (El-Nino) نے بہت سے شہروں کو غرق آب کر دیا تھا۔ پوری دنیا میں کل نقصان کا تخمینہ 20 بلین ڈالر لگایا گیا تھا۔
(اُوپر) ایلنینو سے متاثر ہونے والا ایک شہر۔ بیشک پانی کرۂ ارض پر انسانی زندگی کیلئے بے حد اہم ہے۔ مگر تباہ کن سیلاب اس کیلئے خطرہ بنے رہتے ہیں۔
(اگلی تصویر) پانی میں ڈوبا ہوا ایک گھر

اچانک ان پر رات کے وقت نہ آ جائے گی جبکہ وہ سوئے پڑے ہوں؟ یا انہیں اطمینان ہو گیا ہے کہ ہمارا مضبوط ہاتھ کبھی اچانک ان پر دن کے وقت نہ پڑے گا جبکہ وہ کھیل رہے ہوں؟ کیا یہ لوگ اللہ کی چال سے بے خوف ہیں؟ حالانکہ اللہ کی چال سے وہی قوم بے خوف ہوتی ہے جو تباہ ہونے والی ہو"۔ (سورۃ الاعراف : 97-99)

اللہ چاہے تو وہی پانی جو انسان کیلئے بہت بڑی نعمت ہے عذاب بن سکتا ہے۔ انسان بھی کسقدر بے حس واقع ہوا ہے کہ وہ ہر سال ایک یا دو سیلاب ضرور دیکھتا ہے مگر اس کے باوجود اس امکان کو رد کر دیتا ہے کہ وہ خود بھی کبھی اس قسم کی تباہی و بربادی سے دوچار ہو سکتا ہے۔



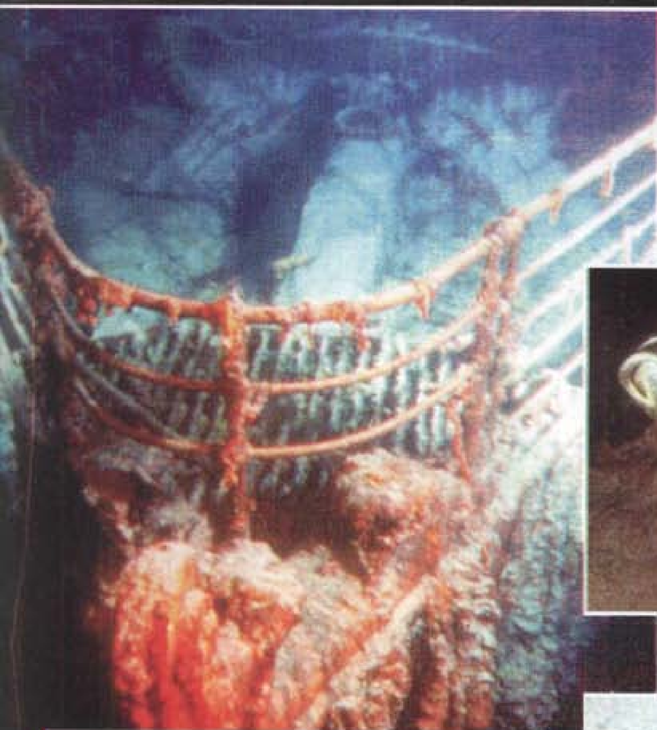


- ٹمپا' فلوریڈا میں 1992ء کے ایک طوفان بادوباراں میں برف 100 میل فی گھنٹے کی رفتار سے گاڑی کی کھڑکیوں پر گری جس سے تقریباً 25 ملین ڈالروں کا نقصان ہوا۔
- اولوں سے ایک مکان کی چھت کو نقصان پہنچا۔ (اُوپر)

(نیچے) انسانی غفلت کے نتیجے میں لگنے والی جنگلات کی آگ یا دوسری آگ سے بڑا نقصان ہوتا ہے۔



کیلی فورنیا (امریکہ) کے ساحل لیگونا (Laguna Beach) کے بالائی حصے میں واقع خشک گھاٹی میں آگ لگ گئی جو 1993ء میں شہری جنگلات کی آگ میں سب سے زیادہ تباہ کن تھی۔ اس جلتی ہوئی آگ سے 14,000 ایکڑ اراضی اور 441 مکانات جل گئے۔ قریب ہی واقع Mystic Hills کا علاقہ بری طرح متاثر ہوا جہاں 286 گھر جل کر راکھ ہو گئے۔







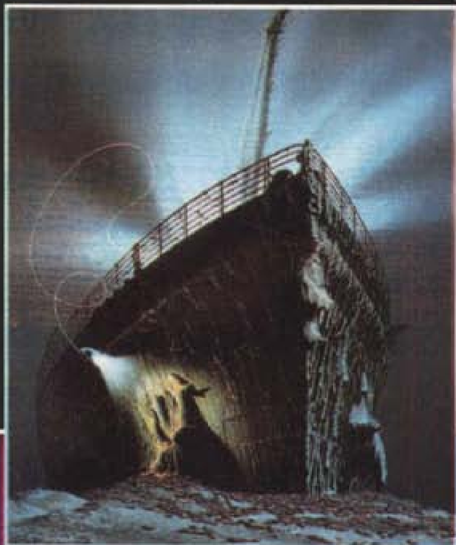




کچھ ایسا فرنیچر اور اشیاء، جو ٹائٹینک میں موجود تھیں۔ اس مشہور زمانہ بحری جہاز کے ساتھ ہی یہ ساری چیزیں بھی سمندر کے گہرے پانیوں میں دفن ہو گئی تھیں۔ آج دنیا کے بہت ہی کم لوگوں کو یہ [illegible] تھیں




The Queen of the Ocean
TITANI
Saturday, April 20th
TICKETS FOR SALE





ٹائٹینک: ایک تاریخی سبق

تاریخ میں ان لوگوں کا ذکر اکثر آتا ہے جو ٹیکنالوجی کی ترقی پر تو بڑا انحصار کرتے ہیں مگر اللہ کی طاقت کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ اسی لئے تاریخ میں بہت سے عذاب اور تباہ کاریاں ایسی ہیں جن کا ذکر ہر انسان کیلئے تکلیف دہ سبق آموز واقعات کے طور پر کیا گیا ہے۔ ان میں سے ہر واقعہ اس لئے اپنی جگہ بے حد اہم ہے کیونکہ یہ انسان کو یاد دلاتا ہے کہ دنیا کی کوئی دولت، طاقت، سائنس یا ٹیکنالوجی اللہ کی طاقت کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ ایسے واقعات کی بیشمار مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔ ان میں سے بہت مشہور ٹائٹینک کی ہے جو ایک بہت بڑا بحری جہاز تھا جس کی اُونچائی 55 میٹر اور لمبائی 275 میٹر تھی۔ یہ جہاز تقریباً 90 سال پیشتر ڈوب گیا تھا۔ ٹائٹینک ''فطرت پر حملے'' کا ارادہ رکھتا تھا۔ یہ ایک بہت بڑا منصوبہ تھا جس میں انجینئروں کی ایک ٹیم اور 5000 افراد کام کر رہے تھے۔ کم و بیش ہر ایک یہ سمجھے بیٹھا تھا کہ یہ جہاز کبھی ڈوب نہیں سکتا۔ یہ بحری جہاز جدید ٹیکنالوجی کا شاہکار تھا اور اس میں ایسی جدید اور ترقی یافتہ انجینئری کی صناعی کو کام میں لایا گیا تھا جس نے وقت کی حدود کو پیچھے دھکیل دیا ہو مگر یہ لوگ جنہیں اس جہاز کی تکنیکی عمدگی پر تو بھروسہ تھا مگر وہ ایک اور حقیقت کو بھلا بیٹھے تھے جس کا ذکر قرآن پاک کی اس آیت میں یوں آیا ہے:

وَكَانَ اَمْرُ اللّٰهِ قَدَرًا مَّقْدُوْرًا ۝

''اور اللہ کا حکم ایک قطعی طے شدہ فیصلہ ہوتا ہے'' (سورۃ الاحزاب : 38)

اس جہاز کے ڈوبنے پر جو لوگ زندہ بچ گئے تھے انہوں نے بتایا کہ مسافروں کی اکثریت اس وقت جہاز کے عرشے پر دُعا کیلئے جمع ہو گئی تھی جب ٹائٹینک ڈوبنے والا تھا۔ قرآن حکیم کی بہت سی سورتوں میں اس انسانی رَویّے کا ذکر آیا ہے۔ جب انسان کسی مصیبت اور پریشانی میں گھر جاتا ہے تو خلوص دل سے دُعائیں مانگتا ہے اور اپنے خالق کی مدد کا طلبگار رہتا ہے مگر جونہی ایسے انسان خطرے سے نکل جاتے ہیں فوراً ناشکرے بن جاتے ہیں۔

رَبُّكُمُ الَّذِىْ يُزْجِىْ لَكُمُ الْفُلْكَ فِى الْبَحْرِ لِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ ؕ اِنَّهٗ كَانَ بِكُمْ رَحِيْمًا ۝ وَ اِذَا مَسَّكُمُ الضُّرُّ فِى الْبَحْرِ ضَلَّ مَنْ تَدْعُوْنَ اِلَّآ اِيَّاهُ ۚ فَلَمَّا نَجّٰكُمْ اِلَى الْبَرِّ اَعْرَضْتُمْ ؕ وَ كَانَ الْاِنْسَانُ كَفُوْرًا ۝ اَفَاَمِنْتُمْ اَنْ يَّخْسِفَ بِكُمْ جَانِبَ الْبَرِّ اَوْ يُرْسِلَ عَلَيْكُمْ حَاصِبًا ثُمَّ لَا تَجِدُوْا لَكُمْ

وَ كِيْلًاo اَمْ اَمِنْتُمْ اَنْ يُّعِيْدَ كُمْ فِيْهِ تَارَةً اُخْرٰى فَيُرْسِلَ عَلَيْكُمْ قَاصِفًا مِّنَ الرِّيْحِ فَيُغْرِقَكُمْ بِمَا كَفَرْتُمْ ثُمَّ لَا تَجِدُوْا لَكُمْ عَلَيْنَا بِهٖ تَبِيْعًاo

''تمہارا حقیقی رب تو وہ ہے جو سمندر میں تمہاری کشتی چلاتا ہے تا کہ تم اسکا فضل تلاش کرو۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ تمہارے حال پر نہایت مہربان ہے جب سمندر میں تم پر مصیبت آتی ہے تو اس ایک سوا کے دوسرے جن جن کو تم پکارا کرتے ہو وہ سب گم ہو جاتے ہیں۔مگر جب وہ تم کو بچا کر خشکی پر پہنچا دیتا ہے تو تم اس سے منہ موڑ جاتے ہو۔انسان بڑا ہی ناشکرا ہے اچھا تو کیا تم اس بات سے بالکل بے خوف ہو کہ خدا کبھی خشکی پر تم کو زمین میں دھنسا دے یا تم پر پتھراؤ کرنے والی آندھی بھیج دے اور تم اس سے بچانے والا کوئی حمائتی نہ پاؤ؟ اور تمہیں کیا اس کا اندیشہ نہیں کہ خدا پھر کسی وقت سمندر میں تم کو لے جائے اور تمہاری ناشکری کے بدلے تم پر سخت طوفانی ہوا بھیج کر تمہیں غرق کر دے اور تم کو ایسا کوئی نہ ملے جو اس سے تمہارے اس انجام کی پوچھ گچھ کر سکے؟''

(سورۃ بنی اسرائیل : 66-69)

ہوسکتا ہے ایک انسان کو اس قسم کے عذاب سے پہلے کبھی نہ گزرنا پڑا ہو مگر اسے ہمیشہ یہ یاد رکھنا چاہئے کہ اسے کسی بھی وقت اس کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے۔چنانچہ انسان کو ہمیشہ اللہ کی یاد میں رہنا چاہئے کیونکہ اَنَّ الْقُوَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا ''ساری طاقتیں اور سارے اختیارات اللہ ہی کے قبضے میں ہیں''۔ (سورۃ البقرۃ : 165)

دوسری طرف جب ایک بار کوئی آفت نازل ہو جاتی ہے تو پھر انسان کو ہوسکتا ہے یہ موقعہ ہی نہ ملے کہ اب وہ اللہ کے سامنے توبہ کرلے اور اپنا سرکشی پر مبنی باغیانہ رویہ تبدیل کرنے پر رضامند ہو جائے۔موت یکا یک آسکتی ہے۔

اَوَ لَمْ يَنْظُرُوْا فِيْ مَلَكُوْتِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ مِنْ شَيْءٍ لا وَّ اَنْ عَسٰٓى اَنْ يَّكُوْنَ قَدِ اقْتَرَبَ اَجَلُهُمْ ج فَبِاَيِّ حَدِيْثٍۭ بَعْدَهٗ يُؤْمِنُوْنَo

''کیا ان لوگوں نے آسمان وزمین کے انتظام پر کبھی غور نہیں کیا اور کسی چیز کو بھی جو خدا نے پیدا کی ہے آنکھیں کھول کر نہیں دیکھا؟ اور کیا یہ بھی انہوں نے نہیں سوچا کہ شاید ان کی مہلت زندگی پوری ہونے کا وقت قریب آ لگا ہو؟ پھر آخر پیغمبر کی اس تنبیہ کے بعد اور کون سی ایسی بات ہو سکتی ہے جس پر یہ ایمان لائیں؟ (سورۃ الاعراف : 185)

اللہ کے رحم و کرم سے

فَكُلًّا اَخَذْنَا بِذَنْۢبِهٖ ۚ فَمِنْهُمْ مَّنْ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِ حَاصِبًا ۚ وَ مِنْهُمْ مَّنْ اَخَذَتْهُ الصَّيْحَةُ ۚ وَ مِنْهُمْ مَّنْ خَسَفْنَا بِهِ الْاَرْضَ ۚ وَمِنْهُمْ مَّنْ اَغْرَقْنَا ۚ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيَظْلِمَهُمْ وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ○

''آخر کار ہر ایک کو ہم نے اس کے گناہ میں پکڑا۔ پھر ان میں سے کسی پر ہم نے پتھراؤ کرنے والی ہوا بھیجی اور کسی کو ایک زبردست دھماکے نے آ لیا اور کسی کو ہم نے زمین میں دھنسا دیا اور کسی کو غرق کر دیا۔ اللہ ان پر ظلم کرنے والا نہ تھا مگر وہ خود ہی اپنے آپ پر ظلم کر رہے تھے''۔

(سورۃ العنکبوت : 40)

اب تک جو بات زیر بحث آئی اس کا مقصد ان لوگوں کو یہ یاد دلانا تھا کہ مقصد حیات کی اس اہم حقیقت کو کبھی فراموش نہ کریں: کہ ہر کرۂ ارض پر ہر شے کی موجودگی اللہ کی مرہون منت ہے' اس خالق کی جس نے پوری کائنات کو تخلیق کیا۔ دوسرے لفظوں میں ہر شے کا وجود اس وقت تک قائم رہ سکتا ہے جب تک اللہ ایسا چاہے۔ اس لئے کوئی شے بھی اللہ سے جدا نہیں رہ سکتی۔ قرآن ہمیں بتاتا ہے کہ کوئی بات بھی اللہ کے اختیار سے ماورا نہیں ہے:

وَاللّٰهُ غَالِبٌ عَلٰٓى اَمْرِهٖ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ○

''اللہ اپنا کام کر کے رہتا ہے مگر اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں''۔ (سورۃ یوسف: 21)

بیشک اللہ نے اس آیت کے دوسرے حصے میں یہ بات واضح کر دی ہے کہ لوگوں کی اکثریت اس سے واقف نہیں ہے۔ زندگی میں وہ یہ سمجھ بیٹھتے ہیں کہ کوئی عذاب یا مصیبت ان پر نازل نہیں ہوگی۔ انہوں نے یہ کبھی نہیں سوچا کہ آفاتِ دنیا میں سے کوئی کسی بھی وقت ان پر نازل ہو سکتی ہے کیونکہ یہ ان کی زد میں رہتے ہیں۔ ہم اس غلط فہمی کا شکار رہتے ہیں کہ جن ہولناک واقعات کا شکار لوگ رہتے ہیں ہم ان سے محفوظ رہیں گے۔ آفات' حادثات اور وبائی امراض کی خبریں بیشک ہمیں ان کا شکار ہونے والوں سے ہمدردی کرنے کا احساس دلاتی ہیں۔ ہم ان کا دکھ درد بھی بانٹتے ہیں مگر جونہی ہمارے ذہنوں سے وہ تباہ کاریاں اُتر جاتی ہیں ہم پھر بے نیاز ہو جاتے ہیں اور اس قسم کا روّیہ ہماری ختم ہو جانے والی دلچسپی کا حصہ بن جاتا ہے۔ ایک بار زندگی کے

جھمیلوں میں پھنس جانے کے بعد یا ذاتی مسائل میں گھر جانے کے نتیجے میں ہم بہت تیزی کے ساتھ دوسروں کے بارے میں فکرمندی چھوڑ دیتے ہیں اور جو لوگ کسی آفت کا شکار ہوئے تھے ان سے لاتعلقی کا مظاہرہ کرنے لگتے ہیں۔

مگر زندگی کے بارے میں یہ تصور کہ انسان کی زندگی کا ہر دِن یکساں ہوگا غلط تصور ہے۔ اللہ کے انتباہ سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے۔ یقیناً وہ لوگ جو مختلف تباہ کاریوں کے شکار ہوئے وہ یہ نہیں جانتے تھے کہ کوئی قدرتی آفت ان کی زندگیوں کو مکمل ابتری کا شکار کر دے گی۔ انہوں نے اس روز کا آغاز بھی یقیناً معمول کے مطابق کیا ہوگا اور یہ سوچا ہوگا کہ گذشتہ روز کی طرح یہ روز بھی امن وسکون سے گزرے گا۔ مگر یہ تو اس کے بالکل برعکس نکلا۔ غالباً انہوں نے یہ خیال کبھی نہ کیا تھا کہ کوئی ایک خاص دن ان کی زندگیوں میں اتنی بڑی تبدیلی لے آئے گا اور ان کی زندگی ایک خطرناک تگ ودو میں تبدیل ہو جائے گی۔ ایسے موقعوں پر زندگیاں اپنی اصل حقیقتوں اور سچائیوں کی طرف لوٹ آتی ہیں۔ یقیناً اللہ اسی طرح انسان کو یاد دلاتا ہے کہ تحفظ اسی دنیا میں ایک دھوکہ وفریب ہے۔

تاہم لوگوں کی اکثریت اس طرف توجہ نہیں دیتی۔ وہ یہ بھول ہی جاتے ہیں کہ زندگی مختصر اور عارضی ہے اور اس بات کو نظر انداز کر دیتے ہیں کہ ان کا حساب اللہ کے روبرو ہوگا اس عدم توجہی اور غفلت کا شکار ہو کر وہ اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے بجائے بیکار خواہشوں کی تکمیل میں زندگیاں گزار دیتے ہیں۔

اس نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو تکالیف اللہ کا رحم وکرم ہوتا ہے۔ اللہ اس دنیا کی اصل نوعیت ظاہر کرتا ہے اور آئندہ زندگی کیلئے تیاری کرنے میں انسان کی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔ اسی لئے جسے ہم بدنصیبی سمجھتے ہیں وہ دراصل اللہ کی طرف سے فراہم کیا گیا ایک موقعہ ہوتا ہے۔ یہ مواقع لوگوں کو اس لئے دیئے جاتے ہیں تاکہ وہ توبہ کر کے اپنے اعمال کو درست کرلیں۔ وہ سبق جو آفات اور تباہ کاریوں سے حاصل ہوتے ہیں ان کا ذکر قرآن پاک کی درج ذیل سورۃ میں اس طرح آیا ہے:

اَوَ لَا يَرَوْنَ اَنَّهُمْ يُفْتَنُوْنَ فِىْ كُلِّ عَامٍ مَّرَّةً اَوْ مَرَّتَيْنِ ثُمَّ لَا يَتُوْبُوْنَ وَلَا هُمْ يَذَّكَّرُوْنَ ۝

”کیا یہ لوگ دیکھتے نہیں کہ ہر سال ایک دو مرتبہ آزمائش میں ڈالے جاتے ہیں؟ مگر اس پر بھی نہ توبہ کرتے ہیں نہ کوئی سبق لیتے ہیں“۔ (سورۃ التوبہ : 126)

ماضی کی تہذیبیں

وَكَمْ اَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِنْ قَرْنٍ ط هَلْ تُحِسُّ مِنْهُمْ مِنْ اَحَدٍ اَوْ تَسْمَعُ لَهُمْ رِكْزًا٥

''ان سے پہلے ہم کتنی ہی قوموں کو ہلاک کر چکے ہیں۔ پھر آج کہیں تم ان کا نشان پاتے ہو' یا ان کی بھنک بھی کہیں سنائی دیتی ہے''؟ (سورۃ مریم : 98)

انسان کو اس دنیا میں آزمایا جاتا ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ اللہ نے بنی نوع انسان کی رہنمائی کیلئے اپنے پیغمبر مبعوث فرمائے اور اپنا کلام ان پیغمبروں کے ذریعے پیغامات کی شکل میں انسانوں تک پہنچایا۔ ان پیغمبران خدا اور آسمانی صحیفوں نے ہمیشہ انسان کو صراط مستقیم کی طرف بلایا' جسے اللہ کا راستہ کہا جاسکتا ہے۔ آج اللہ کی آخری کتاب' جو واحد ایسا آسمانی صحیفہ ہے جسمیں کوئی ترمیم اور تحریف نہیں کی گئی' قرآن کی شکل میں بنی نوع انسان کی رہنمائی کیلئے موجود ہے۔

قرآن پاک میں اللہ ہمیں اس بات سے مطلع فرماتا ہے کہ اس نے تمام انسانوں کو سیدھا راستہ دکھایا اور تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ یہ پیغمبران خدا لوگوں کو صراط مستقیم دکھاتے اور انہیں یوم حساب اور دوزخ کے بارے میں انتباہ کرتے رہے۔ تاہم ان لوگوں میں سے اکثریت نے ان پیغمبروں کی مخالفت کی جو اللہ نے ان کی طرف بھیجے تھے اور ان کیلئے عداوت و دشمنی کا مظاہرہ کیا۔ اس سرکشی و بغاوت کی بنا پر ان پر اللہ کا غضب نازل ہوا اور بہت جلد دنیا سے ان کا نام و نشان تک مٹا دیا گیا تھا۔ اسی حوالے سے ایک قرآنی سورۃ میں ربِ دوجہاں نے فرمایا:

وَ عَادًا وَّ ثَمُوْدَاْ وَ اَصْحٰبَ الرَّسِّ وَ قُرُوْنًا بَيْنَ ذٰلِكَ كَثِيْرًا ٥ وَ

كُلًّا ضَرَبْنَا لَهُ الْاَمْثَالَ ز وَ كُلًّا تَبَّرْنَا تَتْبِيْرًا o وَ لَقَدْ اَتَوْا عَلَى الْقَرْيَةِ الَّتِيْٓ اُمْطِرَتْ مَطَرَ السَّوْءِ ط اَفَلَمْ يَكُوْنُوْا يَرَوْنَهَا ج بَلْ كَانُوْا لَا يَرْجُوْنَ نُشُوْرًا o

''اسی طرح عاد اور ثمود اور اصحاب الرس اور بیچ کی صدیوں کے بہت سے لوگ تباہ کیے گئے۔ ان میں سے ہر ایک کو ہم نے (پہلے تباہ ہونے والوں کو) مثالیں دے دے کر سمجھایا اور آخر کار ہر ایک کو غارت کر دیا اور اس بستی پر تو ان کا گزر ہو چکا ہے جس پر بدترین بارش برسائی گئی تھی۔ کیا انہوں نے اس کا حال دیکھا نہ ہوگا؟ مگر یہ موت کے بعد دوسری زندگی کی توقع ہی نہیں رکھتے''۔ (سورۃ الفرقان : 38-40)

اگلی قوموں کی خبریں جو قرآن حکیم کے ایک بڑے حصے پر مشتمل ہیں' وحی کا ایک ایسا موضوع ہے جس پر غور و خوض کیا جانا چاہئے۔ ان کے تجربے سے جو سبق سیکھے جانے چاہئیں ان کا ذکر قرآن میں یوں آیا ہے:

اَلَمْ يَرَوْا كَمْ اَهْلَكْنَا مِنْ قَبْلِهِمْ مِّنْ قَرْنٍ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ مَالَمْ نُمَكِّنْ لَّكُمْ وَ اَرْسَلْنَا السَّمَآءَ عَلَيْهِمْ مِّدْرَارًا ص وَّجَعَلْنَا الْاَنْهٰرَ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهِمْ فَاَهْلَكْنٰهُمْ بِذُنُوْبِهِمْ وَ اَنْشَاْنَا مِنْۢ بَعْدِهِمْ قَرْنًا اٰخَرِيْنَ o

''کیا انہوں نے دیکھا نہیں کہ ان سے پہلے کتنی ایسی قوموں کو ہم ہلاک کر چکے ہیں جن کا اپنے اپنے زمانے میں دور دورہ ہے؟ ان کو ہم نے زمین میں وہ اقتدار بخشا تھا جو تمہیں نہیں بخشا ہے۔ ان پر ہم نے آسمان سے خوب بارشیں برسائیں اور ان کے نیچے نہریں بہا دیں (مگر جب انہوں نے کفرانِ نعمت کیا تو) آخر کار ہم نے ان کے گناہوں کی پاداش میں انہیں تباہ کر دیا اور ان کی جگہ دوسرے دور کی قوموں کو اُٹھایا''۔ (سورۃ الانعام : 6)

ایک اور قرآنی سورۃ میں اللہ ان لوگوں سے مخاطب ہے جو بات کو سمجھتے' انتباہ پر دھیان دیتے اور اس پر عمل کرتے ہیں:۔

وَكَمْ اَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِّنْ قَرْنٍ هُمْ اَشَدُّ مِنْهُمْ بَطْشًا فَنَقَّبُوْا فِي الْبِلَادِ ط هَلْ مِنْ مَّحِيْصٍ o اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَذِكْرٰى لِمَنْ كَانَ لَهٗ قَلْبٌ اَوْ اَلْقَى السَّمْعَ وَهُوَ شَهِيْدٌ o

''ہم ان سے پہلے بہت سی قوموں کو ہلاک کر چکے ہیں جو ان سے بہت زیادہ طاقتور تھیں اور دنیا کے ملکوں کو انہوں نے چھان مارا تھا۔ پھر کیا وہ کوئی جائے پناہ پا سکے؟ اس تاریخ میں عبرت کا سبق ہے ہر اُس شخص کیلئے جو دل رکھتا ہو یا جو توجہ سے بات کو سنے''۔ (سورۃ ق : 36-37)

اللہ قرآن پاک میں ہمیں بتاتا ہے کہ تباہی و بربادی کے یہ واقعات آنے والی نسلوں کیلئے انتباہ بننا چاہئیں۔ قرآن میں تقریباً جتنی بھی قدیم قوموں کی ہلاکت و تباہی کا ذکر فرمایا گیا وہ قابل شناخت ہیں۔ قدیم دستاویزات اور آثار قدیمہ کے شعبے نے بہت سی چیزیں محفوظ کر لی ہیں جن کا آج بھی مطالعہ کیا جا سکتا ہے مگر پھر بھی قرآن میں ان نشانات کا جائزہ لیتے وقت ان باتوں کو محض تاریخی اور سائنسی تناظر میں دیکھنا بہت بڑی غلطی ہوگی۔ جیسا کہ درج ذیل سورۃ میں بیان فرمایا گیا کہ ان واقعات میں سے ہر ایک کی حیثیت ایک انتباہ کی ہے جس سے سبق حاصل کیا جانا چاہئے:

فَجَعَلْنٰهَا نَكَالًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهَا وَمَا خَلْفَهَا وَ مَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِيْنَ ٥

''اس طرح ہم نے ان کے انجام کو اس زمانے کے لوگوں اور بعد کی آنے والی نسلوں کے لئے عبرت اور ڈرنے والوں کیلئے نصیحت بنا کر چھوڑا''۔ (سورۃ البقرۃ : 66)

ہمیں ایک اور اہم حقیقت پر ضرور غور کرنا چاہئے: وہ قومیں جنہوں نے اللہ کی نافرمانی کی ان پر اچانک عذاب نازل نہیں ہوا۔ اللہ نے پہلے ان کے انتباہ کیلئے اپنے پیغمبر بھیجے تا کہ وہ اپنے رویئے پر نادم ہوں اور اللہ کے سامنے سر تسلیم خم کر دیں۔ اور یہ کہ وہ تمام مصائب جو انسان پر گرتے ہیں دراصل آخرت کی سخت سزا کی یاددہانی ہیں، جس کا ذکر قرآن میں یوں آیا ہے:

وَلَنُذِيْقَنَّهُمْ مِّنَ الْعَذَابِ الْاَدْنٰى دُوْنَ الْعَذَابِ الْاَكْبَرِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ٥

''اس بڑے عذاب سے پہلے ہم اسی دنیا میں (کسی نہ کسی چھوٹے) عذاب کا مزہ انہیں چکھاتے رہیں گے شاید کہ یہ (اپنی باغیانہ روش سے) باز آ جائیں''۔ (سورۃ السجدۃ: 21)

جب لوگوں نے ان تنبیہات پر دھیان نہ دیا اور ان کی کجروی میں اضافہ ہو گیا تو اکثر و بیشتر ان پر عذاب نازل ہوئے۔ ان سب قوموں پر اللہ کا عذاب نازل ہوا اور وہ تاریخ کے صفحات سے ہمیشہ کیلئے مٹا دی گئیں۔ اللہ ان کی جگہ دوسری نسلوں کو لے آیا تھا۔ ان لوگوں پر اللہ کے انعامات نازل ہوئے۔ انہوں نے خوشحال اور مطمئن زندگی گزاری، ہر طرح کی خوشیاں حاصل کیں مگر

دنیاوی کاموں میں مصروف ہو کر یہ اللہ کی یاد سے غافل ہو گئے۔ وہ یہ بھول ہی گئے تھے کہ اس دنیا کی ہر شے عارضی اور مٹ جانے والی ہے۔ وہ اپنی موجودہ زندگی کے شب و روز میں مست تھے اور موت اور اس کے بعد کی زندگی کے بارے میں کبھی نہ سوچتے تھے۔ وہ اسی دنیا کی زندگی کو دائمی زندگی سمجھ بیٹھے تھے۔ حالانکہ اصل دائمی زندگی تو موت کے بعد حاصل ہوتی ہے۔ اس نقطہ نظر نے انہیں کوئی فائدہ نہ پہنچایا مگر تاریخ میں ان کی تباہی و بربادی کا ذکر بڑی تفصیل سے ملتا ہے۔ آج ہزاروں برس گزر جانے کے باوجود ان کی یاد ایک انتباہ کے طور پر موجود ہے جو موجودہ نسلوں کو یاد دلا رہا ہے کہ وہ لوگ جو اپنے خالق کے بتائے ہوئے راستے سے ہٹ جاتے ہیں ان کا انجام کیا ہوتا ہے۔

ثمود

ثمود کا شمار ان قوموں میں ہوتا ہے جنہوں نے اللہ کے انتباہ کی پرواہ نہ کی اور وحی کے خلاف سرکشی و گستاخی کرنے کی بنا پر انہیں ہلاک کر دیا گیا تھا۔ قرآن پاک میں بتایا گیا ہے کہ اہل ثمود خوشحال زندگی بسر کر رہے تھے، وہ طاقتور بھی تھے اور مختلف فنون میں اعلیٰ مہارت رکھتے تھے۔

وَاذْكُرُوٓا اِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَآءَ مِنْۢ بَعْدِ عَادٍ وَّبَوَّاَكُمْ فِى الْاَرْضِ تَتَّخِذُوْنَ مِنْ سُهُوْلِهَا قُصُوْرًا وَّ تَنْحِتُوْنَ الْجِبَالَ بُيُوْتًا ۚ فَاذْكُرُوٓا اٰلَآءَ اللّٰهِ وَلَا تَعْثَوْا فِى الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ ○

”یاد کرو وہ وقت جب اللہ نے قوم عاد کے بعد تمہیں اس کا جانشین بنایا اور تم کو زمین میں یہ منزلت بخشی کہ آج تم اس کے ہموار میدانوں میں عالیشان محل بناتے ہو اور اس کے پہاڑوں کو مکانات کی شکل میں تراشتے ہو۔ پس اس کی قدرت کے کرشموں سے غافل نہ ہو جاؤ اور زمین میں فساد برپا نہ کرو“۔ (سورۃ الاعراف : 74)

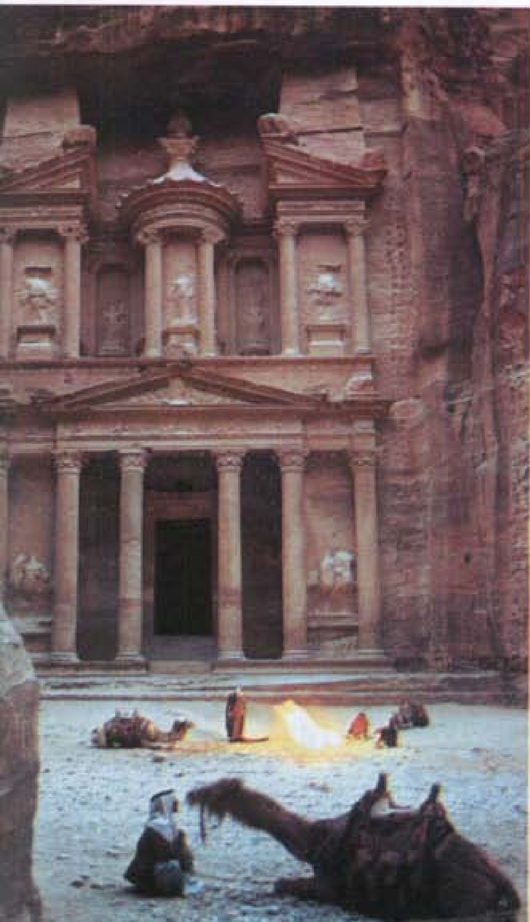
ایک اور قرآنی سورۃ میں ثمود کے سماجی ماحول کا ذکر یوں آیا ہے:

اَتُتْرَكُوْنَ فِىْ مَا هٰهُنَآ اٰمِنِيْنَ ○ فِىْ جَنّٰتٍ وَّ عُيُوْنٍ ○ وَّ زُرُوْعٍ وَّ نَخْلٍ طَلْعُهَا هَضِيْمٌ ○ وَ تَنْحِتُوْنَ مِنَ الْجِبَالِ بُيُوْتًا فٰرِهِيْنَ ○

”کیا تم ان سب چیزوں کے درمیان جو یہاں ہیں بس یونہی اطمینان سے رہنے دیے جاؤ

گے؟ ان باغوں اور چشموں میں' ان کھیتوں اور نخلستانوں میں جن کے خوشے رس بھرے ہیں۔ تم پہاڑ کھود کھود کر فخر یہ ان میں عمارتیں بناتے ہو"۔ (سورۃ الشعراء: 146-149)

مال واسباب کی فراوانی کے باعث قوم ثمود پرتعیش زندگی گزار رہی تھی اور اسراف کرتی تھی۔ قرآن ہمیں بتاتا ہے کہ اللہ نے اپنے پیغمبر حضرت صالحؑ کو بھیجا تا کہ اہل ثمود کو تنبیہ کی جا سکے۔ حضرت صالح قوم ثمود میں مشہور تھے۔ ان لوگوں کے وہم وگمان میں بھی نہ تھا کہ یہ شخص سچے مذہب کی تبلیغ کرے گا۔ چنانچہ جب حضرت صالح نے ان لوگوں کو گمراہی سے باز رہنے کی تلقین کی تو انہیں بڑی حیرت ہوئی۔ قوم ثمود میں سے چند افراد نے حضرت صالحؑ کی دعوت پر لبیک کہا مگر دوسرے لوگوں نے ان کی بات پر کان نہ دھرے۔ خاص طور پر سردارانِ قوم نے ان کی بات ماننے



اپنی دو ہزار سالہ تاریخ پر فخر کرنے والی قوم ثمود نے ایک دوسری عرب قوم' Nabataeans کے ساتھ ایک بادشاہت قائم کر لی تھی۔ آج وادیٔ روم میں جسے اردن میں وادیٔ پطرا (Petra Valley) کہا جاتا ہے ان لوگوں کے ہاتھوں سے پتھروں کو تراش کر بنائی ہوئی تصویریں دیکھی جا سکتی ہیں۔ قرآن میں بھی جہاں اہل ثمود کا ذکر آیا ہے وہاں ان کی اس کام میں مہارت کا تذکرہ موجود ہے۔

وْٓا اِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَآءَ مِنْۢ بَعْدِ عَادٍ
ـمْ فِي الْاَرْضِ تَتَّخِذُوْنَ مِنْ سُهُوْلِهَا
رًا وَّ تَنْحِتُوْنَ الْجِبَالَ بُيُوْتًا ج
رُوْٓا اٰلَآءَ اللّٰهِ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْاَرْضِ
يْنَ ○

وہ وقت جب اللہ نے قوم عاد کے بعد تمہیں اس
ں بنایا اور تم کو زمین میں یہ منزلت بخشی کہ آج تم
ہموار میدانوں میں عالیشان محل بناتے اور اس
ڑوں کو مکانات کی شکل میں تراشتے ہو۔ پس اس
ت کے کرشموں سے غافل نہ ہو جاؤ اور زمین میں
نہ کرو"۔ (سورۃ الاعراف:74)

سے انکار کر دیا تھا اور آپ کے دشمن ہو گئے تھے یہ ان لوگوں کو اذیتیں دیتے جو حضرت صالح کی تبلیغ پر ایمان لے آئے تھے وہ پیغمبر خدا کے خلاف ہو گئے تھے جو انہیں اللہ کی عبادت کیلئے بلاتے تھے یہ غیض وغضب صرف اہل ثمود تک ہی محدود نہ تھا۔ یہ لوگ اسی غلطی کا اعادہ کر رہے تھے جو قوم نوحؑ اور قوم عاد نے کی تھی جو تاریخ میں ان سے پہلی گزری تھیں۔ اسی لئے قرآن حکیم میں ان تینوں قوموں کا ذکر اس طرح آیا ہے:

اَلَمۡ يَاۡتِكُمۡ نَبَؤُا الَّذِيۡنَ مِنۡ قَبۡلِكُمۡ قَوۡمِ نُوۡحٍ وَّ عَادٍ وَّ ثَمُوۡدَ ۛ وَ الَّذِيۡنَ مِنۡۢ بَعۡدِهِمۡ ۛ لَا يَعۡلَمُهُمۡ اِلَّا اللّٰهُ ؕ جَآءَتۡهُمۡ رُسُلُهُمۡ بِالۡبَيِّنٰتِ فَرَدُّوۡۤا اَيۡدِيَهُمۡ فِىۡۤ اَفۡوَاهِهِمۡ وَ قَالُوۡۤا اِنَّا كَفَرۡنَا بِمَاۤ اُرۡسِلۡتُمۡ بِهٖ وَ اِنَّا لَفِىۡ شَكٍّ مِّمَّا تَدۡعُوۡنَنَاۤ اِلَيۡهِ مُرِيۡبٍ ○

"کیا تمہیں ان قوموں کے حالات نہیں پہنچے جو تم سے پہلے گزر چکی ہیں؟ قوم نوحؑ، عاد، ثمود اور ان کے بعد آنے والی بہت سی قومیں جن کا شمار اللہ ہی کو معلوم ہے۔ ان کے رسول جب ان کے پاس صاف صاف باتیں اور کھلی کھلی نشانیں لئے ہوئے آئے تو انہوں نے اپنے منہ میں ہاتھ دبائے اور کہا کہ جس پیغام کے ساتھ تم بھیجے گئے ہو ہم اس کو نہیں مانتے اور جس چیز کی تم ہمیں دعوت دیتے ہو اس کی طرف سے ہم سخت خلجان آمیز شک میں پڑے ہوئے ہیں"۔ (سورۃ ابراہیم : 9)

اہل ثمود نے گستاخی کا تہیہ کر رکھا تھا اور انہوں نے حضرت صالحؑ سے اپنا رویہ کبھی صحیح نہیں کیا تھا۔ بلکہ وہ تو اس پیغمبر خدا کو جان سے مار ڈالنے کے درپے تھے۔ حضرت صالحؑ نے انہیں متنبہ کرتے ہوئے فرمایا:

اَتُتۡرَكُوۡنَ فِىۡ مَا هٰهُنَاۤ اٰمِنِيۡنَ ○

"کیا تم ان سب چیزوں کے درمیان جو یہاں ہیں بس یوں ہی اطمینان سے رہنے دیئے جاؤ گے؟" (سورۃ الشعراء : 146)

اہل ثمود نے جو اللہ کی طرف سے دی جانے والی سزا سے بے خبر تھے اپنی گمراہی میں اضافہ کر لیا تھا۔ وہ حضرت صالحؑ سے نہایت غرور و تکبر اور خوشی سے بولے: يٰصٰلِحُ ائۡتِنَا بِمَا تَعِدُنَاۤ اِنۡ كُنۡتَ مِنَ الۡمُرۡسَلِيۡنَ ○ "اے صالح! لے آؤ وہ عذاب جس کی تم ہمیں دھمکی دیتے ہو" (سورۃ الاعراف:77)۔ حضرت صالحؑ نے اللہ کی طرف سے موصول ہونے والی وحی کی

روشنی میں ان سے کہا کہ وہ تین روز میں تباہ و برباد ہو جائیں گے' تین روز بعد حضرت صالحؑ کی پیشینگوئی درست ثابت ہوئی اور قوم ثمود تباہ ہوگئی۔

وَاَخَذَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوا الصَّيْحَةُ فَاَصْبَحُوْا فِيْ دِيَارِهِمْ جٰثِمِيْنَ o كَاَنْ لَّمْ يَغْنَوْا فِيْهَا ط اَلَآ اِنَّ ثَمُوْدَاۡ كَفَرُوْا رَبَّهُمْ ط اَلَا بُعْدًا لِّثَمُوْدَ o

''ایک سخت دھماکے نے ان کو دھر لیا اور وہ اپنی بستیوں میں اس طرح بے حس و حرکت پڑے کے پڑے رہ گئے گویا وہ وہاں کبھی بسے ہی نہ تھے۔ سنو! ثمود نے اپنے ربّ سے کفر کیا۔ سنو! دور پھینک دیئے گئے ثمود''۔ (سورۃ ھود : 67-68)

اہل ثمود کو بڑی کڑی سزا ملی' انہوں نے پیغمبر کا حکم نہ مانا تھا اس لئے انہیں اللہ نے تباہ کر دیا تھا وہ عمارات جو انہوں نے تعمیر کی تھیں اور صناعی کے جو شاہکار تراشے تھے کوئی بھی تو ان کو اللہ کے عذاب سے نہ بچا سکے۔ ثمود کو بھی اس سے پہلے اور بعد کی نافرمان اور سرکش قوموں کی طرح تباہ و برباد کر دیا گیا تھا۔ درحقیقت جیسا ان کا رویہ تھا یا جیسا ان کا عمل تھا ویسی ہی انہیں سزا ملی۔ وہ جنہوں نے اللہ کے خلاف بغاوت کی انہیں تباہ و برباد کر دیا گیا اور وہ جو فرمانبردار تھے انہیں دائمی نجات سے نواز دیا گیا تھا۔

قوم سبا

قوم سبا (جسے بائبل میں شیبا لکھا گیا ہے) کا ذکر قرآن پاک میں اسطرح آیا ہے:

لَقَدْ كَانَ لِسَبَاٍ فِيْ مَسْكَنِهِمْ اٰيَةٌ ج جَنَّتٰنِ عَنْ يَّمِيْنٍ وَّ شِمَالٍ ۵ كُلُوْا مِنْ رِّزْقِ رَبِّكُمْ وَاشْكُرُوْا لَهٗ ط بَلْدَةٌ طَيِّبَةٌ وَّ رَبٌّ غَفُوْرٌ o فَاَعْرَضُوْا فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ سَيْلَ الْعَرِمِ وَ بَدَّلْنٰهُمْ بِجَنَّتَيْهِمْ جَنَّتَيْنِ ذَوَاتَيْ اُكُلٍ خَمْطٍ وَّاَثْلٍ وَّ شَيْءٍ مِّنْ سِدْرٍ قَلِيْلٍ o

''سبا کیلئے ان کے اپنے مسکن ہی میں ایک نشانی موجود تھی۔ دو باغ دائیں اور بائیں۔ کھاؤ اور اپنے ربّ کا رزق اور شکر بجالاؤ اس کا' مالک ہے عمدہ و پاکیزہ اور پروردگار ہے بخشش فرمانے والا' مگر وہ منہ موڑ گئے آخر کار ہم نے ان پر بند توڑ سیلاب بھیج دیا اور ان کے پچھلے دو باغوں کی جگہ دو اور باغ انہیں دیئے جن میں کڑوے کسیلے پھل اور جھاؤ کے درخت تھے اور کچھ تھوڑی سی

بیریاں۔ یہ تھا ان کے کفر کا بدلہ جو ہم نے ان کو دیا اور ناشکرے انسان کے سوا ایسا بدلہ ہم اور کسی کو نہیں دیتے''۔ (سورۃ سبا: 15-17)

جیسا کہ مذکورہ آیات میں بتایا گیا ہے قوم سبا ایک ایسے علاقے میں آباد تھی جس میں سرسبز و خوبصورت پھلدار درختوں والے باغات تھے۔ ایک ایسے ملک میں جہاں کے لوگوں کا معیارِ زندگی اسقدر بلند ہو اور حالات اتنے اچھے، انہیں تو اللہ کا مطیع و فرمانبردار اور شکر گزار بن کر رہنا چاہیے تھا۔ مگر جیسا کہ اس سورۃ میں بیان فرمایا گیا وہ لوگ ''اللہ سے منہ موڑ گئے تھے''۔ انہوں نے دعویٰ یہ کیا تھا کہ وہ اس ساری خوشحالی کے حق دار تھے اور انہوں نے یہ سب کچھ خود بنایا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اللہ نے سب کچھ واپس لے لیا۔ جیسا کہ اسی قرآنی سورۃ میں بتایا گیا کہ ایک ''بند توڑ سیلاب'' نے پورے ملک کو نیست و نابود کر دیا تھا۔

سمیری قوم کے جاہ و جلال والے لوگ

سمر شہری مملکتوں کا مجموعہ تھا جو دجلہ و فرات کے نچلے حصے کے گرد آباد تھیں، اس علاقے کو آج کل جنوبی عراق کہا جاتا ہے۔ آج کے اس دور میں اگر کوئی شخص جنوبی عراق کا سفر کرے تو اسے



مآرب ڈیم نہایت ترقی یافتہ ٹیکنالوجی کا نمونہ تھا۔ مگر یہ ڈیم ٹوٹ گیا تھا اور ''بند توڑ سیلاب'' نے قوم سبا اور ان کی سرزمین کو تاراج اور ویران کر دیا تھا۔

جو قطعہ زمین زیادہ دور تک نظر آئے گا وہ وسیع صحرا پر مشتمل ہے۔ زمین کا زیادہ حصہ، سوائے شہروں کے، جہاں اب جنگلات اُگائے گئے ہیں، ریت سے ڈھکا ہوا ہے۔ یہ صحرا جو کبھی سمیریوں کا وطن تھا، ہزاروں برسوں سے وہاں موجود ہیں۔ ان کا عظیم ملک جو کبھی عظمتوں کا نشان تھا اب صرف نصابی کتب کے اوراق میں دفن ہو کر رہ گیا ہے۔ یہ کسی زمانے میں اسی قدر ایک حقیقت کے طور پر آباد



ملکہ پوابی (Queen Puabi) کو ہو سکتا ہے دفن تو اس کے ان خزانوں سمیت کیا گیا ہو جنکا شمار ممکن نہ تھا مگر یہ سب کچھ اس کے جسم کو ایک پنجر میں بدل جانے سے نہ روک سکے۔

تھا جس طرح اس کی ہمعصر کوئی دوسری تہذیب۔ سمیری اسی طرح زندہ تھے جس طرح آج ہم زندہ ہیں۔ انہوں نے فن تعمیر کے شاہکار تخلیق کیئے۔ ایک طرح سے وہ عالیشان اور شاندار شہر جو سمیریوں نے تعمیر کیئے تھے وہ ہمارے دور کے ثقافتی ورثے کا ایک حصہ ہیں۔

سمیریوں کے ثقافتی ورثے میں سے جو کچھ باقی بچا ہے اسمیں ہماری معلومات ملکہ پوابی کے بارے میں یہ ہے کہ یہ ان کی مشہور ملکہ تھی جس کی تدفین کا بہت بڑا انتظام کیا گیا تھا۔ بہت سے ایسے تاریخی ماخذ موجود ہیں جن میں اس بارے میں تفصیلات قلمبند کی گئی ہیں۔ ان سے ہمیں پتہ چلتا ہے کہ اس ملکہ کے جسم کو مرنے کے بعد غیر معمولی طریقے سے بناؤ سنگار دیا گیا تھا۔ اسے ایک ایسے کپڑے میں لپیٹا گیا تھا جسے سونے چاندی کے دھاگوں سے اور قیمتی پتھروں سے تیار کیا گیا تھا۔ اس پر ہیرے موتیوں کی جھالریں لگائی گئی تھیں۔ اس کے مردہ سر پر ایک تاج سجایا گیا تھا جس میں سونے کی پتیاں جڑی ہوئی تھیں۔ قبر کے اندر کافی مقدار میں سونا بھی رکھا گیا تھا۔

مختصر یہ کہ سمیری تاریخ میں جس ملکہ کا بڑا نام ہے اسے بہت بڑے خزانے سمیت دفن کیا گیا تھا۔ اس خزانے کو قبر تک پہچانے کیلئے بیشمار محافظین اور خدام لگائے گئے تھے۔ جس ملکہ کو اتنے بڑے خزانے کے ساتھ دفن کیا گیا تھا وہ خزانہ بھی اس کے جسم کو محفوظ نہ رکھ سکا جو گل سڑ کر ایک پنجر رہ گیا تھا۔

اپنی سلطنت میں جن لوگوں سے ملکہ ان کی غربت کی وجہ سے نفرت کرتی تھی ان کی طرح اس کا جسم بھی قبر کے اندر گل سڑ گیا تھا اور اب وہاں تعفن پیدا کرنے والے جرثوموں کے سوا کچھ نہ تھا۔ یہ ایک متاثر کرنے والی مثال ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ اس دنیا کی دولت اور املاک ایک تباہ کن انجام سے تحفظ کی ضمانت نہیں دے سکتیں۔

منونز نامی لوگ (The Minoans)

یہ لوگ یونانی جزیرے کریٹ (Crete) کی تہذیب سے تعلق رکھتے تھے جو 3000-1100 قبل مسیح میں یہاں پھلی پھولی۔ خشکی اور سمندر سینکڑوں برسوں تک پرسکون رہتے ہیں۔ پھر اچانک کہیں سے زمین پھٹ جاتی ہے اور لاوا سیلاب کی شکل میں بہہ نکلتا ہے۔ ایسی کسی آفت کا ذکر غالباً قدیم تھیرا (Thera) کی تباہی کے سوا کسی اور کا نہیں ملتا۔ تاریخ میں

سب سے بڑا آتش فشاں یہاں پھٹا تھا۔ آج سے 3500 برس قبل آتشی لاوے نے بحر ایجین (Aegean Sea) کے اندر ایک میل فضا میں اچھل کر دس میل چوڑا جزیرہ پیدا کر دیا تھا۔ وہاں ایک مشہور تہذیب نے جنم لیا جس کا مرکز یونان کے جزیرے کریٹ میں ستر میل جنوب میں تھا۔ اس کی چوٹی پر غالباً 30,000 افراد تھیرا (Thera) کے بڑے شہر اکروتری (Akrotiri) میں بستے تھے۔ یہاں شاندار محلات تعمیر کئے گئے جن کی دیواروں اور چھتوں پر نقش و نگار بنائے جاتے تھے۔ بحری جہاز سامان تجارت لے کر جاتے تھے۔ سکالر بھی موجود تھے البتہ صحیح صحیح ماہ و سال کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔ ایک اندازے کے مطابق یہ 1470-1628 بی سی ای کا زمانہ تھا۔ ان سکالرز کو واقعات کی ترتیب کا علم تھا۔ پہلے ہلکے جھٹکے محسوس ہوئے پھر ایک شدید زلزلہ آیا اور اس کے بعد اسقدر دھماکے کی آواز آئی جسے سکینڈے نیویا (ناروے، سویڈن اور ڈنمارک کے علاقے) خلیج فارس اور کوہ جبرالٹر تک سنا گیا تھا۔ پانی کی اُونچی اُونچی لہریں ہوا میں بلند ہوئی تھیں۔ ان سے Knossos کی بندرگاہ Amnisos تباہ ہو گئی تھی۔ آج ان عالیشان محلات کے صرف کھنڈرات دکھائی دیتے ہیں۔ منون تہذیب (Minoan Civilization) اپنے عہد کی تہذیبوں میں سے ایک تھی جس نے غالباً اس قسم کی تباہی و بربادی کا کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا۔ یہ لوگ جن کو مال و دولت پر بڑا غرور تھا ان کی ہر شے تباہ ہو گئی تھی۔ اللہ تعالیٰ قرآن پاک میں ارشاد فرماتا ہے کہ معاصر معاشروں کو چاہئے کہ ایسی قدیم تہذیبوں کے ہولناک انجام پر غور و فکر کیا کریں۔

اَوَلَمْ يَهْدِ لَهُمْ كَمْ اَهْلَكْنَا مِنْ قَبْلِهِمْ مِّنَ الْقُرُوْنِ يَمْشُوْنَ فِيْ مَسٰكِنِهِمْ ط اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ ط اَفَلَا يَسْمَعُوْنَ o

''اور کیا ان لوگوں کو (ان تاریخی واقعات میں) کوئی ہدایت نہیں ملی کہ ان سے پہلے کتنی قوموں کو ہم ہلاک کر چکے ہیں جن کے رہنے کی جگہوں میں آج یہ چلتے پھرتے ہیں؟ اسمیں بڑی نشانیاں ہیں کیا یہ سنتے نہیں ہیں؟'' (سورۃ السجدۃ : 26)

پمپائی (Pompeii) کی بربادی

مؤرخین کے لئے پمپائی کے کھنڈرات اس بات کی تصدیق کرتے ہیں کہ یہاں کبھی فسق و فجور پھیلا ہوا تھا۔ یہاں تک کہ پمپائی کی گلیاں اس بات کی علامت ہیں کہ سلطنت روما تباہ و برباد

ہوئی ہے۔ اس شہر میں بسنے والے لوگوں کے کبھی یہاں قہقہے بلند ہوتے تھے۔ اس شہر کی مصروف گلیوں میں میخانے' شبینہ کلب اور قحبہ خانے تھے۔ آج بھی اس شہر کی تباہی و بربادی کے نشانات نظر آتے ہیں۔

اس سرزمین پر جہاں اب آتش فشانی راکھ ہی راکھ نظر آتی ہے یہاں کبھی سرسبز و شاداب کھیتیاں تھیں' انگوروں کے باغات اور پارک تھے' پمپائی کا محل وقوع یہ تھا کہ یہ شہر Vesuvius اور سمندر کے درمیان آباد تھا۔ یہاں مالدار رومیوں نے موسم گرما میں اپنے رہنے کیلئے گھر بنائے ہوئے تھے کیونکہ اسے ایک صحت افزاء سرد مقام کی حیثیت حاصل تھی اور وہ گرم پایہ تخت سے اس پُر فضا اور صحت افزا شہر میں یہاں آ جاتے تھے۔ مگر پمپائی کو ایک آتش فشاں کے پھٹنے سے تاریخ کی ایک بہت بڑی تباہی و بربادی کا بھی سامنا کرنا پڑا تھا۔ اس نے اس شہر کو صفحہ ہستی سے مٹا دیا تھا۔ آج یہاں شہر کے کھنڈرات باقی رہ گئے ہیں۔ کوہ وسوویس (Vesuvius) پر پھیلے ہوئے زہریلے دھوئیں سے دم گھٹتا ہے۔ ان سے رومی طرزِ زندگی کی عکاسی ہوتی ہے۔ اس تباہی و بربادی نے پمپائی کے ساتھ ہمسایہ شہر ہرکلونیم (Herculaneum) کو بھی تباہ کر دیا تھا۔ یہ موسم گرما کا ایک دن تھا جب امیر رومی موسم گرما گزارنے اس صحت افزاء مقام پر آئے ہوئے تھے کہ تباہی و بربادی نے انہیں آ لیا تھا۔

یہ واقعہ 24 اگست 79 سی ای کو پیش آیا تھا۔ موقعہ پر کی گئی تحقیق سے پتہ چلا کہ لاوا وقفے وقفے سے پھوٹا تھا۔ آتش فشاں کے پھٹنے سے قبل اس علاقے میں کئی جھٹکے محسوس کئے گئے تھے۔ ان زلزلوں کے ساتھ کافی فاصلے سے آنے والی گونجدار اور خوفناک آوازیں بھی سنائی دی تھیں۔ پہلے مرحلے میں کوہ وسوویس نے بھاپ اور راکھ اُگلنی شروع کی تھی۔ پھر آتش فشاں کے پھٹنے سے پرانی چٹانوں کے ٹکڑے گدلے بادلوں کے ساتھ فضا میں اُڑتے ہوئے نظر آئے تھے۔ ان میں آتش فشاں کا سنگی مادہ جو آئینے کی مانند صاف و شفاف تھا اور تازہ تازہ اُبل کر باہر آیا تھا کئی ملین ٹن وزن کے ساتھ ہوا میں پھیل گیا تھا۔ ہوائیں راکھ کے بادلوں کو اپنے دوش پر اُٹھائے پمپائی کی طرف لے گئی تھیں جہاں چھوٹے چھوٹے پتھروں کے ریزے گرنے شروع ہو گئے تھے۔ جب شہر پر سورج کی تمازت سے بچنے کے استعمال ہونے والے ایک شامیانے جیسی چادر تن گئی تو آتش فشاں کا سنگی مادہ اور راکھ بارش کی صورت میں پمپائی پر برسنے لگا تھا۔ اس کے ایک جگہ جمع ہو جانے

کی شرح چھ انچ فی گھنٹہ تھی۔ ایک اور شہر ہرکلونیم کوہ وسوویس کے بالکل قریب تھا۔ لاوے کی اس تباہ کن لہر کو دیکھتے ہی شہر کے لوگ خوف و ہراس میں وہاں سے بھاگنا شروع ہو گئے تھے جو گرجتی ہوئی ان کی جانب بڑھ رہی تھی۔ جو لوگ فوری طور پر شہر نہ چھوڑ سکے تھے انہیں اپنی اس تاخیر پر افسوس کرنے کی مہلت ہی موت نے نہ دی تھی۔ آتش فشاں سے خارج ہونے والے مادے کی لہر نے اس شہر میں پہنچ کر لوگوں کو موت کا لقمہ بنا ڈالا تھا۔ جبکہ ایک سست رفتار لہر نے شہر کو چاروں طرف سے گھیر لیا تھا اور یوں یہ شہر دفن ہو گیا تھا۔ پمپائی میں جب کھدائی کی گئی تو پتہ چلا کہ اس شہر کے بہت سے لوگ سوچتے ہی رہ گئے تھے کہ اپنے گھروں کو چھوڑ کر بھاگ جائیں یا نہیں۔ ان کا خیال تھا کہ وہ خطرے سے باہر تھے کیونکہ پمپائی آتش فشاں کے دہانے سے دور تھا۔ اسی لئے اس شہر کے بہت سے امراء نے گھر نہیں چھوڑے تھے بلکہ گھروں اور دوکانوں میں پناہ لے لی تھی ان کا خیال تھا کہ یہ طوفان جلد گزر جائے گا۔ جب تک انہیں تاخیر کا احساس ہوا وہ تباہ ہو چکے تھے۔ صرف ایک روز میں پمپائی اور ہرکلونیم جیسے دو شہر اور چھ ملحقہ دیہات صفحۂ ہستی سے مٹ چکے تھے۔ قرآن میں بتایا گیا ہے کہ اس قسم کے واقعات تمام انسانوں کیلئے ایک یاددہانی ہوتی ہے:

ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْقُرٰى نَقُصُّهٗ عَلَيْكَ مِنْهَا قَآئِمٌ وَّ حَصِيْدٌ۝

''یہ چند بستیوں کی سرگزشت ہے جو ہم تمہیں سنا رہے ہیں۔ ان میں سے بعض اب بھی کھڑی ہیں اور بعض کی فصل کٹ چکی ہے (وقت کی درانتی سے)'' (سورۃ ھود: 100)

کئی صدیاں گزرنے کے بعد تک یہ ممکن نہ تھا کہ پمپائی کے رازوں پر سے پردہ ہٹایا جا سکے۔ تاہم اس قدیم شہر کی کھدائیوں کے دوران کچھ نشانیاں ایسی دستیاب ہوئیں جو ان لوگوں کی روزمرہ زندگی کی واضح نمائندگی کرتی تھیں۔ بہت سے ایسے لوگوں کی دردناک اور ہولناک شکلیں محفوظ کر دی گئی تھیں جو اس عذاب سے گزرے تھے۔ اس سے متعلق قرآن پاک کی درج ذیل سورۃ میں اس طرح ذکر فرمایا گیا ہے:

وَ كَذٰلِكَ اَخْذُ رَبِّكَ اِذَآ اَخَذَ الْقُرٰى وَهِيَ ظَالِمَةٌ ؕ اِنَّ اَخْذَهٗۤ اَلِيْمٌ شَدِيْدٌ۝

''اور تیرا ربّ جب کسی ظالم بستی کو پکڑتا ہے تو پھر اس کی پکڑ ایسی ہی ہوا کرتی ہے۔ فی الواقع اس کی پکڑ بڑی سخت اور دردناک ہوتی ہے''۔ (سورۃ ھود: 102)



شہر پمپائی (Pompeii) جو کبھی شان
وشوکت اور خوبصورتی میں اپنی مثال
آپ تھا اس طرح تباہ و برباد ہوا کہ
اس میں بسنے والے بیس ہزار انسان بھی
لقمہ اجل بن گئے۔

آج ایسے کھنڈرات موجود ہیں جو ان بڑی تہذیبوں کے غرور و تکبر کا منہ بولتا ثبوت ہے جو آج سے سینکڑوں بلکہ ہزاروں برس قبل خوب پھلی پھولی تھیں۔ بڑے بڑے شہر تعمیر کرنے والے بہت سے معمار، جن کا تعلق تاریخ کے مختلف ادوار سے ہے آج بے نام ہیں۔ ان کی دولت، ٹیکنالوجی یا صناعی کے شاہکار انہیں ایک تلخ انجام سے نہ بچا سکے۔ وہ خود تو اپنے مال و دولت سے











پمپائی کے بہت سے باشندوں کی دردناک اور اذیت بھری صورتوں کو قدرت نے محفوظ کر لیا تھا تاکہ آنے والی نسلوں کیلئے درسِ عبرت ہو۔

فائدہ نہ اُٹھا سکے البتہ آنے والی نسلوں نے ان کے قیمتی ورثے سے فائدہ اُٹھایا۔ چند ایک نشانیاں ایسی ملتی ہیں جو اس بارے میں ہماری رہنمائی کرتی ہیں ورنہ ان قدیم تہذیبوں کے آغاز اور ان کے انجام کے بارے میں سب کچھ اسقدر پُر اسرار ہے کہ کچھ پتہ ہی نہیں چلتا۔ مگر دو باتیں بالکل واضح ہیں: ان کا خیال تھا کہ وہ کبھی نہیں مریں گے اور وہ دنیاوی عیش ونشاط میں محو ہو گئے تھے۔ انہوں نے اپنے پیچھے ایسی یادگاریں چھوڑیں جن کے بارے میں وہ سمجھتے تھے کہ ان سے وہ لافانی ہو جائیں گے۔ ان قدیم تہذیبوں کے مقابلے میں آج بھی ایسے لوگوں کی کمی نہیں جو یہی ذہنیت رکھتے ہیں۔ اپنے ناموں کو لافانی بنانے کی توقع میں جدید معاشروں کے انسانوں نے زیادہ سے زیادہ دولت دنیا جمع کرنی شروع کر دی ہے یا ایسے کام کر رہے ہیں جو ان کے بعد زندہ رہ سکیں۔ مزید یہ کہ ایسے لوگ قدیم نسلوں کے مقابلے میں زیادہ فضول خرچی کر رہے ہیں اور اللہ کی کتاب کو فراموش کر بیٹھے ہیں۔ قدیم قوموں کے رویّوں اور تجربات سے بہت سے سبق سیکھے جا سکتے ہیں۔ ان پرانی قوموں میں سے کوئی بھی زندہ نہ بچ سکی۔ اپنے پیچھے جو فن کے شاہکار اور یادگاریں انہوں نے چھوڑیں، ان سے بیشک انہیں کچھ عرصے تک بعد میں آنے والی نسلوں نے یاد کیا ہوگا مگر نہ تو وہ اپنے آپ کو عذاب الٰہی سے بچا سکے نہ اپنے مردہ جسموں کو مٹی میں مل جانے سے روک سکے۔ ان کی باقیات اگر موجود ہیں تو صرف دوسروں کیلئے درس عبرت کی خاطر یا ان لوگوں پر اللہ کے غیض وغضب کے نزول کی یاد دہانی کیلئے، جو اسکے سرکش اور باغی ہیں اور اس مال و دولت کیلئے اس کے شکر گزار نہیں جو اس نے انہیں عطا کی ہے۔

بیشک ایسے تاریخی واقعات سے جو سبق سیکھے جانے چاہئیں وہ بالآخر عقلمندی و دانائی کی طرف لے جاتے ہیں۔ صرف اسی وقت انسان یہ سمجھ سکتا ہے کہ قدیم معاشروں پر جو عذاب نازل ہوئے وہ بے مقصد اور بلاوجہ نہ تھے۔ یہ بھی انسان کی سمجھ میں آ جاتا ہے کہ صرف اللہ ہی جب چاہے کسی قوم پر عذاب نازل کر سکتا ہے، اسی ذاتِ باری تعالیٰ کو یہ طاقت اور اختیار حاصل ہے۔ دنیا ایک ایسا مقام ہے جہاں انسان کی آزمائش کی جاتی ہے۔ وہ لوگ جو اللہ کے حضور سر تسلیم خم کر لیتے ہیں انہیں نجات حاصل ہو جاتی ہے دوسری جانب وہ لوگ جو اس دنیا سے مطمئن ہیں انہیں ایک دائمی انعام سے محروم رکھا جائے گا۔ بیشک ان کے انجام ان کے افعال کے مطابق ہوں گے اور ان کا حساب بھی ان اعمال کی بنیاد پر ہوگا بیشک اللہ بہترین منصف ہے۔

آخرت: انسان کا اصل مسکن

بہت سے لوگوں کے خیال میں اس دنیا میں جامع ومکمل زندگی گزارنا ممکن ہے۔ اس نقطہ نظر کے مطابق اس دنیا میں خوشگوار اور مطمئن زندگی کا حصول مادی خوشحالی کے ذریعے ممکن ہے۔ ایک مکمل اور مطمئن زندگی کی بنیادی چیزیں سماجی مقام ومرتبے کی مدد سے حاصل کی جا سکتی ہیں۔

مگر قرآنی نقطہ نظر کے مطابق ایک ''مکمل و جامع زندگی'' وہ ہے جسمیں مسائل کوئی نہ ہوں۔ اور ایسی زندگی یقیناً اس دنیا میں ممکن نہیں۔ ایسا اسلئے ہے کہ اس دنیا کی زندگی دانستہ طور پر اس طرح بنائی گئی ہے کہ یہ نامکمل اور ناقص رہے۔ انگریزی لفظ ''ورلڈ (World)'' کا متبادل عربی لفظ ''دُنیا'' ہے۔ جس کے ایک خاص معنی ہیں۔ صرفی یا اشتقاقی طور پر اس کا مادہ Danity ہے۔ جس کے معنی ''سادہ'' ''کم تر وگھٹیا'' ''حقیر'' اور ''بیکار'' کے ہیں۔ چنانچہ لفظ ''ورلڈ'' عربی میں اپنے اندر یہ ساری صفات رکھتا ہے۔

اس کتاب کے ابتدائی صفحات میں دُنیا کی زندگی کی بے قدری اور بے توقیری کے بارے میں ہم بارہا ذکر کر چکے ہیں ـــــ بیشک تمام عناصر مل کر زندگی کو حیران کن بنا دیتے ہیں۔ دولت، ذاتی اور تجارتی کامیابی، شادی، اولاد وغیرہ کچھ بھی نہیں سوائے لاحاصل فریب کے۔ اس موضوع سے متعلق درج ذیل سورۃ میں ارشادِ باری تعالیٰ یوں ہوا ہے:

اِعۡلَمُوۡۤا اَنَّمَا الۡحَیٰوۃُ الدُّنۡیَا لَعِبٌ وَّ لَهۡوٌ وَّ زِیۡنَةٌ وَّ تَفَاخُرٌۢ بَیۡنَکُمۡ وَ تَکَاثُرٌ فِی الۡاَمۡوَالِ وَ الۡاَوۡلَادِ ؕ کَمَثَلِ غَیۡثٍ اَعۡجَبَ الۡکُفَّارَ نَبَاتُهٗ ثُمَّ یَهِیۡجُ فَتَرٰىهُ مُصۡفَرًّا ثُمَّ یَکُوۡنُ حُطَامًا ؕ وَ فِی الۡاٰخِرَۃِ عَذَابٌ شَدِیۡدٌ ۙ وَّ

مَغْفِرَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَ رِضْوَانٌ ؕ وَ مَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ ○

''خوب جان لو کہ یہ دنیا کی زندگی اس کے سوا کچھ نہیں کہ ایک کھیل اور دل لگی اور ظاہری ٹیپ ٹاپ اور تمہارا آپس میں ایک دوسرے پر فخر جتانا اور مال و اولاد میں ایک دوسرے سے بڑھ جانے کی کوشش کرنا ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک بارش ہوگئی تو اس سے پیدا ہونے والی نباتات کو دیکھ کر کاشت کار خوش ہو گئے۔ پھر وہی کھیتی پک جاتی ہے اور تم دیکھتے ہو کہ وہ زرد ہوگئی۔ پھر وہ بھس بن کر رہ جاتی ہے اس کے برعکس آخرت وہ جگہ ہے جہاں سخت عذاب ہے اور اللہ کی مغفرت اور اس کی خوشنودی ہے۔ دنیا کی زندگی ایک دھوکے کے سوا کچھ نہیں''۔

(سورۃ الحدید : 20)

ایک اور سورۃ میں اللہ نے ان انسانوں کا ذکر فرمایا ہے جو آخرت کے بجائے اس دنیا کی طرف زیادہ مائل ہوتے ہیں:

بَلْ تُؤْثِرُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ○ وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ وَّ اَبْقٰى ○

''مگر تم لوگ دنیا کی زندگی کو ترجیح دیتے ہو حالانکہ آخرت بہتر ہے اور باقی رہنے والی ہے''۔ (سورۃ الاعلیٰ : 16-17)

مسائل پیدا ہی اسلیئے ہوتے ہیں کیونکہ لوگ اس دنیا کی زندگی کو آخرت پر ترجیح دیتے ہیں۔ جو کچھ اس دنیا میں ان کے پاس ہے وہ اسی پر خوش اور مطمئن ہوتے ہیں۔ اس کا مطلب اس کے سوا کچھ نہیں کہ انسان اللہ کے وعدے سے منہ پھیر لے اور اس کے نتیجے میں اللہ کی طاقت کی حقیقت کو نظر انداز کر دے۔ اللہ نے ایسے لوگوں کے بارے میں اعلان فرمادیا ہے:

اِنَّ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَ نَا وَ رَضُوْا بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ اطْمَاَنُّوْا بِهَا وَ الَّذِيْنَ هُمْ عَنْ اٰيٰتِنَا غٰفِلُوْنَ ○ اُولٰٓئِكَ مَاْوٰهُمُ النَّارُ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ○

''حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ ہم سے ملنے کی توقع نہیں رکھتے اور دنیا کی زندگی ہی پر راضی اور مطمئن ہو گئے ہیں اور جو لوگ ہماری نشانیوں سے غافل ہیں اُن کا آخری ٹھکانہ جہنم ہوگا۔

(سورۃ یونس : 7-8)

بیشک اس دنیا کی زندگی نامکمل ہے مگر اس سے یہ حقیقت بھی جھٹلائی نہیں جاسکتی کہ اس دنیا میں اچھی اور خوبصورت چیزیں بھی ہیں۔ مگر اس دنیا میں جن اشیاء کو خوبصورت، دلکش و دلنواز سمجھا

جاتا ہے وہ ناقص اور بدصورت چیزوں کے بالکل قریب ہوتی ہیں۔ گویا اس دنیا میں اچھائی اور برائی باہم ملی ہوئی ہیں۔ یہ جنت اور جہنم کی یاددہانی ہے۔ بیشک اگر ایک صحت مند ذہن کے ساتھ دیکھا جائے تو ان حقائق سے انسان پر یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ آخرت کا بھی ایک وجود ہے۔ وہ زندگی جو انسان کے لئے اچھی اور منافع بخش ہے، جس میں اسے اللہ کا قرب بھی حاصل ہوگا وہ تو آخرت کی زندگی ہی ہے۔

درج ذیل سورۃ میں اللہ نے اپنے مطیع وفرمانبردار بندوں کو حکم دیا ہے کہ وہ جنت کے حصول کی کوشش کریں:

وَسَارِعُوْٓا اِلٰی مَغْفِرَۃٍ مِّنْ رَّبِّکُمْ وَ جَنَّۃٍ عَرْضُھَا السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ لا اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِیْنَ o

''دوڑ کر چلو اس راہ پر جو تمہارے ربّ کی بخشش اور جنت کی طرف جاتی ہے، جس کی وسعت زمین اور آسمانوں جیسی ہے اور وہ ان خداترس لوگوں کیلئے مہیا کی گئی ہے''۔

(سورۃ آلِ عمران : 133)

وہ جنہیں جنت میں پہنچنے کی جلدی ہوتی ہے

قرآن میں مومنوں کو ایک دائمی انعام اور خوشی کا مژدہ سنایا گیا ہے مگر ایک حقیقت جو عموماً لوگوں کی نظر سے اوجھل رہتی ہے یہ ہے کہ اس دائمی خوشی ومسرت کا آغاز اس دنیا کی زندگی سے ہی ہوجاتا ہے۔ اس لئے کہ مومنوں کو اس دنیا میں بھی اللہ کی عنایات اور مہربانیوں سے محروم نہیں رکھا جاتا۔

قرآن میں اللہ سچے مومنوں کے بارے میں فرماتا ہے کہ وہ جو اس دنیا میں نیک عمل کرتے ہیں آخرت میں ان کا ٹھکانہ ہم ایک اعلیٰ وارفع مقام کو بنائیں گے:

مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَکَرٍ اَوْ اُنْثٰی وَ ھُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْیِیَنَّہٗ حَیٰوۃً طَیِّبَۃً ج وَ لَنَجْزِیَنَّھُمْ اَجْرَھُمْ بِاَحْسَنِ مَا کَانُوْا یَعْمَلُوْنَ o

''جو شخص بھی نیک عمل کرے گا خواہ وہ مرد ہو یا عورت، بشرطیکہ ہو وہ مومن، اسے ہم دنیا میں پاکیزہ زندگی بسر کرائینگے اور (آخرت میں) ایسے لوگوں کو ان کے اجر ان کے بہترین اعمال کے

مطابق بخشیں گے"۔ (سورۃ النحل : 97)

اس دنیا میں انعام اور اپنی رحمت کے طور پر اللہ اپنے بندوں پر خاص عنایات نازل فرماتا ہے۔ یہ اللہ کا غیر متبدل قانون ہے۔ دولت، شان وشوکت اور حسن وخوبصورتی چونکہ جنت کی بنیادی خصوصیات ہیں اس لئے اس دنیا میں بھی اللہ اپنے مخلص بندوں پر رحمتوں کے دروازے کھول دیتا ہے یہ ایک طرح سے اس مطمئن اور عزت وآبرو والی زندگی کا آغاز ہے جو کبھی ختم نہیں ہوگی۔

اس دنیا کے دلکش اور خوبصورت مقامات اور سامان آرائش دراصل جنت کی حقیقی خوبصورت چیزوں کا ایک مصنوعی عکس ہیں۔ ان کی موجودگی مومنوں کو یقین دلاتی ہے کہ جنت میں ان سے کہیں بہتر چیزیں ملیں گی اور یوں ان کیلئے اللہ کے بندوں کے دلوں میں زیادہ خواہش پیدا ہوتی ہے۔ دوسری طرف یہ بھی ممکن ہے کہ ایک مومن دنیا میں عمر بھر کسی رنج وغم میں مبتلا رہے مگر پھر بھی وہ صبر وشکر کے ساتھ اس مصیبت کو برداشت کر لیتا ہے۔ مزید یہ کہ مومنین اس بات سے آگاہ ہوتے ہیں کہ یہ بھی اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کا ایک طریقہ ہے اور اس رویّے سے ان لوگوں کے دلوں کو اطمینان حاصل ہوتا ہے۔

ایک مومن کی تعریف یہ ہے کہ وہ اپنے خالق کی موجودگی سے ہر لحظہ باخبر رہتا ہے۔ وہ اللہ کے احکام کی تعمیل کرتا ہے اور اس کی کوشش ہوتی ہے کہ قرآن میں جس قسم کی زندگی کا ذکر فرمایا گیا ویسی ہی زندگی گزارنے کی کوشش کرے۔ موت کے بعد کی زندگی کے بارے میں اس کی توقعات بڑی حقیقت پسندانہ ہوتی ہیں۔ ایک مومن جب اپنے خالق پر ایمان رکھتا ہے تو اللہ اس کے دل سے تمام دکھ درد دور کر دیتا ہے۔

ایک اور بات زیادہ اہم یہ ہے کہ ایک مومن ہر لحظہ اپنے خالق کی رہنمائی اور مدد محسوس کرتا ہے۔ یہ دراصل دل ودماغ کا اطمینان ہے جو اس وقت حاصل ہوتا ہے جب انسان عبادت کے وقت اور اچھے کام کرتے وقت یہ محسوس کرے کہ اسے اللہ کی قربت حاصل ہے۔ کوئی کام چھوٹا ہو یا بڑا، مومن اسے اس نیت سے کرتا ہے کہ اس سے اسے اللہ کی خوشنودی حاصل ہوگی۔

یہ یقیناً ایک ایسا احساس تحفظ ہے جو ایک مومن کے دل میں یہ جذبہ پیدا کرتا ہے کہ وہ یہ سمجھے کہ لَهٗ مُعَقِّبٰتٌ مِّنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَ مِنْ خَلْفِهٖ يَحْفَظُوْنَهٗ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ ؕ "ہر شخص کے آگے اور پیچھے اس کے مقرر کئے ہوئے نگران لگے ہوئے ہیں جو اللہ کے حکم سے اس کی دیکھ

بھال کررہے ہیں"۔ (سورۃ الرعد : 11) اور وہ اپنی جدوجہد میں اللہ کے فضل سے کامیاب و کامران ہوگا اور اسے ایک دائمی انعام کی خوشخبری ملے گی۔ اللہ اپنے ان نگرانوں کو جس طرح حکم دیتا ہے اس کے مطابق مومنین کو نہ کبھی خوف و ڈر محسوس ہوا نہ وہ رنجیدہ و غمگین ہوتے ہیں:

اِذْ يُوْحِىْ رَبُّكَ اِلَى الْمَلٰٓئِكَةِ اَنِّىْ مَعَكُمْ فَثَبِّتُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ؕ

"میں تمہارے ساتھ ہوں تم اہل ایمان کو ثابت قدم رکھو" (سورۃ الانفال 12)

مومنین تو وہ ہیں اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا "جو یہ کہتے ہیں کہ ان کا مالک اللہ ہے پھر وہ اس بات پر ثابت قدم رہتے ہیں"۔ (سورۃ فصلت:30) یہ وہی مومنین ہیں جنہیں فرشتے یہ مژدہ سناتے ہیں کہ وَ اَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِىْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ ۝ "اللہ نے جس جنت کا ان سے وعدہ فرمایا تھا وہ انہیں ملنے والی ہے"۔ (سورۃ فصلت:30) مومنوں کے علم میں یہ بات بھی ہوتی ہے کہ لَا نُكَلِّفُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَآ "ان کا خالق کسی پر اس کی استعداد سے زائد بوجھ نہیں ڈالتا"۔ (سورۃ الاعراف:42) وہ اس بات سے بھی آگاہ ہوتے ہیں کہ

اِنَّا كُلَّ شَىْءٍ خَلَقْنٰهُ بِقَدَرٍ ۝

"اللہ نے ہر چیز ایک تقدیر کے ساتھ پیدا کی ہے" (سورۃ القمر:49)

پس مومن ہی یہ کہتے ہیں کہ

قُلْ لَّنْ يُّصِيْبَنَآ اِلَّا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَنَا ۚ هُوَ مَوْلٰنَا ۚ

"ہمیں ہرگز کوئی (برائی یا بھلائی) نہیں پہنچتی مگر وہ جو اللہ نے ہمارے لئے لکھ دی ہے۔ اللہ ہی ہمارا مولیٰ ہے"۔ (سورۃ التوبہ:51)

اور وہ اللہ پر یقین رکھتے ہیں۔ انہیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا کیونکہ ان کا ایمان ہے کہ

حَسْبُنَا اللّٰهُ وَ نِعْمَ الْوَكِيْلُ ۝

"ہمارے لئے اللہ کافی ہے اور وہی بہترین کارساز ہے" (سورۃ آل عمران : 173)

مگر چونکہ یہ دنیا انسانوں کیلئے آزمائش کا مقام ہے مومنوں کو یقیناً کچھ مشکلات پیش آتی ہیں۔ وہ بھوک، پیاس، جائیداد کا نقصان، بیماری، حادثات وغیرہ کا کسی بھی وقت شکار ہو سکتے ہیں۔ غربت یا کوئی دوسری مصیبت کسی بھی وقت ان پر نازل ہو سکتی ہے۔ ایک مومن جس قسم کی آزمائش میں ڈالا جاتا ہے اس کا ذکر قرآن میں اس طرح آیا ہے:

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَ لَمَّا يَاْتِكُمْ مَّثَلُ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ

قَبۡلِكُمۡ ؕ مَسَّتۡهُمُ الۡبَاۡسَآءُ وَ الضَّرَّآءُ وَ زُلۡزِلُوۡا حَتّٰى يَقُوۡلَ الرَّسُوۡلُ وَ الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا مَعَهٗ مَتٰى نَصۡرُ اللّٰهِ ؕ اَلَاۤ اِنَّ نَصۡرَ اللّٰهِ قَرِيۡبٌ○

''پھر کیا تم لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ یونہی جنت کا داخلہ تمہیں مل جائے گا حالانکہ ابھی تم پر وہ سب کچھ نہیں گزرا ہے جو تم سے پہلے ایمان لانے والوں پر گزر چکا ہے۔ ان پر سختیاں گزریں، مصیبتیں آئیں، ہلا مارے گئے حتیٰ کہ وقت کا رسول اور اس کے ساتھی، اہل ایمان چیخ اُٹھے کہ اللہ کی مدد کب آئے گی؟ (اس وقت انہیں تسلی دی گئی کہ) ہاں اللہ کی مدد قریب ہے''۔ (سورۃ البقرۃ : 214)

مشکلات اور پریشانیاں پیغمبر خدا اور آپؐ کے صحابہ کرام کے دلوں سے اللہ کی عظمت اور خوف نہ نکال سکیں۔ جب کبھی کوئی مصیبت آتی ان کے رویے میں کوئی تبدیلی نہیں آتی تھی۔ اللہ بھی مومنوں کو اپنی مدد کی خوشخبری اس طرح سناتا ہے: وَيُنَجِّى اللّٰهُ الَّذِيۡنَ اتَّقَوۡا بِمَفَازَتِهِمۡ ۡ لَا يَمَسُّهُمُ السُّوۡٓءُ وَلَا هُمۡ يَحۡزَنُوۡنَ ○ ''بیشک اللہ کی مدد (ہمیشہ) قریب ہے اور پھر اللہ ان کو نجات دے گا اور نہ ان کو کوئی گزند پہنچے گی نہ ہی وہ غمگین ہوں گے''۔ (سورۃ الزمر :61)

مومنوں کو اس بات کا خوب علم ہوتا ہے کہ مشکلات خاص طور پر پیدا کی جاتی ہیں اور ان کی ذمہ داری یہ ہے کہ صبر و شکر کے ساتھ ہمیشہ ان کو برداشت کریں۔ مزید یہ کہ یہ وہ خاص مواقع ہیں جن میں انسان کو ثابت قدمی کا مظاہرہ کرنا چاہئے اور اس کے بدلے میں اللہ کی نظر میں اس کا درجہ بڑھ جاتا ہے۔ چنانچہ ایک مومن خوشی و مسرت محسوس کرتا ہے اور ایسے موقعوں پر پہلے سے زیادہ ثابت قدمی کا مظاہرہ کرتا ہے۔

تاہم منکرین خدا اور کفار کا رویہ بالکل مختلف ہوتا ہے۔ مشکلات کی گھڑیاں انہیں مایوسی کا شکار کر دیتی ہیں۔ جسمانی دکھ درد کے علاوہ ایک کافر شدید ذہنی اذیت میں سے بھی گزرتا ہے۔ خوف و ڈر، مایوسی، یاس و ناامیدی، رنج و غم، فکر، احتجاج سب کے سب اس دنیا میں کافروں کی خصوصیات ہوتی ہیں۔ مگر اصل عذاب تو انہیں آخرت میں ملے گا۔

وَمَنۡ يُّرِدۡ اَنۡ يُّضِلَّهٗ يَجۡعَلۡ صَدۡرَهٗ ضَيِّقًا حَرَجًا كَاَنَّمَا يَصَّعَّدُ فِى السَّمَآءِ ؕ كَذٰلِكَ يَجۡعَلُ اللّٰهُ الرِّجۡسَ عَلَى الَّذِيۡنَ لَا يُؤۡمِنُوۡنَ○

''اللہ جسے گمراہی میں ڈالنے کا ارادہ کرتا ہے اس کے سینے کو تنگ کر دیتا ہے اور ایسا بھینچتا ہے کہ (اسلام کا تصور کرتے ہی) اسے یوں معلوم ہونے لگتا ہے کہ گویا اس کی روح آسمان کی

طرف پرواز کر رہی ہے۔ اس طرح اللہ (حق سے فرار اور نفرت کی) ناپاکی ان لوگوں پر مسلط کر دیتا ہے جو ایمان نہیں لاتے"۔ (سورۃ الانعام : 125)

دوسری طرف وہ مومنین جو اللہ سے معافی کے خواستگار رہوتے اور اس کے حضور توبہ کرتے ہیں ان پر اس دنیا میں اس کے انعامات اور رحمتیں نازل ہوتی ہیں' جیسا کہ درج ذیل سورۃ میں ارشادِ باری تعالیٰ یوں ہوتا ہے:

وَ اَنِ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْۤا اِلَيْهِ يُمَتِّعْكُمْ مَّتَاعًا حَسَنًا اِلٰۤى اَجَلٍ مُّسَمًّى وَّ يُؤْتِ كُلَّ ذِىْ فَضْلٍ فَضْلَهٗ ؕ وَ اِنْ تَوَلَّوْا فَاِنِّىْۤ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ كَبِيْرٍ ۝

"اور یہ کہ تم اپنے رب سے معافی چاہو اور اس کی طرف پلٹ آ ؤ تو وہ ایک مدتِ خاص تک تم کو اچھا سامانِ زندگی دے گا اور ہر صاحب فضل کو اس کا فضل عطا کرے گا لیکن اگر تم منہ پھیرتے ہو تو میں تمہارے حق میں ایک بڑے ہولناک دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں"۔ (سورۃ ھود : 3)

ایک اور سورۃ میں مومنوں کی زندگی کے بارے میں یوں ارشاد ہوتا ہے:

وَ قِيْلَ لِلَّذِيْنَ اتَّقَوْا مَا ذَاۤ اَنْزَلَ رَبُّكُمْ ؕ قَالُوْا خَيْرًا ؕ لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا فِىْ هٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةٌ ؕ وَ لَدَارُ الْاٰخِرَةِ خَيْرٌ ؕ وَ لَنِعْمَ دَارُ الْمُتَّقِيْنَ ۝

"دوسری طرف جب خدا ترس لوگوں سے پوچھا جاتا ہے کہ یہ کیا چیز ہے جو تمہارے ربّ کی طرف سے نازل ہوئی ہے تو وہ جواب دیتے ہیں کہ بہترین چیز اُتری ہے اس طرح کے نیکوکار لوگوں کیلئے اس دنیا میں بھی بھلائی ہے اور آخرت کا گھر تو ضرور ہی ان کے حق میں بہتر ہے۔ بڑا اچھا گھر ہے متقیوں کا"۔ (سورۃ النحل : 30)

آخرت یقیناً اس دنیا سے اعلیٰ اور بہتر ہے۔ اس دنیا کا آخرت کے ساتھ موازنہ کیا جائے تو یہ دنیا حقیری اور بیکار دکھائی دیتی ہے۔ تاہم اگر کوئی انسان اپنی منزل کا تعین کرنا چاہتا ہے تو وہ منزل آخرت میں جنت ہونی چاہئے۔ یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ جو لوگ جنت کے حصول کی کوشش کرتے ہیں ان پر اس دنیا میں بھی اللہ کا فضل و کرم نازل ہوتا ہے۔ مگر وہ لوگ جو اللہ سے بغاوت و سرکشی کے ذریعے یہ دنیا حاصل کرنا چاہتے ہیں ان کے ہاتھ کچھ نہیں آتا اور پھر ان کا ٹھکانہ آخرت میں جہنم میں ہوتا ہے۔

جنت

اللہ نے ان مومنوں سے جنت کا وعدہ کر رکھا ہے جو اس پر ایمان لائے۔ اور وہ کبھی اپنے وعدے سے پھرا نہیں کرتا۔ وہ لوگ جو اللہ پر یقین رکھتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ ان کا خالق اپنا وعدہ ضرور پورا کرے گا اور انہیں جنت میں داخل کیا جائے گا بشرطیکہ وہ اس دنیا میں سچے مومنوں کی طرح زندہ رہے ہوں۔

جَنّٰتِ عَدۡنِ نِ الَّتِیۡ وَعَدَ الرَّحۡمٰنُ عِبَادَهٗ بِالۡغَيۡبِ ؕ اِنَّهٗ كَانَ وَعۡدُهٗ مَاۡتِيًّا ۝

”اُن کے لئے ہمیشہ رہنے والی جنتیں جن کا رحمٰن نے اپنے بندوں سے وعدہ کر رکھا ہے اور یقیناً یہ وعدہ پورا ہو کر رہنا ہے“۔ (سورۂ مریم : 61)

جنت میں داخلے کا وقت ان مومنوں کیلئے بڑا اہم ہے جو اللہ پر ایمان لائے اور جنہوں نے نیک کام کئے۔ تمام عمر وہ اس کیلئے سعی و کوشش کرتے رہے، دعائیں مانگتے رہے اور اس کے حصول کیلئے اچھے کام کرتے رہے۔ اللہ کی قربت میں یہی سب سے بہتر مقام ہے اور اسی کیلئے کوشش کی جانی چاہئے، جسے جنت کہتے ہیں اور اسے مومنوں کے لئے بطور خاص تیار کیا گیا ہے۔ اللہ نے اس بے مثال لمحے کا ذکر درج ذیل سورۃ میں یوں فرمایا ہے:

جَنّٰتُ عَدۡنٍ يَّدۡخُلُوۡنَهَا وَمَنۡ صَلَحَ مِنۡ اٰبَآئِهِمۡ وَ اَزۡوَاجِهِمۡ وَ ذُرِّيّٰتِهِمۡ وَ الۡمَلٰٓئِكَةُ يَدۡخُلُوۡنَ عَلَيۡهِمۡ مِّنۡ كُلِّ بَابٍ ۝ سَلٰمٌ عَلَيۡكُمۡ بِمَا صَبَرۡتُمۡ فَنِعۡمَ عُقۡبَى الدَّارِ ۝

”یعنی ایسے باغ جو اُن کی ابدی قیام گاہ ہوں گے۔ وہ خود بھی ان میں داخل ہوں گے اور ان کے آباؤ اجداد اور ان کی بیویوں اور ان کی اولاد میں سے جو جو صالح ہیں وہ بھی ان کے ساتھ وہاں جائینگے۔ ملائکہ ہر طرف سے ان کے استقبال کیلئے آئینگے اور ان سے کہیں گے: تم پر سلامتی ہو تم نے دنیا میں جس طرح صبر سے کام لیا اس کی بدولت آج تم اس کے مستحق ہوئے ہو۔ پس کیا ہی خوب ہے یہ آخرت کا گھر“۔ (سورۃ الرعد : 23-24)

جنت کی خوبصورتی

مَثَلُ الْجَنَّةِ الَّتِیْ وُعِدَ الْمُتَّقُوْنَ ط تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ط اُكُلُهَا دَآئِمٌ وَّ ظِلُّهَا ط تِلْكَ عُقْبَى الَّذِیْنَ اتَّقَوْا ۖ وَّ عُقْبَى الْكٰفِرِیْنَ النَّارُ o

"خدا ترس انسانوں کیلئے جس جنت کا وعدہ کیا گیا ہے اس کی شان یہ ہے کہ اس کے نیچے نہریں بہہ رہی ہیں' اس کے پھل دائمی ہیں اور اس کا سایہ لازوال۔ یہ انجام ہے متقی لوگوں کا اور منکرین حق کا انجام یہ ہے کہ ان کیلئے دوزخ کی آگ ہے"۔ (سورۃ الرعد : 35)

ایک عام انسانی ذہن جس قسم کی جنت کا تصور کرتا ہے اس میں جھیلیں' نہریں اور سرسبز و شاداب زمین ہوگی۔ مگر جنت کے اس تصور کی وضاحت اس لئے ضروری ہے کیونکہ یہ قرآن میں دی گئی تصویر سے مطابقت نہیں رکھتا۔ بیشک یہ صحیح ہے کہ جنت میں قدرتی مناظر ہوں گے' مگر یہ ماحول تو صرف اس کے جمالیاتی رُخ کو پیش کرتا ہے۔ اسی لئے قرآن میں عالیشان محلات' باغات اور بہتی ہوئی نہروں کا حوالہ ہے۔ مگر ہم جنت کو جس قدر بھی طبعی خوبصورتی تک محدود کریں گے یہ یقیناً ناموزوں اور ناکافی ہوگا۔

دراصل جنت کی خوبصورتی اور دلکش انسانی تصور سے کہیں بالاتر ہے۔ قرآنی الفاظ میں اسے یوں بیان فرمایا گیا ہے: ذَوَاتَآ اَفْنَانٍ "ہری بھری ڈالیوں سے بھرپور" (سورۃ رحمٰن 48) یقیناً اس سے جنت کی حقیقی تصویر کی عکاسی ہوتی ہے۔ "ہری بھری ڈالیوں" سے مراد وہ خاص چیزیں ہیں جو اللہ نے تخلیق کی ہیں جو علیم ہے۔ یہ چیزیں ہوسکتا ہے وہ حیران کن انعامات ہوں یا وہ چیزیں جن کو پاکر انسان بے حد خوشی محسوس کرتا ہے اور ان کے بارے میں اس نے پہلے کبھی تصور بھی نہیں کیا ہوگا۔ لَهُمْ مَّا یَشَآءُوْنَ عِنْدَ رَبِّهِمْ ط ذٰلِكَ هُوَ الْفَضْلُ الْكَبِیْرُ o "اللہ کا وعدہ تھا کہ وہ انہیں وہ سب کچھ عطا کرے گا جس کی وہ تمنا کیا کرتے تھے' یہ اس کا بہت بڑا فضل ہے"۔ (سورۃ الشوریٰ 22) اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مومنوں نے اپنے تصور کے مطابق اپنے اپنے ذوق اور آرزو کی بنیاد پر جنت کی ایک تصویر ذہنوں میں بنائی ہوئی ہوگی۔

مومنوں کا ابدی مسکن

وَعَدَ اللّٰهُ الْمُؤْمِنِیْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ

خٰلِدِیْنَ فِیْهَا وَ مَسٰکِنَ طَیِّبَةً فِیْ جَنّٰتِ عَدْنٍ ؕ وَ رِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ اَکْبَرُ ؕ ذٰلِکَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ o

''ان مومن مردوں اور عورتوں سے اللہ کا وعدہ ہے کہ انہیں ایسے باغ دے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی اور وہ ان میں ہمیشہ رہینگے۔ ان سدابہار باغوں میں ان کیلئے پاکیزہ قیام گاہیں ہونگی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اللہ کی خوشنودی انہیں حاصل ہوگی۔ یہی بڑی کامیابی ہے''۔

(سورۃ التوبہ : 72)

یہ دنیا جس میں مومنین رہتے ہیں: فِیْ بُیُوْتٍ اَذِنَ اللّٰهُ اَنْ تُرْفَعَ وَ یُذْکَرَ فِیْهَا اسْمُهٗ ۙ یُسَبِّحُ لَهٗ فِیْهَا بِالْغُدُوِّ وَ الْاٰصَالِ o ''(اس کے نور کی ہدایت پانے والے) ان گھروں میں پائے جاتے ہیں جنہیں بلند کرنے اور جن میں اپنے نام کی یاد کا اللہ نے اِذن دیا ہے'' (سورۃ النور: 36) ان گھروں کو مومن اللہ کے حکم سے پاک اور صاف رکھتے اور ان کی بطور خاص نگہداشت کرتے ہیں۔

ایسے ہی گھر انہیں جنت میں ملیں گے۔ یہ ایسی جگہیں ہوں گی جہاں اللہ کے نام کی تسبیح پڑھی جائے گی اور اس کا نام ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔

خوبصورت مقامات پر مومنوں کے گھر بھی نہایت جدید فنِ تعمیر کے شاہکار ہو سکتے ہیں' جن کو خوبصورت شہروں میں تعمیر کیا گیا ہو۔

جنت کے وہ گھر جن کا ذکر قرآن میں آیا ہے' عموماً قدرتی مناظر والے مقامات پر دکھائے گئے ہیں:

لٰکِنِ الَّذِیْنَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ لَهُمْ غُرَفٌ مِّنْ فَوْقِهَا غُرَفٌ مَّبْنِیَّةٌ ۙ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۬ؕ وَعْدَ اللّٰهِ ؕ لَا یُخْلِفُ اللّٰهُ الْمِیْعَادَ o

''البتہ جو لوگ اپنے ربّ سے ڈر کر رہے ان کے لئے بلند عمارتیں ہیں منزل پر منزل بنی ہوئی جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہوں گی۔ یہ اللہ کا وعدہ ہے' اللہ کبھی اپنے وعدے کی خلاف ورزی نہیں کرتا''۔ (سورۃ الزمر : 20)

وہ محلات جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی اور جن کا ذکر درج بالا سورۃ میں آیا ان میں کھڑکیاں اور شیشے کی دیواروں والے بڑے بڑے کمرے ہو سکتے ہیں تاکہ ایسے خوبصورت مناظر سے لطف اندوز ہونے میں آسانی رہے۔ (شیشے کی دیواریں اور کھڑکیاں کیوں؟ کیا آخرت میں

انسانی آنکھ کو وہ نور عطا نہیں ہو سکتا جس کی مدد سے اس کے اور خوبصورت منظر کے درمیان کوئی پردہ ہی حائل نہ رہے۔ انسان اِن کے آر پار دیکھنے کی قوت بصارت پا چکا ہو ___ مترجم) اِن خوبصورت اور عالیشان گھروں میں مومنوں کیلئے خاص طور پر تیار کئے گئے تخت ہوں گے جن پر وہ محو استراحت ہو سکیں گے۔ وہ طرح طرح کے پھل' میوے اور مشروبات سے لطف اندوز ہوں گے۔ جنت کے ان محلات کو ایسے خوبصورت پردوں سے سجایا گیا ہوگا جس کا اس دُنیا میں تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ ان آرام دہ بلند نشستوں اور تختوں کا ذکر جن میں بہت خوبصورت ریشم اور اطلس کے کپڑے کا استعمال کیا گیا ہوگا قرآن پاک کی کئی آیات میں آیا ہے:

عَلٰى سُرُرٍ مَّوْضُوْنَةٍo مُّتَّكِئِيْنَ عَلَيْهَا مُتَقٰبِلِيْنَo

"(لعل و یاقوت وغیرہ سے) جڑے ہوئے تختوں پر۔ آمنے سامنے تکیہ لگائے ہوئے"۔
(سورۃ الواقعہ : 15-16)

مُتَّكِئِيْنَ عَلٰى سُرُرٍ مَّصْفُوْفَةٍ ۚ وَ زَوَّجْنٰهُمْ بِحُوْرٍ عِيْنٍo

"تختوں پر جو برابر بچھے ہوئے ہیں تکیہ لگائے ہوئے۔ اور بڑی بڑی آنکھوں والی حوروں سے ہم اُنکا عقد کر دینگے"۔ (سورۃ الطّور : 20)

وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْٓ اَذْهَبَ عَنَّا الْحَزَنَ ؕ اِنَّ رَبَّنَا لَغَفُوْرٌ شَكُوْرٌo نِ الَّذِيْٓ اَحَلَّنَا دَارَ الْمُقَامَةِ مِنْ فَضْلِهٖ ۚ لَا يَمَسُّنَا فِيْهَا نَصَبٌ وَّ لَا يَمَسُّنَا فِيْهَا لُغُوْبٌo

"(اور وہ کہیں گے) شکر ہے اس خدا کا جس نے ہم سے غم دور کر دیا یقیناً ہمارا ربّ معاف کرنے والا اور قدر فرمانے والا ہے۔ جس نے ہمیں اپنے فضل سے ابدی قیام کی جگہ ٹھہرا دیا۔ اب یہاں نہ ہمیں کوئی مشقت پیش آتی ہے اور نہ تکان لاحق ہوتی ہے"۔ (سورۃ فاطر : 34-35)

جنت میں بنیادی چیز مختلف اشیاء کی "انتہائی نزاکت اور باریکی" اور "قابل ذکر خوبصورتی" ہوگی۔ یہ سب چیزیں اللہ کی دانائی اور صناعی کی عکاسی کرتی ہیں۔ مثال کے طور پر تختوں پر سونا اور قیمتی پتھر جڑے ہوں گے۔ یہ تخت معمولی نہیں ہوں گے بلکہ کافی اُونچے ہوں گے۔ کپڑا ریشمی اور اعلیٰ و قیمتی ہوگا۔ ان قیمتی ملبوسات کے ساتھ سونے چاندی کے زیورات ہوں گے۔ قرآن میں اللہ

نے جنت کی تفصیلات پیش کی ہیں ان سب سے ایک بات واضح ہوتی ہے کہ ہر مومن ایک ایسے باغ میں ہوگا جو اس کے اپنے تصور کے مطابق بنایا گیا ہوگا۔ بیشک اللہ اپنے مطیع وفرمانبردار بندوں کو اور بہت سے حیران کن انعامات سے نوازے گا۔

انسانی تصور سے ماورا ایک باغ

يُطَافُ عَلَيْهِمْ بِصِحَافٍ مِّنْ ذَهَبٍ وَّ اَكْوَابٍ ج وَ فِيْهَا مَا تَشْتَهِيْهِ الْاَنْفُسُ وَ تَلَذُّ الْاَعْيُنُ ج وَ اَنْتُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ o

''اُن کے آگے سونے کے تھال اور ساغر گردش کرائے جائینگے اور ہر مَن بھاتی اور نگاہوں کو لذّت دینے والی چیز وہاں موجود ہوگی۔ ان سے کہا جائیگا تم اب یہاں ہمیشہ رہو گے''۔

(سورۃ الزخرف : 71)

قرآن میں بیان کی گئی تفصیل سے ہم یہ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ جنت کیسی ہے۔ درج ذیل سورۃ میں اللہ تعالیٰ بیان فرماتا ہے کہ جنت میں جو نعمتیں ہوں گی وہ ویسی ہی ہیں جیسی اس دنیا میں:

كُلَّمَا رُزِقُوْا مِنْهَا مِنْ ثَمَرَةٍ رِّزْقًا لا قَالُوْا هٰذَا الَّذِیْ رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ ''جب کوئی پھل انہیں کھانے کو دیا جائے گا تو وہ کہیں گے کہ ایسے ہی پھل اس سے پہلے دنیا میں ہمیں دیئے جاتے تھے'' (سورۃ البقرۃ : 25)

اس آیت کی روشنی میں وَيُدْخِلُهُمُ الْجَنَّةَ عَرَّفَهَا لَهُمْ o ''اوران کو اس جنت میں داخل کرے گا جس سے وہ ان کو واقف کرا چکا ہے''(سورۃ محمد:6) ہم اس نتیجے پر پہنچ سکتے ہیں کہ اللہ مومنوں کو اس جنت میں بھیجے گا جس سے وہ پہلے سے ہی متعارف تھے۔

تاہم جنت کے بارے میں ہمیں اس دنیا میں جس قدر معلومات بھی حاصل ہوتی ہے یقیناً ناکافی ہوگی' اس سے محض ایک عام سی تصویر بنا لینے کے لئے چند اشارے مل سکتے ہیں:

مَثَلُ الْجَنَّةِ الَّتِیْ وُعِدَ الْمُتَّقُوْنَ ط فِيْهَآ اَنْهٰرٌ مِّنْ مَّآءٍ غَيْرِ اٰسِنٍ ج وَ اَنْهٰرٌ مِّنْ لَّبَنٍ لَّمْ يَتَغَيَّرْ طَعْمُهٗ ج وَ اَنْهٰرٌ مِّنْ خَمْرٍ لَّذَّةٍ لِّلشّٰرِبِيْنَ ج وَ اَنْهٰرٌ مِّنْ عَسَلٍ مُّصَفًّى ط

''پرہیزگار لوگوں کیلئے جس جنت کا وعدہ کیا گیا ہے اس کی شان تو یہ ہے کہ اسمیں نہریں بہہ

رہی ہوں گی نتھرے ہوئے پانی کی نہریں بہہ رہی ہوں گی ایسے دودھ کی جس کے مزے میں ذرا فرق نہ آیا ہوگا نہریں بہہ رہی ہوں گی ایسی شراب کی جو پینے والوں کے لئے لذیذ ہوں گی نہریں بہہ رہی ہوں گی صاف شفاف شہد کی"۔ (سورۃ محمد :15)

اس سورۃ سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ جنت ایک ایسا مقام ہے جو ہمارے تصور سے بالاتر ہے۔ یہ آیت انسانی روح میں یہ احساس پیدا کر دیتی ہے کہ یہ ایک ایسا مقام ہے جہاں غیر متوقع مناظر ہوں گے۔ دوسری طرف اللہ نے جنت کو "خاطر و مدارت" یا "ضیافت" کہا ہے۔

لٰكِنِ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ لَهُمْ جَنّٰتٌ تَجْرِىْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا نُزُلًا مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ ؕ وَ مَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ لِّلْاَبْرَارِ ۝

"برعکس اس کے جو لوگ اپنے ربّ سے ڈرتے ہوئے زندگی بسر کرتے ہیں ان کے لئے ایسے باغ ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں۔ ان باغوں میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ اللہ کی طرف سے یہ سامان ضیافت ہے ان کیلئے اور جو کچھ اللہ کے پاس ہے نیک لوگوں کے لئے وہی سب سے بہتر ہے"۔ (سورۃ آل عمران : 198)

اس سورۃ میں اللہ نے جنت کو ضیافت اور خاطر و مدارت کی جگہ کے طور پر متعارف کرایا ہے۔ اس زندگی کا "انجام" "آزمائش" میں پورا اُترنے کی خوشی اور ہمیشہ کیلئے بہترین مقام کا رہنے کو مل جانا یقیناً مومنوں کیلئے خوشی و مسرت منانے کا باعث بنتے ہیں۔ یہ تقریب بہت شاندار ہوگی: یہ ایسی ہوگی کہ اس جیسی اس دنیا میں انسان نے کبھی نہ دیکھی ہوگی۔ یہ ہر طرح کے رسم و رواج اور روایات سے ماوراء ہوگی۔ ایسی تقاریب، میلے اور ضیافتیں نہ پہلے کی قوموں نے اس دنیا میں کبھی دیکھے ہوں گے نہ آج کی قوموں نے۔

ابدی زندگی میں، یہ حقیقت کہ مومنین بہت سی قسم کی نہ ختم ہونے والی ضیافتوں سے لطف اندوز ہوں گے۔ انسانی ذہن میں مومنوں کی جنتی زندگی کی ایک اور صفت سامنے لاتی ہے۔ انہیں تکان اور افسردگی کبھی محسوس نہیں ہوگی۔ قرآن میں اس حالت کو مومنوں کی زبان سے اس طرح ادا کرایا گیا ہے:

الَّذِيْٓ اَحَلَّنَا دَارَ الْمُقَامَةِ مِنْ فَضْلِهٖ ۚ لَا يَمَسُّنَا فِيْهَا نَصَبٌ وَّ لَا يَمَسُّنَا فِيْهَا لُغُوْبٌ ۝

''......جس نے ہمیں اپنے فضل سے ابدی قیام کی جگہ ٹھہرا دیا۔ اب یہاں نہ ہمیں کوئی مشقت پیش آتی ہے اور نہ تکان لاحق ہوتی ہے''۔ (سورۃ فاطر : 35)

بیشک جنت میں مومنوں کو ذہنی تکان بھی محسوس نہ ہوگی۔ جنت کے مقابلے میں جہاں **لَا يَمَسُّهُمْ فِيهَا نَصَبٌ** ''انہیں کسی مشقت سے پالا نہیں پڑے گا'' (سورۃ الحجر : 48) انسان اس دنیا میں تکان محسوس کرتا ہے کیونکہ اس کا جسم مضبوط نہیں بنایا گیا۔ جب ایک انسان تھک جاتا ہے تو اس کیلئے کسی کام پر توجہ دینا مشکل ہو جاتا ہے اور وہ صحیح اور درست فیصلے نہیں کر سکتا۔ تکان کی وجہ سے انسان کے ادراک میں تبدیلی آ جاتی ہے۔ مگر جنت میں ایسی ذہنی کیفیت نہیں ہوگی۔ تمام حواس بہترین طور پر اللہ کی تخلیق کا ادراک کر سکیں گے۔ مومنوں کو تکان کا احساس بالکل نہیں ہوگا اور اسی لئے وہ بغیر کسی کی مداخلت کے اللہ کی نعمتیں چکھیں گے۔ یہاں جو خوشی و مسرت محسوس ہوگی وہ ابدی اور بے پایاں ہوگی۔

ایک ایسا ماحول جس میں تکان اور بوریت کا کوئی وجود نہ ہو اللہ مومنوں کیلئے انعامات کے طور پر جو ''وہ چاہتے ہیں'' تخلیق کر دیتا ہے۔ بیشک اللہ یہ خوشخبری سناتا ہے کہ وہ مومنوں کے تصور اور خواہش سے بھی کہیں زیادہ تخلیق کرے گا:

لَهُمْ مَّا يَشَآءُوْنَ فِيهَا وَلَدَيْنَا مَزِيْدٌ ۝

''وہاں ان کیلئے وہ سب کچھ ہوگا جو وہ چاہیں گے اور ہمارے پاس اس سے زیادہ بھی بہت کچھ ان کیلئے ہے''۔ (سورۃ قٓ : 35)

انسان کو یہ بات ذہن نشین رکھنی چاہئے کہ جنت کی نعمتوں میں سے سب سے اہم یہ ہے کہ **وَ وَقٰهُمْ عَذَابَ الْجَحِيْمِ ۝** ''اللہ اپنے فضل سے ان کو جہنم کے عذاب سے بچا دے گا'' (سورۃ الدخان:56) اور **لَا يَسْمَعُوْنَ حَسِيْسَهَا ج** ''وہ جہنم کی سرسراہٹ تک نہ سنیں گے'' (سورۃ الانبیاء : 102)

دوسری طرف وہ جب چاہیں گے مومنوں کو یہ موقعہ حاصل ہوگا کہ وہ جہنم کے لوگوں کو دیکھ سکیں گے اور ان سے باتیں کر سکیں گے۔ وہ اس مہربانی اور کرم کیلئے بھی اللہ کے شکر گزار رہوں گے:

قَالُوْٓا اِنَّا كُنَّا قَبْلُ فِيْٓ اَهْلِنَا مُشْفِقِيْنَ ۝ فَمَنَّ اللّٰهُ عَلَيْنَا وَ وَقٰنَا عَذَابَ السَّمُوْمِ ۝ اِنَّا كُنَّا مِنْ قَبْلُ نَدْعُوْهُ ط اِنَّهٗ هُوَ الْبَرُّ الرَّحِيْمُ ۝

''یہ کہیں گے کہ ہم پہلے اپنے گھر والوں میں ڈرتے ہوئے زندگی بسر کرتے تھے آخر کار اللہ نے ہم پر فضل فرمایا اور ہمیں جھلسا دینے والی ہوا کے عذاب سے بچالیا۔ ہم پچھلی زندگی میں اسی سے دُعائیں مانگتے تھے۔ وہ واقعی بڑا ہی محسن اور رحیم ہے''۔ (سورۃ الطور: 26-28)

جنت میں مومنوں کی آنکھیں مختلف قسم کے خوبصورت مناظر دیکھیں گی' ایسے عالیشان مناظر انہوں نے پہلے کبھی نہ دیکھے ہوں گے۔ ہر گوشہ جنت قیمتی سامان آرائش سے سجا ہوگا۔ یہ سب کچھ ان مومنوں کیلئے ہوگا جن پر اللہ کا فضل و کرم ہوگا اور جنہیں وہ اپنی تخلیق کی ہوئی جنت سے نوازتا ہے:

وَ نَزَعْنَا مَا فِیْ صُدُوْرِهِمْ مِّنْ غِلٍّ اِخْوَانًا عَلٰی سُرُرٍ مُّتَقٰبِلِیْنَo

''اور ان کے دلوں میں جو تھوڑی بہت کھوٹ کپٹ ہوگی ہم اسے نکال دیں گے۔ وہ آپس میں بھائی بھائی بن کر آمنے سامنے تختوں پر بیٹھیں گے''۔ (سورۃ الحجر: 47)

خٰلِدِیْنَ فِیْهَا لَا یَبْغُوْنَ عَنْهَا حِوَلًاo

''ان باغوں میں وہ ہمیشہ رہیں گے اور کبھی اس جگہ سے نکل کر کہیں جانے کو ان کا جی نہ چاہے گا''۔ (سورۃ الکھف: 108)

اللہ کی خوشنودی: اُس کا سب سے اہم انعام

وَعَدَ اللّٰهُ الْمُؤْمِنِیْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا وَ مَسٰكِنَ طَیِّبَةً فِیْ جَنّٰتِ عَدْنٍ ط وَ رِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ اَكْبَرُ ط ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُo

''ان مومن مردوں اور عورتوں سے اللہ کا وعدہ ہے کہ انہیں ایسے باغ دے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی اور وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے۔ ان سدا بہار باغوں میں ان کیلئے پاکیزہ قیام گاہیں ہوں گی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اللہ کی خوشنودی انہیں حاصل ہوگی۔ یہی بڑی کامیابی ہے''۔ (سورۃ التوبۃ: 72)

گذشتہ صفحات میں ہم نے ان انعامات کا ذکر کیا جو اللہ انسان کو جنت میں عطا کرتا ہے۔ یہ بات بالکل واضح ہے کہ جنت ایک ایسا مقام ہے جہاں انسان اپنے پانچوں حواس کے ذریعے

لطف اندوز ہو سکے گا۔ مگر جنت کی سب سے بڑی خوبی اللہ کی خوشنودی ہے۔ مومنوں کیلئے اللہ کی خوشنودی کا حصول آخرت میں اطمینان و مسرت کا سب سے بڑا ذریعہ بن جاتا ہے۔ مزید یہ کہ اللہ کے انعامات کو دیکھ کر اور اللہ کی مہربانیوں اور عنایات کیلئے شکر گزار ہو کر یہ لوگ خوش ہوتے ہیں۔ قرآن میں ان مومنوں کے بارے میں جو جنت میں ہوں گے' اس طرح ذکر آیا ہے:

رَضِيَ اللّٰهُ عَنۡهُمۡ وَرَضُوۡا عَنۡهُ ؕ ذٰلِكَ الۡفَوۡزُ الۡعَظِيۡمُ ○

''اللہ ان سے راضی ہوا اور وہ اللہ سے' یہی بڑی کامیابی ہے''۔ (سورۃ المائدۃ:119)

جنت کے انعامات کو جو شے زیادہ قیمتی بناتی ہے وہ اللہ کی خوشنودی ہے ایسے ہی انعامات اس دنیا میں بھی موجود ہیں۔ مگر جب تک انسان میں اللہ کی خوشنودی شامل نہ ہو' مومنین ان سے لطف اندوز نہیں ہوتے۔ یہ ایک نہایت اہم معاملہ ہے جس پر غور وفکر کرنے کی ضرورت ہے۔ جو شے انعام کو فی الواقع قیمتی بناتی ہے وہ اس لذت اور خوشی و مسرت سے کہیں زیادہ ہے جو اس سے حاصل ہوتی ہے۔ زیادہ اہم بات یہ ہے کہ اللہ نے وہ انعام عطا کر دیا ہو۔

وہ مومن جسے اس قسم کے انعام سے نوازا جاتا ہے اور جو اپنے خالق کا ممنون ہوتا ہے' اسے یہ جان کر حقیقی خوشی حاصل ہوتی ہے کہ یہ اللہ کے فضل و کرم کا نتیجہ ہے۔ اطمینان صرف اس وقت حاصل ہوتا ہے جب اس حقیقت سے آگاہی حاصل ہو کہ اللہ اس بندے کی حفاظت فرما رہا ہے وہ اس سے محبت کرتا ہے اور اس کے خالق نے اس پر رحم و کرم کیا ہے اسی لئے صرف جنت سے اس کے دل کو حقیقی خوشی ملتی ہے۔ اُسے اللہ کے مطیع و فرمانبردار بندے کے طور پر تخلیق کیا گیا ہے اور اسی لئے اُسے اللہ کے فضل سے ہی خوشی و مسرت حاصل ہوتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ منکرین حق کی خیالی دنیا ''ارضی جنت'' کا اس دنیا میں کوئی وجود نہیں ہے۔ اگر جنت کی تمام چیزیں اکٹھی کر کے اس دنیا میں بھی ڈال دی جائیں اس کا پھر بھی اللہ کی خوشنودی کے بغیر کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔

مختصر یہ کہ جنت تو اللہ کا ایک انعام ہے اس کے مطیع و فرمانبردار بندوں کیلئے اور اسی لئے تو یہ ان کیلئے اہم ہے کیونکہ بَلۡ عِبَادٌ مُّكۡرَمُوۡنَ ''وہ تو ایسے بندے ہیں جنہیں عزت دی گئی ہے'' (سورۃ الانبیاء:26) انہیں ابدی خوشی و مسرت حاصل ہوتی ہے جنت میں مقیم مومنوں کے الفاظ

یہ ہیں: تَبٰرَكَ اسْمُ رَبِّكَ ذِی الْجَلٰلِ وَالْاِكْرَامِ ''بڑی برکت والا ہے تیرے رب جلیل وکریم کا نام''۔ (سورۃ الرحمٰن: 78)

جہنم

وہ جگہ جو منکرین حق کے لئے بطور خاص تخلیق کی گئی ہے' جہاں انہیں ہمیشہ رہنا ہوگا۔ اس کا مقصد انہیں جسمانی اور روحانی عذاب پہچانا ہے۔ ایسا اسلیئے ہے کیونکہ کافروں نے بہت بڑا گناہ کیا ہے اور اللہ کے عدل وانصاف کا تقاضا یہ ہے کہ انہیں اس کی سزا ملے۔

اس خالق کی نافرمانی اور اس کے خلاف بغاوت وسرکشی جس نے انسان کو رُوح عطا کی اس دنیا کا سب سے بڑا گناہ ہے۔ اسی لئے اس گناہ عظیم کی آخرت میں سزا بھی بڑی بڑی رکھی گئی ہے۔ اسی کام کیلئے جہنم بنائی گئی ہے۔ انسان کو تو اس لئے تخلیق کیا گیا تھا کہ وہ اپنے اللہ کا فرمانبردار بندہ بن کر رہے گا۔ اگر وہ اپنے اصل مقصد تخلیق ہی کو بھول جاتا ہے تو پھر اسے ضرور وہ سزا ملے گی جس کا وہ مستحق ہے۔

وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُوْنِیْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ ؕ اِنَّ الَّذِیْنَ یَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِیْ سَیَدْخُلُوْنَ جَهَنَّمَ دٰخِرِیْنَ۝

''اور تمہارے پروردگار نے ارشاد فرمایا ہے کہ تم مجھ سے دُعا کرو میں تمہاری (دُعا) قبول کرونگا۔ جو لوگ میری عبادت سے ازراہِ تکبّر کنیاتے ہیں عنقریب جہنم میں ذلیل ہوکر داخل ہوں گے''۔ (سورۃ الغافر: 60)

چونکہ آخر میں اکثر لوگوں کو سزا کے طور پر جہنم رسید کر دیا جائے گا جہاں کی سزا ابدی ہوگی اسی لئے بنی نوع انسان کا اصل مقصد حیات جہنم سے بچنا ہونا چاہئے۔ انسان کیلئے سب سے بڑا خطرہ جہنم کا ہے اور اپنی روح کو جہنم کی آگ سے بچانے سے زیادہ اہم بات اس کیلئے اور کیا ہوسکتی ہے۔

اس کے باوجود کرۂ ارض پر تقریباً تمام انسان ایک حالت بے خبری میں زندگی گزارتے ہیں۔ وہ اپنی روزمرہ زندگی کی دوسری مشکلات میں الجھے رہتے ہیں وہ غیر اہم کاموں پر مہینے اور برس ہا برس لگا دیتے ہیں مگر انہیں جو سب سے بڑا خطرہ لاحق ہے اس کے بارے میں کبھی نہیں سوچتے۔ اس خطرہ کی طرف سے آنکھیں بند کئے رہتے ہیں جو ان کی ابدی زندگی کیلئے سنگین ترین ہوتا ہے۔ جہنم تو جیسے ان کے بالکل سامنے کھڑی ہوتی ہے مگر وہ تو جیسے بینائی سے محروم ہو گئے ہوں کہ اسے دیکھ ہی نہیں سکتے:

اِقْتَرَبَ لِلنَّاسِ حِسَابُهُمْ وَ هُمْ فِيْ غَفْلَةٍ مُّعْرِضُوْنَ ○ مَا يَاْتِيْهِمْ مِّنْ ذِكْرٍ مِّنْ رَّبِّهِمْ مُّحْدَثٍ اِلَّا اسْتَمَعُوْهُ وَهُمْ يَلْعَبُوْنَ ○ لَا هِيَةً قُلُوْبُهُمْ ط

''قریب آ گیا ہے لوگوں کے حساب کا وقت اور وہ ہیں کہ غفلت میں منہ موڑے ہوئے ہیں۔ ان کے پاس جو تازہ نصیحت بھی ان کے ربّ کی طرف سے آتی ہے اس کو بتکلف سنتے ہیں اور کھیل میں پڑے رہتے ہیں۔ دل ان کے (دوسری ہی فکروں میں) منہمک ہیں''۔

(سورۃ الانبیاء : 1-3)

ایسے لوگ بیکار مشغلوں میں مصروف رہتے ہیں۔ وہ اپنی پوری عمر بیکار اور خیالی مقاصد کے تعاقب میں گزار دیتے ہیں۔ ان کا زیادہ وقت دوستوں کے جھرمٹ میں گزرتا ہے' یا پھر انہیں شادی کی فکر رہتی ہے تا کہ ایک ''خوشگوار گھریلو زندگی'' گزار سکیں۔ وہ روپیہ پیسہ کمانے اور جمع کرنے میں لگے رہتے ہیں یا کسی بیکار سے نظریے کی حمایت کرنے میں عمر گزار دیتے ہیں۔ یہ لوگ جب یہ سب کام کر رہے ہوتے ہیں اس وقت وہ اس بہت بڑے خطرے سے غافل رہتے ہیں جو انہیں عنقریب پیش آنے والا ہے۔ ان لوگوں کیلئے جہنم ایک فرضی قصے کہانی سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی۔

مگر سچ تو یہ ہے کہ جہنم تو اس دنیا سے بھی زیادہ حقیقی مقام ہے دنیا تو کچھ عرصے بعد ختم ہو جائے گی مگر جہنم ہمیشہ رہے گی۔ اللہ نے جو اس کائنات کا خالق ہے اور جس نے اس کے اندر کی ہر شے تخلیق کی اور فطرت میں بے حد نازک توازن برقرار رکھا' نے اسی طرح آخرت' جنت اور جہنم تخلیق کی ہیں۔ کافروں اور منافقوں کیلئے ایک دردناک عذاب کا وعدہ کیا گیا ہے:

حَسْبُهُمْ جَهَنَّمُ ج يَصْلَوْنَهَا ج فَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ○

''ان کیلئے جہنم ہی کافی ہے۔ اسی کا وہ ایندھن بنیں گے۔ بڑا ہی بُرا انجام ہے ان کا''۔

(سورۃ المجادلۃ : 8)

جہنم وہ بدترین مقام ہے جس کا تصور نہ کیا جا سکتا ہو۔ یہ انتہائی شدید عذاب کی جگہ ہے۔ جہنم کے عذاب کا مقابلہ اس دنیا کے کسی عذاب سے کیا ہی نہیں جا سکتا۔ یہ تو اس دنیا کے ہر عذاب' ہر دکھ درد اور ہر مصیبت سے کہیں زیادہ ہے۔ یہ یقیناً اللہ کا کام ہے جو دانائی میں عظیم و برتر ہے۔

جہنم کی دوسری حقیقت یہ ہے کہ اس میں بھیجے گئے ہر انسان کیلئے یہاں کا عذاب ابدی ہوگا۔

لاعلم معاشرے میں اکثر لوگوں کا خیال اس بارے میں بالکل غلط ہے۔ ان کے خیال میں اپنی سزا پوری کرنے کے بعد انہیں ایک خاص مدت کے بعد معاف کر دیا جائے گا۔ یہ محض ایک آرزومندانہ خیال ہی ہوسکتا ہے ورنہ حقیقت میں ایسا نہیں ہے۔ یہی تصور ان لوگوں میں بھی پایا جاتا ہے جو اپنے آپ کو مومنوں میں شمار کرتے ہیں اور اللہ کے احکام کی تعمیل نہیں کرتے یا ان میں کوتاہی کرتے ہیں۔ وہ یہ سمجھ بیٹھتے ہیں کہ دنیاوی معاملات میں جس قدر ممکن ہو سکے انہیں مصروف رہنا چاہئے۔ اسی عقیدے کے مطابق جہنم میں ایک مخصوص مدت تک رہنے اور سزا بھگت لینے کے بعد انہیں جنت میں بھیج دیا جائے گا۔ مگر ان کا انجام ان کی توقع سے بڑھ کر بُرا ہوگا۔ جہنم یقیناً ایک دائمی عذاب کی جگہ ہے۔ قرآن میں اس حقیقت پر کئی مقامات پر زور دیا گیا ہے کہ منکرین خدا کیلئے سزا ابدی اور دائمی ہوگی۔ درج ذیل سورۃ اس حقیقت کو مزید واضح کر دیتی ہے:

لّٰبِثِیْنَ فِیْهَآ اَحْقَابًا ○

''جس میں (جہنم میں) وہ مدتوں پڑے رہیں گے'' (سورۃ النبا : 23)

اس خالق کے نافرمان بن کر اور اس کے خلاف بغاوت و سرکشی کرتے ہوئے جس نے وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَ الْاَبْصَارَ وَ الْاَفْـِٕدَةَ ۙ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ○ ''انہیں کان دیئے آنکھیں دیں اور سوچنے والے دل دیئے اس لئے کہ تم شکرگزار بنو'' (سورۃ النحل: 78) یقیناً نہ ختم ہونے والے عذاب کے مستحق ہیں۔ جو عذر انسان پیش کرتا ہے وہ اسے جہنم سے نہ بچا سکیں گے۔ وہ لوگ جو غفلت کا مظاہرہ کرتے ہیں یا اللہ کے دین سے دشمنی وعداوت رکھتے ہیں ان کے خلاف تو فیصلہ ان کے خالق نے دے دیا ہے جس میں کوئی تبدیلی یا کمی بیشی نہ ہوگی۔ دنیا میں یہ لوگ گستاخ اور نافرمان تھے اور اللہ کے حضور سر تسلیم خم کرنے سے انہوں نے انکار کر دیا تھا۔ یہ لوگ مومنوں کی بھی جان کے دشمن تھے اسی لئے یوم حساب انہیں یہ سننا پڑے گا:

فَادْخُلُوْٓا اَبْوَابَ جَهَنَّمَ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا ؕ

''جاؤ جہنم کے دروازں میں گھس جاؤ۔ وہیں تم کو ہمیشہ رہنا ہے'' (سورۃ النحل: 29)

جہنم کی سب سے خوفناک صفت یہ ہے کہ جو اس میں چلا گیا اسے اس میں ہمیشہ کیلئے رہنا ہو گا۔ ایک بار جہنم رسید ہو جانے کے بعد واپسی کا کوئی امکان باقی نہ رہ جائے گا۔ جہنم ایک ایسی حقیقت ہے جس میں طرح طرح کے عذاب ہوں گے۔ اس قسم کے ابدی عذاب کا جب سامنا

کرنا پڑے گا تو جہنمی مایوس ہو جائیں گے۔ انہیں اس سے بچ جانے کی کوئی توقع نہیں رہے گی۔ قرآن میں اس صورتحال کو اس طرح بیان فرمایا گیا ہے:

وَ اَمَّا الَّذِیْنَ فَسَقُوْا فَمَاْوٰھُمُ النَّارُ ط کُلَّمَآ اَرَادُوْٓا اَنْ یَّخْرُجُوْا مِنْھَآ اُعِیْدُوْا فِیْھَا وَ قِیْلَ لَھُمْ ذُوْقُوْا عَذَابَ النَّارِ الَّذِیْ کُنْتُمْ بِهٖ تُکَذِّبُوْنَ○

''اور جنہوں نے فسق اختیار کیا ہے ان کا ٹھکانا دوزخ ہے۔ جب کبھی وہ اس سے نکلنا چاہیں گے اسی میں دھکیل دیئے جائیں گے اور ان سے کہا جائے گا کہ چکھو اب اسی آگ کے عذاب کا مزا جس کو تم جھٹلایا کرتے تھے''۔ (سورۃ السجدۃ : 20)

دوزخ کے عذاب

وَالَّذِیْنَ کَفَرُوْا بِاٰیٰتِنَا ھُمْ اَصْحٰبُ الْمَشْئَمَةِ○ عَلَیْھِمْ نَارٌ مُّؤْصَدَةٌ○

''اور جنہوں نے ہماری آیات کو ماننے سے انکار کیا وہ بائیں بازو والے ہیں ان پر آگ چھائی ہوئی ہوگی''۔ (سورۃ البلد : 19-20)

یوم حساب لوگوں کی تعداد کا شمار نہ ہوگا مگر یہ جم غفیر بھی منکرین حق کو یہ موقعہ فراہم نہیں کرے گا کہ وہ میدان حشر سے چھپ کر بھاگ جائیں جب اللہ کے روبرو کافروں کا فیصلہ سنا دیا جائے گا تو ان پر یہ لیبل لگ جائے گا ''بائیں بازو والے لوگ''۔ یہ وہ وقت ہوگا جب انہیں جہنم میں دھکیل دیا جائے گا۔ اب یہ تلخ حقیقت ان کی سمجھ میں آئے گی کہ دوزخ تو ان کا مستقل ٹھکانا ہوگا۔ وہ لوگ جن کو جہنم میں بھیجا جائے گا ان کے ساتھ ایک گواہ اور ایک ہانکنے والا ہوگا:

وَ نُفِخَ فِی الصُّوْرِ ط ذٰلِكَ یَوْمُ الْوَعِیْدِ○ وَجَآءَتْ کُلُّ نَفْسٍ مَّعَھَا سَآئِقٌ وَّ شَھِیْدٌ○ لَقَدْ کُنْتَ فِیْ غَفْلَةٍ مِّنْ ھٰذَا فَکَشَفْنَا عَنْكَ غِطَآءَكَ فَبَصَرُكَ الْیَوْمَ حَدِیْدٌ○ وَ قَالَ قَرِیْنُهٗ ھٰذَا مَالَدَیَّ عَتِیْدٌ○ اَلْقِیَا فِیْ جَھَنَّمَ کُلَّ کَفَّارٍ عَنِیْدٍ○ مَّنَّاعٍ لِّلْخَیْرِ مُعْتَدٍ مُّرِیْبِ○ الَّذِیْ جَعَلَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰھًا اٰخَرَ فَاَلْقِیٰهُ فِی الْعَذَابِ الشَّدِیْدِ○

''اور پھر صور پھونکا گیا۔ یہ ہے وہ دن جس کا تجھے خوف دلایا جاتا تھا ہر شخص اس حال میں آ گیا کہ اس کے ساتھ ایک ہانک کر لانے والا ہے اور ایک گواہی دینے والا۔ اس چیز کی طرف سے

تو غفلت میں تھا۔ ہم نے وہ پردہ ہٹا دیا جو تیرے آگے پڑا ہوا تھا اور آج تیری نگاہ خوب تیز ہے۔ اس کے ساتھی نے عرض کیا یہ جو میری سپردگی میں تھا حاضر ہے۔ حکم دیا گیا پھینک دو جہنم میں ہر کٹے کافر کو جو حق سے عناد رکھتا تھا' خیر کو روکنے والا اور حد سے تجاوز کرنے والا تھا۔ شک میں پڑا ہوا تھا اور اللہ کے ساتھ کسی دوسرے کو خدا بنائے بیٹھا تھا۔ ڈال دو اسے سخت عذاب میں''۔

(سورۃ ق 20-26)

کافروں کو اس خوفناک مقام تک جتھوں میں ہانک کر لایا جائے گا تاہم جہنم کو جانے والے راستے پر اس کا خوف منکرین حق کے دلوں میں پیدا ہو رہا ہوگا۔ آتش دوزخ کا خوفناک شور اور گھن گرج دور سے سنائی دے گی۔

اِذَآ اُلْقُوْا فِيْهَا سَمِعُوْا لَهَا شَهِيْقًا وَّ هِيَ تَفُوْرُo

''جب وہ اس میں پھینکے جائیں گے تو اس کے دھاڑنے کی ہولناک آواز سنیں گے اور وہ جوش کھا رہی ہوگی''۔ (سورۃ الملک : 7)

اس سورۃ سے ظاہر ہوتا ہے کہ منکرین خدا کو جب دوبارہ زندہ کیا جائے گا تو وہ یہ سمجھ جائیں گے کہ ان پر کیا عذاب نازل ہونے والا ہے۔ وہ بالکل تنہا اور اکیلے ہوں گے' کوئی دوست' عزیز یا حمایتی ان کی مدد کو موجود نہ ہوگا۔ اب ان کافروں میں اتنی سکت نہیں ہوگی کہ وہ گستاخی یا سرکشی یا مظاہرہ کر سکیں۔ وہ اپنی ساری خود اعتمادی کھو چکے ہوں گے وہ پھری ہوئی نگاہوں سے دیکھ رہے ہوں گے۔ ایک سورۃ میں اس لمحے کو یوں بیان فرمایا گیا ہے:

وَ تَرٰهُمْ يُعْرَضُوْنَ عَلَيْهَا خٰشِعِيْنَ مِنَ الذُّلِّ يَنْظُرُوْنَ مِنْ طَرْفٍ خَفِيٍّ ؕ وَ قَالَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ الْخٰسِرِيْنَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ وَ اَهْلِيْهِمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ اَلَآ اِنَّ الظّٰلِمِيْنَ فِيْ عَذَابٍ مُّقِيْمٍo

''اور تم اُن کو دیکھو گے کہ دوزخ کے سامنے لائے جائیں گے ذلت سے عاجزی کرتے ہوئے چھپی (اور نیچی) نگاہ سے دیکھ رہے ہونگے۔ اور مومن لوگ کہیں گے کہ خسارہ اُٹھانے والے تو وہ ہیں جنھوں نے قیامت کے دن اپنے آپ کو اور اپنے گھر والوں کو خسارے میں ڈالا۔ دیکھو کہ بے انصاف لوگ ہمیشہ کے دُکھ میں (پڑے) رہیں گے۔ (سورۃ الشوریٰ : 45)

دوزخ بھوک سے بھری ہوئی ہے۔ منکرین حق کیلئے اس کی بھوک کبھی نہ مٹ سکے گی۔

کافروں کی کثرت کے باوجود یہ ہل من مزید کا مطالبہ کرے گی:

يَوْمَ نَقُوْلُ لِجَهَنَّمَ هَلِ امْتَلَاْتِ وَ تَقُوْلُ هَلْ مِنْ مَّزِيْدٍo

''وہ دن جبکہ ہم جہنم سے پوچھیں گے کیا تو بھر گئی؟ اور وہ کہے گی کیا اور کچھ ہے؟''

(سورۃ قٓ : 30)

اللہ نے دوزخ کا ذکر قرآن میں یوں فرمایا ہے:

سَاُصْلِيْهِ سَقَرَ o وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا سَقَرُ o لَا تُبْقِيْ وَلَا تَذَرُ o لَوَّاحَةٌ لِّلْبَشَرِ o

''عنقریب میں اسے دوزخ میں جھونک دوں گا اور تم کیا جانو کہ کیا ہے وہ دوزخ؟ نہ باقی رکھے نہ چھوڑے۔ کھال جھلس دینے والی'' (سورۃ المدثر : 26-29)

مقفل دروازوں کے پیچھے کبھی نہ ختم ہونے والی زندگی

جونہی منکرین خدا دوزخ میں داخل ہو جائینگے اسکے دروازے بند کر کے مقفل کر دیئے جائینگے۔ یہ لوگ یقیناً سمجھ جائینگے کہ انہیں دوزخ میں جھونک دیا گیا ہے ایک ایسی جگہ جہاں انہیں ہمیشہ کیلئے رہنا ہے۔ بند دروازوں سے مراد یہ ہے کہ اب ان کی نجات کی کوئی صورت باقی نہیں رہ گئی۔ ان منکرین حق کی حالت کا ذکر اللہ نے یوں فرمایا ہے:

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِنَا هُمْ اَصْحٰبُ الْمَشْئَمَةِo عَلَيْهِمْ نَارٌ مُّؤْصَدَةٌo

''اور جنہوں نے ہماری آیات کو ماننے سے انکار کیا وہ بائیں بازو والے ہیں ان پر آگ چھائی ہوئی ہوگی''۔ (سورۃ البلد : 19-20)

قرآن میں اس عذاب کو عَذَابٌ عَظِيْمٌ ''دردناک عذاب'' کہا گیا ہے (سورۃ آل عمران: 176) اور اسی سورۃ میں ایک دوسری جگہ اسے عَزِيْزٌ ذُوانْتِقَامٍ ''برائی کا بدلہ'' کہا ہے (سورۃ آل عمران: 4) اور اسی سورۃ کی آیت 21 میں اسے بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ''دردناک سزا'' کہا گیا ہے۔ دوزخ کی سزا کے بارے میں یہ ساری تفصیلات بھی کم پڑ جائینگی۔ دنیا میں جو انسان معمولی سی آگ سے جل جانے کی تکلیف برداشت نہیں کرسکتا وہ ہمیشہ کیلئے دوزخ کی جس آگ میں جھونکا جائے گا اس کا تصور وہ کیسے کرسکتا ہے۔ دنیا کی آگ کی تکلیف اور اذیت کا جہنم کی آگ

کے عذاب کے ساتھ موازنہ کیا ہی نہیں جا سکتا۔ کوئی درد اور اذیت بھی جہنم کے عذاب جیسی نہیں ہو گی۔

فَيَوْمَئِذٍ لَّا يُعَذِّبُ عَذَابَهٗٓ اَحَدٌ ۝ وَّ لَا يُوْثِقُ وَثَاقَهٗٓ اَحَدٌ ۝

''پھر اس دن اللہ جو عذاب دے گا ویسا عذاب دینے والا کوئی نہیں اور اللہ جیسا باندھے گا ویسا باندھنے والا کوئی نہیں''۔ (سورۃ الفجر : 25-26)

دوزخ میں زندگی تو ہوگی مگر ایک ایسی زندگی جس کا ایک ایک لمحہ عذاب اور اذیت سے بھرا ہوا ہوگا۔ اس میں ہر قسم کا جسمانی، ذہنی، نفسیاتی عذاب شامل ہوگا۔ اس زندگی میں مختلف قسم کے عذاب اور رسوائیاں شامل ہوں گی۔ ان کا موازنہ اس دنیا کی کسی مصیبت سے کیا ہی نہیں جا سکتا۔

دوزخ میں لوگ تمام کے تمام پانچ حواس سے اذیت محسوس کریں گے۔ ان کی آنکھیں پریشان کن اور بھیانک منظر دیکھیں گی، ان کے کان ڈراؤنی چیخ و پکار سنیں گے، ان کی ناک کثیلی بدبو سونگھیں گی، ان کی زبانیں ناقابل برداشت کڑوے کسیلے ذائقے چکھیں گی۔ ان کی ایک ایک رگ میں جہنم کا گہرا احساس ہوگا۔ یہ ایسا پاگل بنا دینے والا درد ہوگا جس کا اس دنیا میں تصور بھی مشکل ہے۔ ان کی کھال، جسم کے اندرونی اعضاء اور پورا جسم تباہ ہو جائے گا اور وہ شدید درد سے تلملا اٹھیں گے۔

دوزخی درد کی مزاحمت کریں گے اور انہیں موت کبھی نہیں آئے گی اسی لئے وہ اپنے آپ کو عذاب جہنم سے کبھی بچا نہیں سکیں گے۔ قرآن میں ان کے اس درد کا ذکر یوں آیا ہے: فَمَآ اَصْبَرَهُمْ عَلَى النَّارِ ''کیسا عجب ہے ان کا حوصلہ کہ جہنم کا عذاب برداشت کرنے کیلئے تیار ہیں'' (سورۃ البقرۃ :175) ان کے جسم کی کھال جب جل جائے گی تو دوبارہ اس کی مرمت کر دی جائے گی۔ اس طرح وہی اذیت ہمیشہ کیلئے قائم رہے گی۔ ان کی اس اذیت کی شدت میں کبھی کمی نہیں آئے گی۔ قرآن میں اللہ دوبارہ فرماتا ہے: اِصْلَوْهَا فَاصْبِرُوْٓا اَوْ لَا تَصْبِرُوْا ۚ ''جاؤ اب جھلسو اس کے اندر، تم خواہ صبر کرو یا نہ کرو تمہارے لئے یکساں ہے''۔ (سورۃ الطور :16)

ذہنی اذیت بھی جہنم میں جسمانی اذیت سے کچھ کم نہ ہوگی۔ دوزخ میں لوگ بہت پچھتائیں گے، مایوسی کا شکار ہوں گے اور اسی مایوسی میں زمانے گزار دیں گے۔ دوزخ کا ہر ایک گوشہ، ہر جگہ

اس طرح بنائی گئی ہے کہ اس سے جہنمیوں کو ذہنی اذیت ملے۔ یہ عذاب دائمی ہوگا اسے کئی ملین اور بلین برسوں بعد ختم ہو جانا ہوتا تب بھی آس پیدا ہو جاتی کہ ایک روز اس سے نجات مل جائے گی اور جہنمی خوشی و مسرت کا اظہار کرتے۔ مگر عذاب کی ہمیشگی مایوسی پیدا کر دیتی ہے، جس کا دنیا کے کسی احساس سے موازنہ نہیں کیا جا سکتا۔

قرآن میں جو تفصیل بیان فرمائی گئی ہے اس کے مطابق جہنم ایک ایسی جگہ ہے جسمیں جہنمیوں کو شدید اذیت سے گزرنا ہوگا۔ یہ تنگ، شوروغل والا دھواں دار اور رنجیدہ کر دینے والا مقام ہوگا اس سے انسانوں کی روحوں میں عدم تحفظ کا احساس سرایت کر جاتا ہے، دلوں میں آگ بھڑک اُٹھتی ہے۔ کھانے پینے کو جو سخت ناپسندیدہ چیزیں ملیں گی، کپڑے آگ کے ہوں گے اور پینے کو پیپ ملے گی، ان سب چیزوں کا تصور ہلا کر رکھ دیتا ہے۔

یہ جہنم کے بارے میں بنیادی تفصیل ہے۔ تاہم اس ماحول میں بھی ایک زندگی گزاری جا رہی ہوگی۔ جہنمیوں کے حواس بہت تیز ہوں گے۔ وہ سنتے ہیں، باتیں کرتے ہیں اور بحث کرتے ہیں اور وہ عذاب سے بچنے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ آگ میں جلتے ہیں، انہیں بھوک پیاس محسوس ہوتی ہے اور پچھتاوے کا احساس ہوتا ہے۔ احساس جرم سے انہیں اذیت پہنچتی ہے اور زیادہ اہم بات یہ ہے کہ وہ اس درد سے نجات حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

جہنمی اس گندے اور تکلیف دہ ماحول میں ہمیشہ کیلئے زندہ رہیں گے اور ان کی زندگی جانوروں سے بھی بدتر ہوگی۔ انہیں کھانے کو کانٹے دار پھل اور زقوم کا درخت ملے گا۔ دوسری طرف پینے کو انہیں خون اور پیپ ملے گی۔ اسی اثناء میں انہیں آتش دوزخ ہر طرف سے گھیر لے گی۔ جہنم کی اذیت کا ذکر اس طرح کیا گیا ہے:

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا بِآيَاتِنَا سَوْفَ نُصْلِيهِمْ نَارًا ط كُلَّمَا نَضِجَتْ جُلُودُهُمْ بَدَّلْنَاهُمْ جُلُودًا غَيْرَهَا لِيَذُوقُوا الْعَذَابَ ط إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَزِيزًا حَكِيمًا ○

''جن لوگوں نے ہماری آیات کو ماننے سے انکار کر دیا ہے انہیں بالیقین ہم آگ میں جھونکیں گے اور جب ان کے بدن کی کھال گل جائے گی تو اس کی جگہ دوسری کھال پیدا کر دیں گے تاکہ وہ خوب عذاب کا مزا چکھیں۔ اللہ بڑی قدرت رکھتا ہے''۔ (سورۃ النساء : 56)

ان کی کھال پھٹ جائے گی، گوشت جل جائے گا اور تمام جسم پر خون بکھر جائے گا، اس حالت میں انہیں زنجیروں میں باندھ کر رکھا جائے گا اور کوڑے مارے جائینگے۔ ان کے ہاتھ گردنوں کے ساتھ بندھے ہوئے ہوں گے۔ اس حالت میں انہیں جہنم میں دھکیل دیا جائے گا۔ اس اثناء میں سزا دینے والے فرشتے ان لوگوں کو آگ میں جھونکیں گے جو اس سزا کے مستحق ہوں گے، ان کے لباس بھی آگ کے ہوں گے۔ جن کفنوں میں انہیں ڈھانپ کر رکھا گیا ہوگا وہ بھی آگ کے بن جائینگے۔

منکرین حق مسلسل چیخیں گے کہ انہیں اس عذاب سے بچا لیا جائے۔ مگر جواب میں انہیں اکثر مزید اذیت اور تکلیف ملے گی۔ انہیں اس اذیت و تکلیف میں اکیلے چھوڑ دیا جائے گا۔ دنیا میں جو اللہ کے نافرمان اور گستاخ تھے اب رحم کی درخواستیں کر رہے ہوں گے۔ مزید یہ کہ جہنم کے ایام ویسے نہیں ہوتے جیسے دنیا کے ہوتے ہیں اس لئے کہ دائمی عذاب کا ایک منٹ، ایک یوم، ایک ہفتہ مہینہ یا سال تو کبھی ختم نہ ہونے والا درد لئے ہوتا ہے۔

یہ سارے منظر سچ ثابت ہوں گے۔ یہ سب کے سب حقیقت پر مبنی ہیں۔ یہ تو ہماری روزمرہ زندگیوں سے زیادہ حقیقی ہیں: وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّعْبُدُ اللّٰهَ عَلٰى حَرْفٍ ''اور لوگوں میں کوئی ایسا ہے جو کنارے پر رہ کر اللہ کی بندگی کرتا ہے'' (سورۃ الحج : 11) جو یہ کہتے ہیں: ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ ''اور اگر دوزخ کی سزا ہم کو ملے گی بھی تو بس چند روز'' (سورۃ آل عمران : 24) اور وہ جو یہ سمجھتے ہیں کہ دولت، مقام و مرتبہ اور بڑے بڑے عہدے ان کی زندگیوں کا مقصد ہے اور جو اللہ کی خوشنودی کو نظر انداز کر دیتے ہیں، وہ جو اپنی آرزوں اور تمناؤں کے مطابق اللہ کے احکام کو تبدیل کر لیتے ہیں، جو اپنے مفادات کے مطابق قرآن کی تشریح کرتے ہیں اور وہ جو راہ راست سے بھٹک جاتے ہیں۔ مختصر یہ کہ تمام منکرین خدا اور منافقین جہنم میں رہیں گے، سوائے ان کے جن پر اللہ نے رحم کیا اور انہیں معاف فرما دیا اور وہ لوگ یوں بچ گئے۔ یہ اللہ کا فیصلہ کن فرمان ہے اور ایسا ہو کر رہے گا:

وَلَوْ شِئْنَا لَاٰتَيْنَا كُلَّ نَفْسٍ هُدٰىهَا وَلٰكِنْ حَقَّ الْقَوْلُ مِنِّيْ لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَ النَّاسِ اَجْمَعِيْنَ٥

''اگر ہم چاہتے تو پہلے ہی ہر نفس کو اس کی ہدایت دے دیتے۔ مگر میری وہ بات پوری ہو گئی

جو میں نے کہی تھی کہ میں جہنم کو جنوں اور انسانوں سب سے بھر دوں گا''۔(سورۃ السجدۃ:13)

جہنم کے بارے میں ایک حقیقت یہ بھی ہے کہ جہنم کیلئے ان لوگوں کو خاص طور پر تخلیق کیا گیا ہے جیسا کہ درج ذیل سورۃ میں ارشادِ باری تعالیٰ ہوتا ہے:

وَلَقَدْ ذَرَاْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيْرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ ۖ لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا ۚ وَلَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا ۚ وَلَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا ۗ اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ ۗ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ ۝

''اور یہ حقیقت ہے کہ بہت سے جن اور انسان ایسے ہیں جن کو ہم نے جہنم کیلئے پیدا کیا ہے۔ان کے پاس دل ہیں مگر وہ سوچتے نہیں۔ان کے پاس آنکھیں ہیں مگر وہ ان سے دیکھتے نہیں۔ان کے پاس کان ہیں مگر وہ ان سے سنتے نہیں۔وہ جانوروں کی طرح ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ گئے گزرے۔یہ وہ لوگ ہیں جو غفلت میں کھوئے گئے ہیں''۔ (سورۃ الاعراف : 179)

اس سارے عذاب کے باوجود جس میں سے جہنمی گزریں گے' ایک انسان بھی انہیں ایسا نہیں ملے گا جو ان کی مدد کر سکے۔کوئی انسان بھی انہیں اس عذاب سے نہ بچا سکے گا۔سب ساتھ چھوڑ جائیں گے اور اس احساس سے تنہائی کا بے حد تلخ احساس ہوگا۔ فَلَيْسَ لَهُ الْيَوْمَ هٰهُنَا حَمِيْمٌ ۝ ''لہٰذا آج اس کا یہاں کوئی غمخوار نہیں ہے'' (سورۃ الحاقۃ : 35) ان کے اردگرد صرف ''سزا دینے والے فرشتے'' ہوں گے۔جنہیں اللہ کی طرف سے احکامات حاصل ہوتے ہیں۔یہ فرشتے بہت سخت گیر' بے رحم اور خوفناک ہوں گے جن کے ذمہ جہنمیوں کو سخت عذاب دینا ہوگا۔ان فرشتوں کو ہر طرح کے رحم کے جذبات سے عاری بنایا گیا ہے۔وہ عذاب بھی دیتے ہیں اور دیکھنے میں بھی بڑے خوفناک ہیں ان کی آوازیں ڈراؤنی ہیں اور ان کی نگاہوں میں بے رحمی ملتی ہے۔ان کی موجودگی کا مقصد یہ ہے تاکہ اللہ کے خلاف بغاوت کرنے والوں سے بدلہ لیا جا سکے۔یہ اپنے فرض کو بڑی ذمہ داری اور توجہ سے نبھاتے ہیں۔ایسا ممکن ہی نہیں ہے کہ یہ فرشتے کسی کے ساتھ ''ترجیحی سلوک'' کریں یا رورعایت سے کام لیں۔

یہ دراصل وہ حقیقی خطرہ ہے جو اس دنیا میں ہر انسان کو لاحق ہے وہ انسان جو اپنے خالق کا نافرمان اور اس کا باغی ہے۔وہ بہت بڑے گناہ کا مرتکب ہو رہا ہے' بیشک اسے ایسا بدلہ ہی ملنا چاہئے۔اللہ نے انسان کو اس کے خلاف انتباہ فرمایا ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَ اَهْلِيْكُمْ نَارًا وَّ قُوْدُهَا النَّاسُ وَ الْحِجَارَةُ عَلَيْهَا مَلٰٓئِكَةٌ غِلَاظٌ شِدَادٌ لَّا يَعْصُوْنَ اللّٰهَ مَآ اَمَرَهُمْ وَ يَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ ٥

"اے لوگو جو ایمان لائے ہو بچاؤ اپنے آپ کو اور اپنے اہل وعیال کو اس آگ سے جس کا ایندھن انسان اور پتھر ہوں گے۔ جس پر نہایت تندخو اور سخت گیر فرشتے مقرر ہوں گے۔ جو کبھی اللہ کے حکم کی نافرمانی نہیں کرتے اور جو حکم بھی انہیں دیا جاتا ہے اسے بجالاتے ہیں"۔

(سورۃ التحریم : 6)

كَلَّا لَئِنْ لَّمْ يَنْتَهِ ۙ لَنَسْفَعًۢا بِالنَّاصِيَةِ ٥ نَاصِيَةٍ كَاذِبَةٍ خَاطِئَةٍ ٥ فَلْيَدْعُ نَادِيَهٗ ٥ سَنَدْعُ الزَّبَانِيَةَ ٥

"ہرگز نہیں اگر وہ باز نہ آیا تو ہم اس کی پیشانی کے بال پکڑ کر کھینچیں گے۔ اس پیشانی کو جو جھوٹی اور سخت خطا کار ہے۔ وہ بُلا لے اپنے حامیوں کی ٹولی کو ہم بھی فرشتوں کو بلا لیں گے"۔

(سورۃ العلق : 15-18)

حالت مایوسی ومحرومی

جہنمی مایوسی و نا اُمیدی کی حالت میں رہتے ہیں۔ جس اذیت اور عذاب سے وہ گزرتے ہیں وہ انتہائی بے رحمانہ اور کبھی نہ ختم ہونے والا ہوتا ہے۔ ان کی واحد امید یہی ہوتی ہے کہ وہ چیختے رہیں اور نجات کی التجا کرتے رہیں وہ جب جنت کے لوگوں کو دیکھتے ہیں تو پانی اور خوراک مانگتے ہیں وہ پچھتانے کی کوشش کرتے اور اللہ سے معافی کے خواستگار ہوتے ہیں۔ مگر ان سب کا انہیں کوئی فائدہ نہیں پہنچتا۔

یہ جہنم کے نگرانوں سے التجائیں کرتے ہیں۔ وہ ان کو اپنے اور اللہ کے درمیان ثالث بنا کر رحم کے طلبگار بنتے ہیں۔ ان کے عذاب کی تکلیف اسقدر نا قابل برداشت ہوتی ہے کہ وہ اس سے صرف ایک روز کیلئے بچ جانے کی خواہش بھی کرتے ہیں۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ فِي النَّارِ لِخَزَنَةِ جَهَنَّمَ ادْعُوْا رَبَّكُمْ يُخَفِّفْ عَنَّا يَوْمًا مِّنَ الْعَذَابِ ٥ قَالُوْٓا اَوَلَمْ تَكُ تَاْتِيْكُمْ رُسُلُكُمْ بِالْبَيِّنٰتِ ؕ قَالُوْا بَلٰى ؕ قَالُوْا

فَادْعُوْا ۚ وَمَا دُعٰٓؤُا الْكٰفِرِيْنَ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ ۝

''اور جولوگ آگ میں (جل رہے) ہونگے وہ دوزخ کے داروغوں سے کہیں گے کہ اپنے پروردگار سے دُعا کرو کہ ایک روز تو ہم سے عذاب ہلکا کردے۔ وہ کہیں گے کہ کیا تمہارے پاس تمہارے پیغمبر نشانیاں لیکر نہیں آئے تھے؟ وہ کہیں گے کیوں نہیں تو وہ کہیں گے تم ہی دُعا کرو اور کافروں کی دُعا (اس روز) بیکار ہوگی''۔ (سورۃ الغافر: 49-50)

منکرین خدا پھر بھی معافی کے خواستگار ہوتے ہیں مگر ان کی ساری التجائیں سختی سے رد کردی جاتی ہیں:

قَالُوْا رَبَّنَا غَلَبَتْ عَلَيْنَا شِقْوَتُنَا وَ كُنَّا قَوْمًا ضَآلِّيْنَ ۝ رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا مِنْهَا فَاِنْ عُدْنَا فَاِنَّا ظٰلِمُوْنَ ۝ قَالَ اخْسَئُوْا فِيْهَا وَ لَا تُكَلِّمُوْنِ ۝ اِنَّهٗ كَانَ فَرِيْقٌ مِّنْ عِبَادِيْ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اٰمَنَّا فَاغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا وَاَنْتَ خَيْرُ الرّٰحِمِيْنَ ۝ فَاتَّخَذْتُمُوْهُمْ سِخْرِيًّا حَتّٰٓى اَنْسَوْكُمْ ذِكْرِيْ وَ كُنْتُمْ مِّنْهُمْ تَضْحَكُوْنَ ۝ اِنِّيْ جَزَيْتُهُمُ الْيَوْمَ بِمَا صَبَرُوْٓا ۙ اَنَّهُمْ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ ۝

''وہ کہیں گے: اے ہمارے ربّ ہماری بدبختی ہم پر چھا گئی تھی ہم واقعی گمراہ لوگ تھے۔ اے پروردگار اب ہمیں یہاں سے نکال دے پھر ہم ایسا قصور کریں تو ظالم ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ جواب دے گا: دور ہو میرے سامنے سے پڑے رہو اسی میں اور مجھ سے بات نہ کرو۔ تم وہی لوگ تو ہو کہ میرے کچھ بندے جب کہتے تھے کہ اے ہمارے پروردگار ہم ایمان لائے ہمیں معاف کر دے ہم پر رحم کر تو سب رحیموں سے اچھا رحیم ہے تو تم نے ان کا مذاق بنالیا۔ یہاں تک کہ ان کی ضد نے تمہیں یہ بھی بھلا دیا کہ میں بھی کوئی ہوں اور تم ان پر ہنستے رہے آج ان کے اس صبر کا میں نے یہ پھل دیا ہے کہ وہی کامیاب ہیں''۔ (سورۃ المومنون: 106-111)

یہ دراصل اللہ کا جہنمیوں سے آخری خطاب ہے۔ اس کے الفاظ یہ ''دور ہو میرے سامنے سے پڑے رہو اسی میں اور مجھ سے بات نہ کرو'' فیصلہ کن اور حتمی ہیں۔ اس کے بعد اللہ نے جہنمیوں کے معاملے پر کبھی توجہ نہیں دی۔ ایسی صورت حال کا تو کوئی تصور بھی نہ کرنا چاہے گا۔

جس وقت جہنمی آگ میں جل رہے ہوں گے اس وقت وہ جو ''خوشی واطمینان اور نجات'' یا

چکے ہوں گے یعنی دوسرے لفظوں میں مومنین، وہ جنت میں کبھی نہ ختم ہونے والی نعمتوں سے لطف اندوز ہورہے ہوں گے۔ جہنمیوں کی اذیت میں اس وقت اور اضافہ ہو جاتا ہے جب وہ جنت میں رہنے والے مومنوں کی زندگی پر نگاہ ڈالتے ہیں۔ بیشک جب وہ ناقابل برداشت عذاب سے گزرتے ہیں اس وقت وہ جنت کی نعمتوں اور انعامات کو بھی ''دیکھ'' سکتے ہیں۔

''جو جنتوں میں ہوں گے وہ مجرموں سے پوچھیں گے۔ تمہیں کیا چیز دوزخ میں لے گئی؟ وہ کہیں گے: ہم نماز پڑھنے والوں میں سے نہ تھے اور مسکین کو کھانا نہیں کھلاتے تھے اور حق کے خلاف باتیں بنانے والوں کے ساتھ مل کر ہم بھی باتیں بنانے لگتے تھے اور روز جزا کو جھوٹ قرار دیتے تھے یہاں تک کہ ہمیں اس یقینی چیز سے سابقہ پیش آ گیا۔ اس وقت سفارش کرنے والوں کی کوئی سفارش ان کے کسی کام نہ آئے گی''۔ (سورۃ المدثر: 40-48)

وہ مومنین جن کا دنیا میں منکرین حق نے مذاق اور تمسخر اُڑایا تھا، اب ایک پرمسرت زندگی گزار رہے ہیں انہیں رہنے کیلئے عالیشان اور خوبصورت گھر دیئے گئے ہیں جن میں ان کیلئے خوبصورت اور حسین وجمیل دوشیزائیں ہیں اور لذیذ کھانے اور مشروبات ہیں۔ مومنوں کو اطمینان اور خوشی کی زندگی گزارتے دیکھ کر جہنمیوں کی پریشانی اور محرومی میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ جنت کے مناظر ان کے عذاب اور رنج وغم میں مزید اذیت کا اضافہ کرتے ہیں۔

ان کے پچھتاوے میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ انہیں اس بات کا گہرا دکھ محسوس ہوتا ہے کہ دنیا میں انہوں نے اللہ کے احکامات کی تعمیل کیوں نہ کی۔ پھر وہ جنت میں مومنوں کی طرف رجوع کرتے اور ان سے ہمکلام ہونے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ ان سے مدد اور ہمدردی کے طلبگار ہوتے ہیں۔ مگر ان کی یہ ساری کوششیں رائیگاں جاتی ہیں۔ جنتی بھی انہیں دیکھتے ہیں ان جنتیوں کی شاندار زندگی اور شکل وصورت انہیں اللہ کا اور شکر گزار بننے پر اکساتی ہے۔ جہنمیوں اور جنتیوں کے درمیان باہمی گفتگو کو درج ذیل سورۃ میں اس طرح بیان کیا گیا ہے:

فِیْ جَنّٰتٍ ﵺ يَتَسَآءَلُوْنَ ۝ عَنِ الْمُجْرِمِيْنَ ۝ مَا سَلَكَكُمْ فِیْ سَقَرَ ۝ قَالُوْا لَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّيْنَ ۝ وَلَمْ نَكُ نُطْعِمُ الْمِسْكِيْنَ ۝ وَكُنَّا نَخُوْضُ مَعَ الْخَآئِضِيْنَ ۝ وَكُنَّا نُكَذِّبُ بِيَوْمِ الدِّيْنِ ۝ حَتّٰى اَتٰنَا الْيَقِيْنُ ۝ فَمَا تَنْفَعُهُمْ شَفَاعَةُ الشّٰفِعِيْنَ ۝

''جو جنتوں میں ہوں گے وہ مجرموں سے پوچھیں گے۔ تمہیں کیا چیز دوزخ میں لے گئی؟ وہ

کہیں گے: ہم نماز پڑھنے والوں میں سے نہ تھے اور مسکین کو کھانا نہیں کھلاتے تھے اور حق کے خلاف باتیں بنانے والوں کے ساتھ مل کر ہم بھی باتیں بنانے لگے تھے اور روز جزا کو جھوٹ قرار دیتے تھے یہاں تک کہ ہمیں اس یقینی چیز سے سابقہ پیش آ گیا۔اس وقت سفارش کرنے والوں کی کوئی سفارش ان کے کسی کام نہ آئے گی"۔ (سورۃ المدثر : 40-48)

عذاب سے بچنے کیلئے ایک اہم یاددہانی

اس باب میں ہم نے دو قسم کے گروہوں کا ذکر کیا۔وہ جو اللہ پر یقین رکھتے ہیں اور وہ جو اس ذات باری تعالیٰ کے وجود کے منکر ہیں۔ہم نے جہنم کی ایک عام تصویر بھی پیش کی اور ایک جنت کی، جو مکمل طور پر قرآنی تفصیلات پر مبنی تھی۔ہمارا یہاں یہ مقصد بالکل نہیں ہے کہ مذہب سے متعلق معلومات فراہم کریں۔ہم تو منکرین حق کو یہ یاددہانی کرانا چاہتے ہیں کہ آخرت ان کیلئے بڑی خوفناک جگہ ہوگی اور ان کا انجام بڑا بھیانک ہوگا۔

جو کچھ اب تک کہا جا چکا ہے اس کے بعد یہ ضروری ہے کہ اس بات پر زور دیا جائے کہ انسان کو اپنا انتخاب خود کرنے کی پوری پوری آزادی حاصل ہے وہ جس طرح چاہے اپنی زندگی گزار سکتا ہے۔کسی انسان کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ دوسروں کو ایمان لانے پر مجبور کر سکے۔تاہم جس طرح کچھ لوگوں کو اللہ کے وجود کا یقین ہے اور وہ اس کے آخری عدل وانصاف پر ایمان رکھتے ہیں، ہم اسے اپنی ذمہ داری تصور کرتے ہیں کہ لوگوں کو ایسے خوفناک دن کے بارے میں متنبہ کریں۔یہ لوگ یقیناً اس صورت حال سے واقف نہیں ہوتے جو انہیں درپیش ہوتی ہے نہ ہی وہ اس قسم کے انجام سے باخبر ہوتے ہیں جو اُن کا منتظر ہو۔اسلئے انہیں متنبہ کرنا ہماری ذمہ داری بنتی ہے۔اللہ نے ایسے لوگوں کی حالت کے بارے میں اس طرح مطلع فرمایا ہے:

اَفَمَنْ اَسَّسَ بُنْيَانَهٗ عَلٰى تَقْوٰى مِنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانٍ خَيْرٌ اَمْ مَّنْ اَسَّسَ بُنْيَانَهٗ عَلٰى شَفَا جُرُفٍ هَارٍ فَانْهَارَ بِهٖ فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ۝

"پھر تمہارا کیا خیال ہے کہ بہتر انسان وہ ہے جس نے اپنی عمارت کی بنیاد خدا کے خوف اور اس کی رضا کی طلب پر رکھی ہو یا وہ جس نے اپنی عمارت ایک وادی کی کھوکھلی بے ثبات کگر پر اُٹھائی

اور وہ اسے لے کر سیدھی جہنم کی آگ میں جا گری؟ ایسے ظالم لوگوں کو اللہ کبھی سیدھی راہ نہیں دکھاتا''۔ (سورۃ التوبۃ : 109)

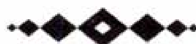
وہ لوگ جو اس دنیا میں اللہ کے احکام کی خلاف ورزی کرتے ہیں۔ خواہ یہ دانستہ ہو یا نادانستہ' اپنے خالق کے وجود سے انکار آخرت میں انہیں کوئی نجات نہ دلا سکے گا۔ اس لئے بغیر وقت ضائع کئے ہم میں سے ہر ایک کو اللہ کے رُوبرو اس صورت حال کے بارے میں سوچنا اور اس کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنا ہوگا۔ بصورت دیگر اسے ایک روز پچھتانا پڑے گا اور اس کا انجام بڑا بھیانک ہوگا:

رُبَمَا يَوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْ كَانُوْا مُسْلِمِيْنَ ۝ ذَرْهُمْ يَاْكُلُوْا وَ يَتَمَتَّعُوْا وَ يُلْهِهِمُ الْاَمَلُ فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ ۝

''بعید نہیں کہ ایک وقت وہ آجائے جب وہی لوگ جنہوں نے آج (دعوت اسلام قبول کرنے سے) انکار کر دیا ہے پچھتا پچھتا کر کہیں گے کہ کاش ہم نے سرِ تسلیم خم کر دیا ہوتا۔ چھوڑو انہیں کھائیں پئیں' مزے کریں اور بھلاوے میں ڈالے رکھے ان کو جھوٹی اُمید۔ عنقریب انہیں معلوم ہو جائے گا''۔ (سورۃ الحجر : 2-3)

دائمی سزا سے بچنے کا طریقہ اور دائمی مسرت جیتنے اور اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کی بات بڑی واضح ہے:

اس سے پہلے کہ بہت دیر ہو جائے' اللہ پر سچے دل سے ایمان لے آئیں۔
اُس کی خوشنودی حاصل کرنے کیلئے اپنی زندگی نیکی کے کاموں کیلئے وقف کر دیں۔



انتباہ

جس باب کا اب آپ مطالعہ کرنے چلے ہیں' یہ آپ کی زندگی کے ایک بے حد نازک راز پر سے پردہ اُٹھانے والا ہے۔

اسے بغور اور پورے انہماک سے پڑھیے کیونکہ یہ ایک ایسے موضوع سے متعلق ہے جو خارجی دنیا میں' آپ کے زاویہ نگاہ میں بنیادی تبدیلی لا سکتا ہے۔ اس باب کا موضوع محض ایک زاویۂ نگاہ ہی نہیں ہے' نہ یہ ایک مختلف اندازِ نظر ہے نہ روایتی فلسفیانہ فکر: یہ ایک ایسی حقیقت ہے جسے ہر انسان کو' اس پر یقین کرتے ہوئے یا نہ کرتے ہوئے' تسلیم کر لینا چاہئے اور یہ وہ حقیقت ہے جسے آج سائنس بھی ثابت کر چکی ہے۔

مادے کے بارے میں ایک بالکل مختلف نقطۂ نظر

وہ لوگ جو اپنے گردونواح پر غوروفکر کرتے ہیں انہیں اس بات کا احساس ہو جاتا ہے کہ اس کائنات کی جاندار اور بے جان چیزیں ضرور تخلیق کی گئی ہیں۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان تمام چیزوں کا ''خالق کون ہے؟''

یہ ایک کھلی حقیقت ہے کہ کائنات کی ہر شے میں تخلیق کا جو عمل دکھائی دیتا ہے وہ اس کائنات کے خودبخود وجود میں آجانے پر ممکن نہ تھا۔ مثال کے طور پر ایک کھٹمل کا خودبخود تخلیق ہو جانا ممکن نہ تھا۔ نظام شمسی نہ خود تخلیق ہو سکتا تھا نہ اس نظم وترتیب کے ساتھ قائم رہ سکتا تھا۔ نہ تو پودے، انسان، جرثومے، خون کے سرخ خلیے نہ ہی تتلیاں اپنے آپ پیدا ہو سکتی تھیں۔ اس بات کا امکان ہی نہیں کہ یہ سب ''اتفاقاً'' وجود میں آگئے ہوں گے، بلکہ اس کا تو تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔

چنانچہ ہم درج ذیل فیصلے پر پہنچتے ہیں:

ہر شے جو ہمیں نظر آتی ہے اسے تخلیق کیا گیا ہے مگر جو چیزیں ہمیں نظر آتی ہیں ''خالق'' نہیں ہو سکتیں۔ جو چیزیں ہمیں نظر آتی ہیں ان کا خالق ان سے مختلف بھی ہے اور ان سب سے بالا وعظیم تر بھی۔ وہ ایک ایسی نہ نظر آنے والی ہستی ہے جس کی موجودگی اور صفات ہر شے سے جھلکتی ہیں۔

یہ وہ بات ہے جس پر وہ لوگ اعتراض کرتے ہیں جو اللہ کے وجود سے انکار کرتے ہیں۔ ان کی شرط یہ ہوتی ہے کہ جب تک وہ اس ذات بے ہمتا کو اپنی نظروں سے دیکھ نہ لیں گے اس وقت تک اس پر ایمان نہیں لائیں گے۔ یہ لوگ جو ''تخلیق'' کی حقیقت کو نظر انداز کرتے ہیں کائنات میں پھیلی ہوئی ''تخلیق کی حقیقت'' کو بھی نظر انداز کر دیتے ہیں۔ اور غلط ثبوت پیش کرتے

ہیں کہ یہ کائنات اور اس کی اشیاء تخلیق نہیں کی گئی ہیں اس سلسلے میں نظریۂ ارتقاء ان کی بے سود کوششوں کی ایک بڑی مثال ہے۔

وہ لوگ جو اللہ کا انکار کرتے ہیں ان کی بنیادی غلطی یہ ہے کہ وہ ان لوگوں کے ساتھ شامل ہو جاتے ہیں جو فی الحقیقت اللہ کے وجود سے منکر نہیں ہوتے بلکہ اس ذات باری تعالیٰ کا غلط ادراک کرتے ہیں۔ یہ تخلیق سے انکار نہیں کرتے بلکہ اللہ ''کہاں'' ہے کے بارے میں توہم پرستانہ عقائد رکھتے ہیں۔ ان میں سے اکثر کا خیال یہ ہوتا ہے کہ اللہ ''عرش'' پر ہے۔ وہ چپ چاپ یہ تصوّر لئے پھرتے ہیں کہ اللہ ایک بہت بڑے سیارے کے پیچھے موجود ہے اور کبھی کبھار ''دنیاوی معاملات'' میں مداخلت کر لیتا ہے۔ یا یہ کہ وہ کبھی بھی مداخلت نہیں کرتا۔ اور اس نے اس کائنات کو تخلیق کیا پھر اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا اور لوگوں کو اپنے مقدر کا فیصلہ خود کرنے کے لئے ان کے رحم و کرم پر رہنے دیا۔

کچھ دوسرے ایسے ہیں جنھوں نے یہ سن رکھا ہے کہ قرآن میں اس بات کا ذکر آیا ہے کہ اللہ ''ہر جگہ'' موجود ہے مگر وہ اس بات کا ادراک نہیں کر سکتے کہ اس کا اصل مطلب کیا ہے۔ ان کے خیال میں اللہ ہر شے پر اسی طرح محیط ہے جس طرح ریڈیائی لہریں یا نہ نظر آنے والی، غیر مادی گیس ہو۔

تاہم یہ تصوّر اور دوسرے اعتقادات جو اس بات کو واضح نہیں کر پاتے کہ اللہ ''کہاں'' ہے (اور ہو سکتا ہے یہ اس کا انکار اسی وجہ سے کرتے ہوں) تمام کی بنیاد ایک مشترکہ غلطی ہے۔ بغیر کسی بنیاد کے وہ تعصب کا شکار ہو جاتے ہیں اور پھر اللہ کے بارے میں غلط آراء قائم کر لیتے ہیں۔ یہ تعصب کیا ہوتا ہے؟

یہ تعصب مادے کی نوعیت اور اس کے خواص کے بارے میں ہوتا ہے۔ ہم مادے کے وجود کے بارے میں ایسے ایسے مفروضے قائم کر لیتے ہیں کہ ہم نے کبھی یہ سوچنے کی زحمت ہی گوارا نہیں کی کہ یہ موجود ہے یا نہیں یا یہ محض ایک سایہ ہے۔ جدید سائنس اس تعصب کو ختم کر دیتی ہے اور ایک نہایت اہم مرعوب کن حقیقت منکشف کرتی ہے۔ درج ذیل صفحات میں ہم اس حقیقت کی وضاحت کرنے کی کوشش کریں گے جس کی طرف قرآن پاک نے بھی اشارہ کیا ہے۔

برقی اشاروں کی دنیا

جس دنیا میں ہم رہتے ہیں اس کے بارے میں تمام معلومات ہم تک ہمارے حواس خمسہ کے ذریعے پہنچی ہے۔ ہم جس دنیا کو جانتے ہیں وہ مشتمل ہے اس پر جو ہم اپنی آنکھوں سے دیکھتے، ہاتھوں سے چھوتے، ناک سے سونگھتے، زبان سے چکھتے اور اپنے کانوں سے سنتے ہیں۔ ہم یہ کبھی نہیں سوچتے کہ وہ "خارجی" دنیا اس سے مختلف بھی ہوسکتی ہے جسے ہمارے حواس ہم تک پہنچاتے ہیں کیونکہ ہم تو اپنے روز پیدائش سے لے کر اب تک صرف ان ہی حواس پر انحصار کرتے چلے آ رہے ہیں۔

تاہم مختلف شعبوں میں جدید سائنسی تحقیق ایک بالکل مختلف سوجھ بوجھ کی جانب اشارہ کرتی ہے اور ہمارے حواس سے متعلق اور ان کے ذریعے ہم جس دنیا کا ادراک کرتے ہیں اس کے بارے میں شک وشبے کو جنم دیتی ہے۔

اس نقطہ نظر کا آغاز اس بات سے ہوتا ہے کہ ایک "خارجی دنیا" کا تصور جو ہمارے ذہن میں بنتا ہے وہ تو برقی اشاروں سے ہمارے ذہنوں میں تخلیق ہونے والی شکل کا جواب ہوتا ہے۔

کسی شے سے آنے والی نقول یا بہروپ برقی اشاروں میں تبدیل ہو جاتے ہیں اور دماغ میں ایک اثر پیدا کرتے ہیں۔ جب ہم ان کو "دیکھتے" ہیں تو دراصل ہم ان برقی اشاروں کے اثرات اپنے دماغوں میں دیکھ رہے ہوتے ہیں۔



کسی شے سے آنے والی نقول یا بہروپ برقی اشاروں میں تبدیل ہو جاتے ہیں اور دماغ میں ایک اثر پیدا کرتے ہیں۔ جب ہم ان کو "دیکھتے" ہیں تو دراصل ہم ان برقی اشاروں کے اثرات اپنے دماغوں میں دیکھ رہے ہوتے ہیں۔

سیب کی سرخی، لکڑی کی سختی مزید یہ کہ آپ کی ماں، باپ، آپ کا خاندان اور ہر وہ شے جو آپ کی ملکیت ہے، آپ کا گھر، نوکری، اور اس کتاب کی سطور سب کچھ ان برقی اشاروں سے بنتا ہے۔

فریڈرک ویسٹر اس بات کی وضاحت کرتا ہے جس پر سائنس اس موضوع کے حوالے سے پہنچی ہے:

کچھ سائنسدانوں کے بیانات کہ ''انسان ایک عکس ہے ایک تصویر ہے، ہر وہ شے جو اس کے تجربے میں آتی ہے، عارضی اور پرفریب ہے اور یہ کائنات ایک ظل ہے ایک سایہ ہے'' آج سائنس نے لگتا ہے اسے ثابت کر دیا ہے۔

مشہور فلسفی جارج برکلے اس موضوع پر اس طرح تبصرہ کرتا ہے:

ہم مختلف اشیاء کی موجودگی پر یقین اس لئے رکھتے ہیں کہ ہم انہیں دیکھتے اور چھوتے ہیں اور وہ ہمارے ادراک کے ذریعے منعکس ہوتی ہیں۔ تاہم ہمارا ادراک صرف ہمارے دماغ میں موجود خیالات پر مبنی ہوتا ہے۔ گویا یہ اشیاء جنہیں ہم اپنے ادراک کے ذریعے ذہن میں جگہ دیتے ہیں سوائے ہمارے خیالات کے کچھ نہیں ہوتیں اور یہ خیالات لازماً سوائے ہمارے دماغ کے کہیں اور نہیں ہوتے۔ چونکہ یہ سب صرف ہمارے ذہن میں موجود ہوتا ہے اس لئے اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہم اس وقت فریب میں آ جاتے ہیں جب ہم اپنے دماغ سے باہر کی دنیا اور اس میں موجود چیزوں کے بارے میں تصوّر کرتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ گردونواح کی چیزوں کا ہمارے دماغ سے باہر کوئی وجود نہیں ہوتا۔

اس موضوع کو مزید واضح کرنے کے لئے آیئے ہم اپنی بصری حس پر غور کرتے ہیں جو ہمیں خارجی دنیا کے بارے میں ایک نہایت وسیع معلومات مہیا کرتی ہے۔

ہم دیکھتے، سنتے اور چکھتے کیسے ہیں؟

دیکھنے کا عمل ایک بہت تدریجی طریقے سے حاصل ہوتا ہے۔ روشنی کے فوٹون (Photons) جو کسی شے سے نکل کر آنکھ تک پہنچتے ہیں آنکھ کے سامنے والے حصے میں موجود عدسے (Lens) میں سے پار ہوتے ہیں جہاں یہ ٹوٹ کر پیچھے کی طرف آنکھ کے عقب میں واقع پردۂ چشم پر گرتے ہیں۔ یہاں گرنے والی یہ روشنی برقی اشاروں میں تبدیل ہو جاتی ہے جنہیں عصابیے (Neurons) ایک ایسے چھوٹے سے نقطے کی جانب منتقل کر دیتے ہیں جس کو مرکز نگاہ

کہتے ہیں اَور جو دماغ کے پچھلے حصے میں ہوتا ہے۔ دماغ میں اس مرکز نگاہ میں اس برقی اشارہ کا ادراک ایک عمل کی مختلف شکلوں کے بعد ایک تصویر کی مانند کیا جاتا ہے۔ دراصل دیکھنے کا فعل دماغ کے پچھلے حصے میں موجود اس چھوٹے سے نقطے میں واقع ہوتا ہے جہاں گھپ اندھیرا ہوتا ہے اور جو روشنی سے بالکل علیحدہ کر دیا گیا ہوتا ہے۔

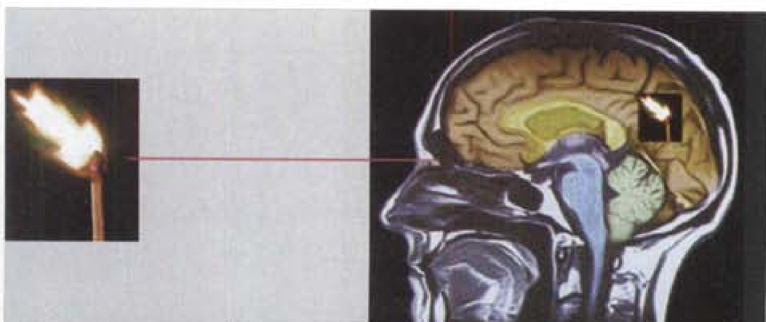
آیئے اب ہم اس بظاہر معمولی اور غیر اہم عمل پر از سرنو غور کرتے ہیں۔ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ ہم ''دیکھتے'' ہیں تو دراصل ہم ان محرکات کے اثرات کو دیکھ رہے ہوتے ہیں جو ہماری آنکھوں تک پہنچ رہے ہوتے ہیں اور جو برقی اشاروں میں تبدیل ہو جانے کے بعد ہمارے دماغ میں جذب ہوتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ ''ہم دیکھتے ہیں'' تو ہم دراصل اپنے دماغ میں برقی اشاروں کو دیکھ رہے ہوتے ہیں۔

ہم اپنی زندگی میں جن تصویروں کو دیکھتے ہیں وہ سب کی سب ہمارے مرکز نگاہ میں متشکل ہو رہی ہوتی ہیں۔ جو کتاب اس وقت آپ پڑھ رہے ہیں اور افق پر دیکھے گئے لاتعداد مظاہر فطرت اس چھوٹی سی جگہ میں سما جاتے ہیں۔ ایک اور بات جسے ذہن میں رکھنا ضروری ہے، جیسا کہ ہم نے پہلے بھی یہ بات دیکھی کہ دماغ کو روشنی سے جدا کر دیا جاتا ہے؛ اس کے اندر کا حصہ بالکل تاریک ہوتا ہے اور دماغ کا روشنی کے ساتھ کوئی رابطہ نہیں رہتا۔

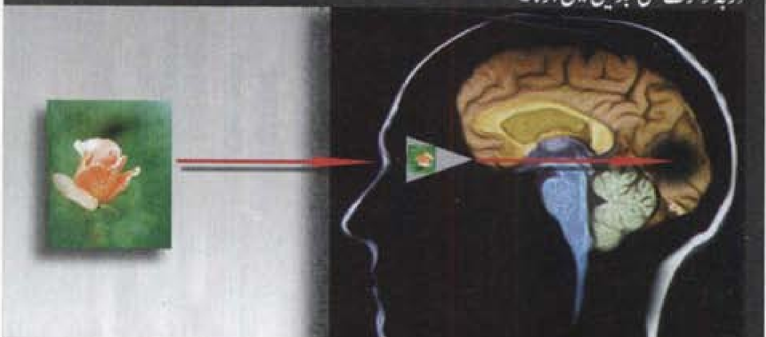
ہم اس دلچسپ صورت حال کو ایک مثال کے ذریعہ بیان کر سکتے ہیں۔ فرض کیجئے کہ ہمارے سامنے ایک جلتی ہوئی موم بتی ہے ہم اس موم بتی کے سامنے، اس پار بیٹھ سکتے ہیں جہاں جلتی ہوئی موم بتی ہمارے سامنے رکھی ہوتی ہے اور ہم اسے کچھ فاصلے سے دیکھتے ہیں۔ تاہم اس دوران ہمارے دماغ کا اس موم بتی کی اصل روشنی کے ساتھ براہ راست کوئی رابطہ نہیں ہوتا۔ ہم جس وقت موم بتی کی روشنی کو دیکھتے ہیں تو ہمارے دماغ کا اندرونی حصہ بالکل تاریک ہوتا ہے۔ ہم اپنے تاریک دماغ کے اندر ایک رنگین اور روشن دنیا دیکھ سکتے ہیں۔

دیکھنے کے حیرت انگیز پہلو کی وضاحت آر ایل گریگوری اس طرح کرتا ہے۔ ایک ایسا عمل جسے ہم اس قدر قابل تسلیم سمجھتے ہیں:

''ہم دیکھنے کے عمل سے اس قدر مانوس ہیں کہ اس بات کا احساس کرنے کے لئے کہ کافی مسائل حل طلب ہیں، تصور ایک زقند لیتا ہے۔ ہمیں آنکھ کے اندر چھوٹی چھوٹی الٹی پلٹی تصویریں دی جاتی ہیں اور ہم اردگرد علیحدہ ٹھوس اشیاء دیکھتے ہیں۔ پردۂ چشم پر نظر آنے والی نقالی یا بہروپ



جس لمحے ہم آگ کی روشنی اور گرمی محسوس کرتے ہیں ہمارا دماغ اندر سے بالکل تاریک ہوتا ہے اور اس کا درجہ حرارت کبھی تبدیل نہیں ہوتا۔



روشنی کی کرنیں چھند کی شکل میں ایک شے سے نکل کر پردۂ چشم پر اوپر سے نیچے کی سمت پڑ رہی ہیں۔ یہاں تصویر برقی اشاروں میں تبدیل ہو جاتی ہے اور نظر کے مرکز تک اس کی ترسیل ہو جاتی ہے، جو دماغ کے پچھلے حصے میں ہوتا ہے۔ دماغ چونکہ روشنی سے الگ کر دیا جاتا ہے اس لئے روشنی کے لئے ممکن نہیں رہتا کہ وہ نظر کے مرکز تک پہنچ سکے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہم روشنی کی ایک وسیع دنیا اور گہرائی ایک چھوٹے سے نقطے میں دیکھتے ہیں، جسے روشنی سے الگ کر دیا گیا ہو۔

کے نمونوں میں ہم مختلف اشیاء کی دنیا دیکھتے ہیں اور یہ کسی معجزے سے کم بات تو نہیں ہوتی۔ اسی صورت حال کا اطلاق ہمارے دیگر حواس پر ہوتا ہے جو برقی اشاروں کی شکل میں دماغ کو منتقل کیئے جاتے ہیں۔ سماعت، لمس، ذائقہ اور قوت شامہ اور جن کا ادراک دماغ کے متعلقہ مراکز میں ہوتا ہے۔"

روشنی کی وہ کرنیں جمع ہو کر پردۂ چشم پر الٹی پلٹی گرتی ہیں، جو کسی شے سے خارج ہو رہی ہوں۔ یہاں تصویر برقی اشاروں میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ اور دماغ کے پچھلے حصے میں واقع پردۂ چشم کی طرف منتقل ہو جاتی ہے۔ دماغ چونکہ روشنی سے جدا کر دیا جاتا ہے اس لئے روشنی مرکز نگاہ

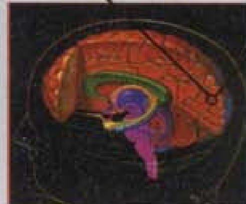
تک نہیں پہنچ سکتی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم ایک ایسے چھوٹے سے نقطے میں روشنی کی ایک وسیع اور گہری دنیا دیکھتے ہیں جسے روشن سے جدا کر دیا گیا ہو۔

حس سماعت بھی اسی طرح کام کرتی ہے۔ کان کا بیرونی حصہ لالہ گوش (Auricle) کے ذریعے آوازوں کو پکڑ کر انہیں کان کے وسطی حصے کی جانب بھیج دیتا ہے؛ کان کا درمیانی حصہ آواز کی لہروں کو تیز تر کر کے اندرونی حصے میں ارسال کر دیتا ہے؛ کان کا اندرونی حصہ ان صوتی لہروں کو برقی اشاروں میں تبدیل کر کے دماغ میں بھیج دیتا ہے۔ جیسا کہ آنکھ کے معاملے میں ہوتا ہے سماعت کا فعل دماغ میں مرکز سماعت میں حتمی شکل اختیار کرتا ہے۔ دماغ جس طرح روشنی سے جدا کر دیا جاتا ہے اسی طرح یہ آواز سے الگ کر دیا جاتا ہے اس لئے باہر جس قدر شور وغل بھی ہو دماغ کے اندر مکمل خاموشی ہوتی ہے۔

تاہم دماغ نہایت نازک ولطیف آوازوں کا ادراک بھی کر لیتا ہے۔ یہ اس قدر درستگی اور صحت کے ساتھ ہوتا ہے کہ ایک صحت مند انسان کا کان کسی بھی قسم کے ماحولیاتی شور اور مداخلت کے بغیر ہر بات صاف صاف سن سکتا ہے۔ آپ اپنے دماغ میں، جسے آواز سے جدا کر دیا گیا ہو، آرکیسٹرا پر نغمے سن سکتے ہیں کسی پر ہجوم جگہ کی شور وغل والی آوازیں سن سکتے ہیں اور پتے کی کھڑکھڑاہٹ سے لے کر جیٹ ہوائی جہاز کی کان کے پردے پھاڑ دینے والی آوازوں تک کا صحیح صحیح ادراک کر سکتے ہیں۔ تاہم اگر اس وقت آپ کے دماغ کی صوتی سطح کی کسی حساس آلے سے

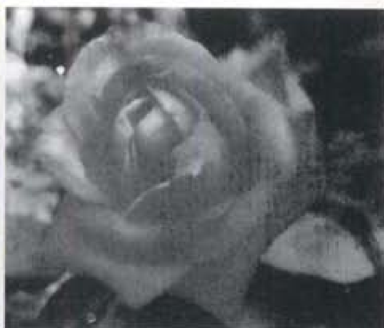






وہ تمام تصاویر جن کو ہم اپنی زندگیوں میں دیکھتے ہیں وہ ہمارے دماغ کے پچھلے حصے میں نظر کے مرکز میں متشکل ہوتی ہیں۔ یہ مرکز دماغ میں چند مربع سینٹی میٹر جگہ گھیرتا ہے۔ جو کتاب اس وقت آپ پڑھ رہے ہیں وہ اور وہ وسیع منظر جو آپ افق پر نگاہ ڈالتے وقت دیکھتے ہیں دونوں اس چھوٹی سی جگہ میں سما جاتے ہیں۔ اس لئے ہم چیزوں کو خارجی دنیا میں اس جسامت کے ساتھ نہیں دیکھتے جو ان کی اصل جسامت ہوتی ہے بلکہ ہم انہیں اس جسامت میں دیکھتے ہیں جس کا ادراک ہمارا دماغ کرتا ہے۔





جس طرح ایک عام انسان بائیں طرف دی گئی تصویر میں گلاب کی رنگت کو دیکھتا ہے ایک رنگ کور (Colour-blind) اسی گلاب کے پھول کو خاکستری رنگ میں دیکھے گا دونوں میں سے ''صحیح'' رنگ کون سا ہے؟

پیائش کی جائے تو پتہ چلے گا کہ وہاں مکمل خاموشی ہے۔

ہماری حس شامہ، یعنی مہک اور بو باس سونگھنے کی حس بھی اسی طرح متشکل ہوتی ہے۔ طیران پذیر سالمے (Volatile molecules) جو ونیلا (VANILLA) یا گلاب کے پھولوں سے خارج ہوتے ہیں ناک کے ان نازک بالوں میں پہنچتے ہیں جو اس کے برحلمہ حصے (Epithelium region) میں ہوتے ہیں تو ایک باہمی تعامل (Interaction) میں شامل ہو جاتے ہیں۔ اس باہمی تعامل کو برقی اشاروں کی شکل میں دماغ میں ارسال کر دیا جاتا ہے جہاں اس کا ادراک بطور خوشبو یا مہک کے کیا جاتا ہے۔ ہم جو کچھ بھی سونگھتے ہیں، یہ خوشبو ہو کہ بدبو یہ ان طیران پذیر سالموں کا باہمی تعامل ہوتا ہے جنہیں برقی اشاروں کی شکل میں تبدیل کر دیا گیا ہو اور جس کا ادراک اب دماغ نے کیا ہو۔ آپ عطر کی خوشبو، پھول یا اپنی پسندیدہ خوراک کی خوشبو سونگھتے ہیں، یا سمندر کے پانیوں کی بو یا دوسری خوشبوئیں جن کو آپ کا دماغ پسند یا ناپسند کرتا ہے، کا ادراک آپ کا دماغ کرتا ہے۔ یہ سالمے خود بخود کبھی دماغ تک نہیں پہنچ سکتے۔ جس طرح وہ آواز یا تصویر جو آپ کے ذہن میں پہنچتی ہے وہ برقی اشارے ہوتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں وہ تمام خوشبوئیں جو آپ پیدائش سے اب تک یہ سمجھتے ہیں کہ بیرونی اشیاء سے تعلق رکھتی ہیں محض وہ برقی اشارے ہوتے ہیں جنہیں آپ اپنے حسیاتی اعضاء کے ذریعے محسوس کرتے ہیں۔

اسی طرح چار قسم کے کیمیائی آخذ (Chemical Receptors) انسانی زبان کے سامنے والے حصے میں ہوتے ہیں۔ یہ نمکین، میٹھے، کھٹے اور تلخ ذائقوں سے متعلق ہوتے ہیں۔

ذائقہ چکھنے والے یہ آخذ بہت سی کیمیائی عمل پذیری کے بعد ہمارے ادراک کو برقی اشاروں میں تبدیل کردیتے ہیں اور پھر انہیں دماغ کو ارسال کردیتے ہیں۔ جب آپ پسندیدہ چاکلیٹ یا پھل کھاتے ہیں تو جو مزہ آپ کو آتا ہے وہ برقی اشاروں کی دماغ کے ذریعے تشریح ہوتی ہے۔ آپ باہر موجود کسی شے تک نہ کبھی پہنچ سکتے ہیں، نہ اسے دیکھ سکتے ہیں نہ سونگھ سکتے ہیں نہ ہی چاکلیٹ کو چکھ سکتے ہیں۔

مثال کے طور پر اگر ذائقہ معلوم کرنے والی رگیں جو دماغ تک جارہی ہیں کٹ جائیں تو اس لمحے جو کچھ آپ کھائیں گے کسی کا ذائقہ بھی آپ کے دماغ تک نہ پہنچ سکے گا اور آپ چکھنے کی حس سے مکمل طور پر محروم ہوجائیں گے۔

اس مقام پر ایک اور حقیقت ہمارے سامنے آتی ہے: ہم یہ بات کبھی بھی وثوق سے نہیں کہہ سکتے کہ ایک خوراک کھاتے وقت جو ذائقہ ہم محسوس کرتے ہیں ایک دوسرا شخص وہی خوراک کھاتے وقت ویسا ہی ذائقہ محسوس کرے گا۔ یا جب ہم کوئی آواز سنتے ہیں تو جو ادراک ہمیں ہوتا ہے وہی آواز سن کر ویسا ہی ادراک ایک دوسرے شخص کو بھی ہوگا۔ اس حقیقت پر لنکن بارنٹ کہتا ہے کہ کوئی بھی شخص یہ نہیں جان سکتا کہ ایک دوسرا انسان سرخ رنگ کا ادراک کررہا ہے یا وہ بھی اس کی طرح ''سی'' سر سے لطف اندوز ہورہا ہے۔

ہماری چھونے کی حس دوسروں کی اس حس سے مختلف نہیں ہوتی۔ جب ہم کسی شے کو چھوتے ہیں تو وہ تمام معلومات جو خارجی دنیا اور اشیاء کو پہچاننے میں ہماری مدد کرسکتی ہے ہماری جلد پر موجود حسی رگوں کے ذریعے دماغ کو ارسال کردی جاتی ہے۔ چھونے کا احساس ہمارے دماغ میں متشکل ہوجاتا ہے۔ عام عقیدہ کے برعکس وہ جگہ جہاں ہم چھونے کے احساس کا ادراک کرتے ہیں وہ ہماری اپنی انگلیوں پر یا جلد پر فوری یادداشت میں نہیں آتے بلکہ ہمیں اس کا ادراک اپنے دماغ میں چھونے کے مرکز (مرکز لمس) پر ہوجاتا ہے۔ دماغ کے اس اندازے کے نتیجے میں جو وہ ان ہیجانوں کے بارے میں لگاتا ہے جو اشیاء سے آرہے ہوتے ہیں ہم مختلف طرح کی حسی کیفیتیں ان اشیاء کے بارے میں محسوس کرتے ہیں مثلاً سختی یا نرمی یا ان کے گرم و سرد ہونے کے بارے میں۔ ہم کسی شے کو پہچاننے کے لئے وہ تمام تفصیلات ان ہیجانوں سے متعلق دو مشہور فلسفیوں رسل اور L.Wittgeinstein کے خیالات میں دیکھتے ہیں۔ ان کو ہم ذیل کی سطور میں پیش کررہے ہیں:

مثال کے طور پر یہ کہ ایک لیمو واقعی وجود رکھتا ہے یا نہیں اور یہ کیسے وجود میں آیا، نہ تو اسے تشریح طلب بنایا جا سکتا ہے نہ اس کی تحقیق کی جا سکتی ہے۔ لیمو کی موجودگی کا پتہ زبان اسے صرف چکھ کر دے سکتی ہے، خوشبو کے بارے میں ناک سونگھ کر بتا سکتی ہے، رنگ و شکل کے بارے میں آنکھ دیکھ کر بتا سکتی ہے اور صرف اس کے ان خدوخال کو معائنے اور جائزے کا موضوع بنایا جا سکتا ہے۔ سائنس طبعی دنیا کو کبھی نہیں جان سکتی۔

ہمارے لئے یہ ممکن نہیں کہ ہم طبعی دنیا تک پہنچ سکیں۔ ہمارے اردگرد کی تمام چیزیں مجموعہ ادراک ہیں مثلاً دیکھنا، سننا، اور چھونا۔ مرکز نگاہ اور دوسرے مراکز احساس کے اعداد و شمار کو ایک خاص عمل سے گزار کر دماغ کا ہماری ساری زندگی کے دوران خارجی دنیا کے مادے کی ''اصلیت'' سے کبھی آمنا سامنا نہیں ہوا بلکہ اصل کی وہ نقل جو ہمارے دماغ کے اندر متشکل ہوتی ہے وہ اسی کو دیکھتا ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں ہم اس مفروضے سے بھٹک جاتے ہیں کہ یہ نقول ہماری خارجی دنیا کے اصل مادے کی مثالیں ہیں۔

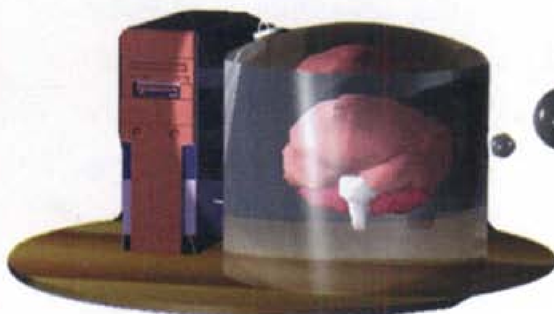
''خارجی دنیا'' ہمارے دماغ کے اندر

اب تک جو طبعی حقائق بیان کئے جا چکے ہیں ان کے نتیجے میں ہم درج ذیل نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں۔ ہر وہ شے جسے ہم دیکھتے، چھوتے، سنتے اور مادے کے طور پر جس کا ادراک کرتے ہیں، ''دنیا'' یا ''کائنات'' سوائے ان برقی اشاروں کے کچھ بھی نہیں ہیں جو ہمارے دماغ میں پیدا ہوتے ہیں۔

جب کوئی انسان پھل کھا رہا ہو تو دراصل اس کا سامنا اصل پھل سے نہیں ہوتا بلکہ اس کے ادراک سے ہوتا ہے جو دماغ میں پیدا ہوتا ہے۔ وہ انسان جسے ''پھل'' تصور کرتا ہے وہ دراصل پھل کی شکل، ذائقے، خوشبو اور اس کی بناوٹ کے برقی نقش پر مشتمل ہوتا ہے جو اس کے دماغ میں بنتا ہے۔ اگر بصارت کی رگ جو دماغ تک جا رہی ہے اچانک کٹ جاتی ہے تو پھل کی تصویر فوراً غائب ہو جائے گی۔ یا ناک کے اندر سے دماغ تک جانے والی حسی رگ منقطع ہو جاتی ہے تو سونگھنے کی حس بری طرح متاثر ہوگی۔ اس بات کو مزید سادہ و آسان طریقے سے یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ پھل ماسوا دماغ کی طرف سے برقی اشاروں کی، کی جانے والی تشریح کے کچھ بھی نہیں ہے۔

مصنوعی ہیجانات کے نتیجے میں ایک طبعی دنیا جو اتنی ہی اصلی اور حقیقت پسندانہ ہوگی جتنی کہ اصلی، طبعی دنیا کی موجودگی کے بغیر ہمارے دماغ میں تشکیل پا سکتی ہے۔ ان مصنوعی ہیجانات کے نتیجے میں ایک شخص یہ خیال کر سکتا ہے کہ وہ کار چلا رہا ہے جبکہ دراصل وہ اپنے گھر میں بیٹھا ہوا ہے۔





ایک اور قابل غور بات حس فاصلہ ہے۔ فاصلہ، مثلاً ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ آپ کے اور اس کتاب کے درمیان فاصلہ، آپ کے دماغ میں تشکیل پانے والا احساس خالی پن یا احساس خلاء ہے۔ اس انسان کے خیال میں جو چیزیں دور نظر آتی ہیں دماغ میں بھی موجود ہیں۔ مثال کے طور پر کسی شخص کو آسمان پر جو ستارے نظر آتے ہیں وہ انہیں اپنے آپ سے کئی ملین نوری سال دور تصور کرتا ہے مگر جو ستارے اسے نظر آ رہے ہیں وہ درحقیقت اس کے اپنے اندر مرکز نگاہ میں موجود ہیں۔

جس وقت آپ یہ سطریں پڑھتے ہیں آپ دراصل کمرے میں نہیں ہیں جیسا کہ آپ سمجھتے ہیں؛ اس کے برعکس کمرہ آپ کے اندر ہے۔ آپ کا اپنے جسم کو دیکھنا آپ کے ذہن میں یہ خیال لاتا ہے کہ آپ اس کے اندر ہیں۔ تاہم آپ کو یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ آپ کا جسم بھی ایک ایسی شبیہ ہے جو آپ کے دماغ کے اندر بن چکی ہے۔

اسی کا اطلاق آپ کے باقی کے ہر ادراک پر ہوتا ہے۔ مثلاً جب آپ کو یہ خیال آتا ہے کہ آپ کو اگلے کمرے میں ٹی وی کی آواز آ رہی ہے تو آپ دراصل اپنے دماغ کے اندر اس آواز کے

تجربے سے گزر رہے ہوتے ہیں۔ آپ نہ تو یہ ثابت کر سکتے ہیں کہ ایک کمرہ آپ کے کمرے سے ملحقہ ہے۔ نہ یہ کہ یہ آواز اس ٹی وی سے آ رہی ہے جو اس کمرے میں رکھا ہوا ہے۔ وہ آواز جسے آپ سمجھتے ہیں کہ چند میٹر کے فاصلے سے آ رہی ہے اور کسی ایسے انسان کی باتوں کی آواز جو آپ کے بالکل قریب ہے دونوں کا ادراک آپ کے دماغ کے اندر چند مربع سینٹی میٹر کے مرکز میں ہو رہا ہوتا ہے۔ اس مرکز ادراک سے ہٹ کر کوئی بھی دائیں، بائیں، سامنے، پیچھے کا تصور موجود نہیں ہوتا۔ یعنی آواز آپ تک دائیں جانب سے نہیں آتی، نہ بائیں طرف سے نہ فضا سے؛ کوئی ایسی سمت نہیں ہوتی جہاں سے آواز آ رہی ہو۔

جو کچھ آپ سونگھتے ہیں وہ عمل بھی اسی طرح کا ہوتا ہے؛ ان میں سے کوئی بھی آپ تک طویل فاصلے سے نہیں پہنچتی۔ آپ یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ آپ کے سونگھنے کے مرکز میں جو حتمی اثرات مرتب ہوتے ہیں وہ باہر موجود چیزوں کی خوشبو ہے۔ تاہم جس طرح ایک گلاب کی شبیہ آپ کے مرکز نگاہ میں ہوتی ہے اسی طرح اس گلاب کی خوشبو آپ کے سونگھنے کے مرکز میں ہوتی ہے؛ باہر نہ گلاب ہوتا ہے نہ اس کی خوشبو۔

ہمارے ادراک جس ''خارجی دنیا'' کو ہمارے سامنے پیش کرتے ہیں ان برقی اشاروں کا مجموعہ ہوتی ہے جو ہمارے دماغ میں پہنچ رہے ہوتے ہیں۔ عمر بھر ان اشاروں کو ہمارا دماغ ایک عمل سے گزارتا رہتا ہے اور ہم اس حقیقت کو پہچانے بغیر اپنی زندگیاں گزار دیتے ہیں کہ ہم سے ''خارجی دنیا'' میں موجود ان چیزوں کو اصلی جاننے میں غلطی سرزد ہوئی ہے۔ ہم اس لئے بھٹک گئے ہوتے ہیں کیونکہ ہم اپنے حواس کے ذریعے اصل مادے تک کبھی نہیں پہنچ پاتے۔

مزید یہ کہ ہم جن اشاروں کو ''خارجی دنیا'' سمجھ رہے ہوتے ہیں ایک بار پھر ہمارا دماغ ہی ان کی تشریح کر رہا ہوتا ہے اور انہیں کچھ معنی پہنا رہا ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر آیئے ہم حس سماعت (قوت سامعہ) کی بات کرتے ہیں۔ دراصل ہمارا دماغ صوتی لہروں کو ''خارجی دنیا'' میں ایک سر یا نغمہ و آہنگ میں تبدیل کرتا ہے۔ یعنی موسیقی بھی ایک ادراک ہے جسے ہمارا دماغ تخلیق کرتا ہے۔ اسی طرح جب ہم ان رنگوں کو دیکھتے ہیں جو ہماری نظروں تک پہنچتے ہیں تو یہ محض وہ برقی اشارے ہوتے ہیں جو مختلف طول موج (Wave length) کے ہوتے ہیں۔

یہاں پھر ہمارا دماغ ہی ان اشاروں کو رنگوں میں تبدیل کرتا ہے۔ ورنہ ''خارجی دنیا'' میں کوئی رنگ نہیں ہوتے۔ نہ سیب سرخ ہوتا ہے، نہ آسمان نیلگوں نہ اشجار سبز۔ وہ ایسے اس لئے نظر

آتے ہیں کہ ہم ان کا ادراک اس طرح کرتے ہیں۔ ''خارجی دنیا'' کا انحصار مکمل طور پر ادراک کرنے والے پر ہوتا ہے۔

پردۂ چشم میں معمولی سا نقص بھی رنگوندھیا (Colour Blindness) پیدا کر دیتا ہے۔ کچھ لوگوں کو نیلا رنگ سبز نظر آتا ہے کچھ کو سرخ، نیلا اور کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جنہیں تمام رنگ خاکستری رنگ ہی کی مختلف شکلیں دکھائی دیتے ہیں۔ اس صورتحال میں اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا خواہ باہر کی شے رنگین ہے یا نہیں۔

مشہور مفکر برکلے نے بھی اس حقیقت پر یوں اظہار خیال کیا ہے:

ابتداء میں یہ سمجھا جاتا تھا کہ رنگ اور خوشبوئیں وغیرہ ''حقیقت میں'' ایک وجود رکھتی ہیں مگر پھر ان نظریات کو مسترد کر دیا گیا تھا۔ اور یہ سمجھا جانے لگا تھا کہ ان سب کا انحصار ہمارے حواس (Sensations) پر ہے۔

ہمیں مختلف چیزیں رنگین کیوں نظر آتی ہیں اس کا سبب یہ نہیں کہ وہ رنگدار ہیں یا ان کا ہمارے باہر ایک آزاد مادی وجود ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ وہ تمام خواص جو ہم ان اشیاء سے منسوب کرتے ہیں ''خارجی دنیا'' میں نہیں بلکہ ہمارے اپنے اندر ہوتے ہیں۔ تو پھر اس ''خارجی دنیا'' میں کیا باقی رہ جاتا ہے؟

کیا ''خارجی دنیا'' کا وجود ناگزیر ہے؟

اب تک ہم نے ''خارجی دنیا'' اور اپنے دماغ میں ادراک سے تشکیل پانے والی دنیا کا ذکر بار بار کیا ہے۔ ان میں سے مؤخر الذکر وہ ہے جسے ہم دیکھتے ہیں۔ تاہم چونکہ ہم ''خارجی دنیا'' تک فی الحقیقت کبھی نہیں پہنچ سکتے تو پھر ہمیں یہ یقین کیسے آجائے کہ اس قسم کی دنیا کا واقعی کوئی وجود ہے؟

دراصل ہم یقین کر بھی نہیں سکتے۔ چونکہ ہر شے ہمارے ادراک کا مجموعہ ہوتی ہے اور وہ ادراک صرف ہمارے ذہن میں موجود ہوتے ہیں اس لئے یہ کہنا زیادہ درست ہوگا کہ وہ دنیا جو فی الحقیقت وجود رکھتی ہے وہ ہمارے ادراک کی دنیا ہے۔ صرف ایک ہی ایسی دنیا ہے جسے ہم جانتے ہیں اور وہ ہے وہ دنیا جو ہمارے ذہنوں میں موجود ہوتی ہے: وہ جو ایک شکل رکھتی ہے، ذہنوں میں ریکارڈ ہو جاتی ہے اور وہاں نمایاں بنا دی جاتی ہے۔ مختصراً وہ جو ہمارے ذہن میں تخلیق کی جاتی

ہے۔ یہی وہ واحد دنیا ہے جس کا ہمیں یقین ہو سکتا ہے۔

ہم یہ بات کبھی ثابت نہیں کر سکتے کہ ہم اپنے دماغ میں جس ادراک کا مشاہدہ کرتے ہیں کوئی مادی باہمی ربط رکھتے ہیں۔ ہو سکتا ہے وہ ادراک ایک ''مصنوعی'' منبع سے آ رہے ہوں۔

اس کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔ غلط اور نادرست ہیجانات ہمارے دماغ میں ایک بالکل تصوراتی ''مادی دنیا'' پیدا کر سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر آیئے ایک ایسے ترقی یافتہ ریکارڈ کرنے والے آلے کے بارے میں سوچتے ہیں، جس میں تمام قسموں کے برقی اشارے ریکارڈ کئے جا سکتے ہیں۔ آیئے ہم سب سے پہلے متعلقہ اعداد و شمار کو اس آلے میں ان کو برقی اشاروں میں تبدیل کر کے ایک خاص ترکیب کے لئے ارسال کرتے ہیں (جس میں جسم کی شبیہ بھی شامل ہو)۔ ثانیاً ہم یہ تصور کرتے ہیں کہ آپ کا دماغ جسم کے بغیر زندہ رہ سکتا ہے اور آخر میں ہم اس آلہ ریکارڈنگ کو دماغ کے ساتھ ان برقی مورچیوں (Electrodes) کے ذریعے اور پہلے سے ریکارڈ شدہ اعداد و شمار (Data) کو دماغ میں بھیجیں گے۔ اس صورت حال میں آپ کو یہ محسوس ہوگا کہ آپ اس مصنوعی طور پر تخلیق شدہ ترکیب میں رہ رہے ہیں۔ مثال کے طور پر آپ بڑی آسانی کے ساتھ اس بات پر یقین کر سکتے ہیں کہ آپ کسی شاہراہ پر تیز گاڑی چلا رہے ہیں۔ یہ بالکل ممکن نہیں ہوتا کہ آپ یہ سمجھنے لگیں کہ آپ کا وجود صرف آپ کے دماغ پر مشتمل ہے۔ ایسا اس لئے ہے کہ آپ کے دماغ کے اندر جس شے کی ضرورت ہے کہ وہ ایک دنیا تشکیل دے سکے، وہ حقیقی دنیا کا وجود نہیں ہے بلکہ ہیجانات کا میسر آنا ہے۔ یہ یقیناً ممکن ہے کہ یہ ہیجانات ایک مصنوعی ماخذ مثلاً ایک (Recorder) صوت نگار مشین سے آ رہے ہوں۔ اس سلسلے میں مشہور سائنسدان و فلسفی برٹرینڈ رسل لکھتا ہے:

جہاں تک قوت لامسہ کا تعلق ہے جب ہم کسی میز کو اپنی انگلیوں سے تھپتھپاتے ہیں تو سر انگشت کے الیکٹرون اور پروٹون میں خلل پیدا کرتے ہیں، یہ خلل جدید طبیعات کے مطابق میز میں موجود الیکٹرون اور پروٹون کے قرب سے پیدا ہوتا ہے۔ اگر کسی اور طرح سے ہمارے سر انگشت میں یہ خلل پیدا ہو جائے تو میز کے بغیر بھی ہمارے اندر انگیخت پیدا ہوگی۔

ہم بیشک بڑی آسانی کے ساتھ یقینی ادراک کا دھوکہ کھا جائیں گے حالانکہ کوئی مادی باہمی ربط حقیقی صورت میں موجود نہ ہوگا۔

ہمیں اس قسم کا تجربہ اکثر اپنے خوابوں میں ہوتا ہے۔ ہمیں اپنے خوابوں میں مختلف

واقعات پیش آتے ہیں، ہم لوگوں کو دیکھتے ہیں ہمیں چیزیں نظر آتی ہیں اور مختلف چیزوں کی ایسی ترکیب نظر آتی ہے جو بالکل اصل دکھائی دیتی ہوں تاہم یہ سوائے ہمارے ادراک کی پیداوار کے کچھ بھی نہیں ہوتا۔ ایک خواب اور ''حقیقی دنیا'' میں کوئی بنیادی فرق نہیں ہوتا، دونوں کا تجربہ دماغ میں ہوتا ہے۔

مدرک (محسوس کرنے والا) کون ہے؟

جیسا کہ ہم اب تک یہ ذکر کرتے آئے ہیں کہ اس حقیقت میں کوئی شبہ نہیں کہ وہ دنیا جس کے بارے میں ہم یہ سمجھتے ہیں کہ ہم اس میں بس رہے ہیں اور وہ جسے ہم ''خارجی دنیا'' کہتے ہیں ہمارے دماغ کے اندر تخلیق ہوتی ہے۔ تاہم اس بارے میں یہاں ایک بنیادی نوعیت کا سوال ذہنوں میں پیدا ہوتا ہے۔ اگر وہ تمام طبعی واقعات جنہیں ہم جانتے ہیں درونِ دماغ پیدا ہونے والے ادراک ہیں تو پھر یہ ہمارا دماغ کیا ہے؟ ہمارا دماغ چونکہ طبعی دنیا کا ایک حصہ ہے جیسے ہمارا بازو، ٹانگ یا کوئی دوسرا عضو، اسے بھی دوسری چیزوں کی مانند ایک ادراک اور احساس ہی ہونا چاہئے۔

خوابوں کے بارے میں دی جانے والی ایک مثال اس موضوع کو مزید واضح کر دے گی۔ ہم فرض کر لیتے ہیں کہ اب تک ہم نے جو کچھ کہا اس کے مطابق ہم اپنے دماغ کے اندر ایک خواب دیکھتے ہیں۔ خواب میں ایک تصوّراتی جسم ہوتا ہے، ایک تصوّراتی بازو، تصوّراتی آنکھ اور ایک تصوّراتی دماغ۔ اگر ہم سے دورانِ خواب یہ سوال کیا جائے ''تم کہاں دیکھتے ہو؟'' ہم جواب دیں گے: ''میں اپنے دماغ میں دیکھتا ہوں''۔ حالانکہ کوئی ایسا دماغ تو وجود ہی نہیں رکھتا جس کا ذکر کیا جائے البتہ ایک تصوّراتی سر اور تصوّراتی دماغ ضرور موجود ہوتا ہے۔

ان ذہنی تصاویر کو دیکھنے والا عالم خواب کا تصوّراتی دماغ نہیں ہوتا بلکہ یہ تو ایک ''اصلی وجود'' ہوتا ہے جو اس سے بہت زیادہ ''اعلیٰ و برتر'' ہوتا ہے۔

ہم یہ جانتے ہیں کہ ایک خواب کا تانا بانا اور وہ ترکیب و ترتیب جسے ہم حقیقی زندگی کہتے ہیں دونوں میں کوئی طبعی امتیاز نہیں ہوتا۔ چنانچہ جب ہم سے اس عالم حقیقی میں، جسے ہم حقیقی زندگی کہتے ہیں درج بالا سوال ''تم کہاں دیکھتے ہو؟'' پوچھا جائے گا تو یہ جواب دینا کہ ''اپنے دماغ میں'' بے معنی ہوگا۔ جیسا کہ درج بالا مثال میں دیا گیا ہے۔ دونوں صورتوں میں وہ وجود جو دیکھتا اور ادراک

کرتا ہے دماغ نہیں ہے۔ جو گوشت کا ایک ٹکڑا ہی تو ہے۔

جب ہم دماغ کا تجزیہ کرتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ اس میں سوائے شحمی اور لحمیاتی سالموں کے کچھ بھی نہیں ہے۔ جو دوسرے جاندار نامیاتی اجسام میں بھی پائے جاتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ گوشت کا وہ ٹکڑا جسے ہم ''دماغ'' کہتے ہیں تصوّراتی شبیہات کو دیکھنے کے لئے شعور وآگاہی یا اس وجود کو تخلیق کرنے کے لئے جسے ''میں خود'' (Myself) کہتے ہیں، کچھ بھی نہیں ہے۔ دماغ میں جن تصوّراتی شبیہات کا ادراک ہوتا ہے اس سے متعلق لوگ جو غلطی کرتے ہیں آر ایل گریگوری اس حوالہ سے یوں کہتا ہے:

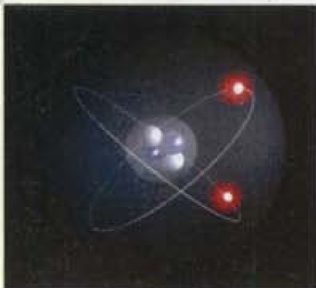
انسان کو اس رغبت سے بچنے کی کوشش کرنی چاہئے جو یہ ہے کہ وہ یہ کہنا چاہتا ہے کہ آنکھیں دماغ کے اندر تصاویر بناتی ہیں۔ جو تصویر دماغ میں بنتی ہے وہ اس ضرورت کا تقاضا کرتی ہے کہ کوئی اندرونی آنکھ اسے دیکھنے والی ہونی چاہئے۔ مگر اس کی تصویر دیکھنے کے لئے مزید ایک آنکھ درکار ہوگی...... اور یہ سلسلہ جاری رہے گا جو آنکھوں اور تصاویر کی مراجعت پر ختم ہوگا۔ یہ بڑی مبہم سی بات لگتی ہے۔

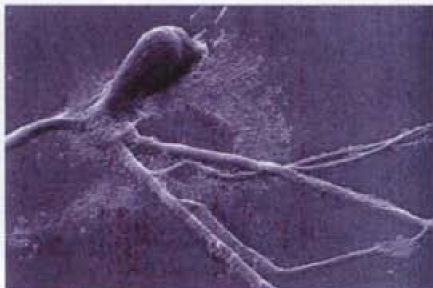
یہی تو وہ بات ہے جو ان مادہ پرستوں کو، جو سوائے مادے کے کسی شے کو سچ نہیں سمجھتے، حیران و پریشان کر دیتی ہے۔ وہ ''اندرونی آنکھ'' کس کی ہوتی ہے، جو دیکھتی ہے اور ادراک کرتی ہے اس کا جو یہ دیکھتی ہے اور جس پر ردعمل کا اظہار کرتی ہے؟ Karl Pribram نے بھی دنیائے سائنس و فلسفہ میں اس اہم سوال پر توجہ مرکوز کی کہ مدرک (ادراک، احساس کرنے والا) کون ہے:

چونکہ یونانی فلسفی ''مشین میں بھوت''، ''چھوٹے سے انسان کے اندر ایک اور چھوٹا سا انسان'' وغیرہ کے بارے میں سوچتے رہے ہیں۔ وہ ''میں'' کہاں ہے۔ وہ شخص جو اپنا دماغ استعمال کرتا ہے؟ جاننے کے فعل کا احساس جس کو ہوجاتا ہے وہ کون ہے؟ جیسا کہ Assisi کے سینٹ فرانسس نے کہا:

''وہ جس کی ہمیں تلاش ہوتی ہے وہ دیکھنے والا ہوتا ہے''۔

اب اس بات پر غور کیجئے: وہ کتاب جو آپ کے ہاتھ میں ہے، کمرہ جس کے اندر آپ ہیں، مختصر یہ کہ وہ تمام تصوّراتی شبیہات جو آپ کے سامنے ہیں وہ آپ کے دماغ کے اندر دیکھی جاتی ہیں۔ کیا یہ وہ جوہر (ایٹم) ہیں جو ان تصوّراتی شبیہات کو دیکھتے ہیں؟ اندھے، بہرے، بے خبر اور بے شعور ایٹم؟ ایسا کیوں ہے کہ کچھ ایٹم یہ خصوصیت حاصل کر لیتے ہیں جبکہ کچھ نہیں کر سکتے؟ کیا





دماغ خلیوں کا ایک ڈھیر ہے جو لحمیات اور چربیلے سالموں سے بنا ہوا ہے۔ اس میں عصبی خلیے ہوتے ہیں۔ اس گوشت کے ٹکڑے میں کوئی ایسی طاقت نہیں ہوتی جس سے یہ تصوّراتی شبیہات دیکھ سکے، عقل و شعور اور باخبری پیدا کر سکے یا اس وجود کو تخلیق کر سکے جسے ہم "میں خود" کہتے ہیں۔

ہمارے سوچنے، سمجھنے، یاد رکھنے، خوش و ناخوش ہونے کے فعل اور ہر ایک شے ان ایٹموں میں پیدا ہونے والے برقیمائی (Electrochemical) ردعمل پر مشتمل ہوتی ہے۔

جب ہم ان سوالات پر غور و فکر کرتے ہیں تو ہمیں پتہ چلتا ہے کہ ان ایٹموں میں مرضی و ارادے کی تلاش کوئی عقلمندی تو نہیں ہے۔ یہ بات بالکل واضح ہے کہ جو وجود دیکھتا، سنتا اور محسوس کرتا ہے وہ ماورائے مادہ کوئی وجود ہے۔ یہ وجود "زندہ" ہے اور یہ نہ مادہ ہے نہ مادے کی تصوّراتی شبیہ۔ یہ وجود ان ادراک کے ساتھ مل جاتا ہے جو اس کے سامنے ہوتے ہیں اور اس کے لئے وہ ہمارے جسم کی تصوّراتی شبیہ استعمال کرتا ہے۔

یہ وجود "رُوح" ہے۔ ادراک کا مجموعہ جسے ہم "مادی دنیا" کہتے ہیں وہ خواب ہے جسے روح دیکھتی ہے۔ جس طرح وہ جسم جو ہمارے پاس ہے اور وہ مادی دنیا جسے ہم خواب میں دیکھتے ہیں، کی کوئی اصلیت نہیں اسی طرح وہ کائنات جو ہمارے پاس ہے اور جسم جو ہم رکھتے ہیں کی بھی کوئی مادی حقیقت نہیں ہے۔

اصل وجود تو روح کا ہے۔ مادہ تو محض ان ادراک پر مشتمل ہوتا ہے جنہیں روح دیکھتی ہے۔ وہ ذہین لوگ جو یہ سطور لکھتے اور پڑھتے ہیں ان میں سے ہر ایک ایٹموں اور سالموں اور اس کیمیائی ردعمل کا ڈھیر نہیں ہے جو ان کے درمیان پیدا ہوتا ہے بلکہ ایک "روح" ہے۔

حقیقی قادر مطلق

یہ تمام حقائق ہمیں ایک نہایت اہم سوال کے روبرو لا کھڑا کرتے ہیں۔ اگر وہ مادی دنیا

جسے ہم تسلیم کرتے ہیں محض ان ادراک پر مشتمل ہے جنہیں ہماری روح دیکھتی ہے تو پھر ان ادراک کا منبع وماخذ کیا ہے؟

اس سوال کا جواب دیتے وقت ہمیں درج ذیل حقیقت پر غور کرنا ہوگا: مادے کے وجود میں قوت خود اختیاری نہیں ہوتی۔ مادہ چونکہ ایک ادراک ہے، یہ ایک ''مصنوعی'' شے ہے اس سے مراد یہ ہے کہ یہ ادراک کسی اور طاقت نے پیدا کیا ہے یعنی اسے کسی نے ضرور تخلیق کیا ہے۔ مزید یہ کہ اس تخلیق کو تسلسل کے ساتھ ہونا چاہئے۔ اگر یہ تخلیق لگاتار اور تسلسل کے ساتھ نہ ہو تو پھر جسے ہم مادہ کہتے ہیں غائب اور معدوم ہو جائے گا۔ اس کی مثال ایک ٹیلی ویژن سے دی جا سکتی ہے جس پر تصویر اس وقت تک آتی رہتی ہے جب تک ایک اشارہ نشر ہوتا رہتا ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ کون ہے جو ہماری روح کو وہ ستارے، زمین، سیارے، لوگ، ہمارا جسم اور ہر ایک شے دکھاتا ہے جسے ہم دیکھتے ہیں؟

یہ بات بالکل واضح اور عیاں ہے کہ ایک خالق عظیم موجود ہے، جس نے پوری مادی کائنات تخلیق کی ہے جو ادراک کا لب لباب ہے۔ اور جو ہستی کہ لگاتار اپنی تخلیق جاری رکھے ہوئے ہے۔ یہ خالق اس قدر حسین وجمیل مخلوق تخلیق کر رہا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ اس کے پاس اس کی دائمی قوت وطاقت ہے یہ خالق اپنا تعارف خود ہم سے کراتا ہے۔ اس نے حیات کی کائنات کے اندر ایک کتاب تخلیق کی ہے۔ اسی نے یہ کتاب تخلیق کی، اور اس کتاب کے ذریعے اپنے بارے میں ہمیں بتایا، کائنات کے بارے میں بتایا اور ہمیں ہماری وجہ تخلیق سے آگاہ کیا۔

اس خالق کا نام اللہ ہے اور اس کی کتاب قرآن پاک ہے۔ یہ حقائق کہ آسمان وزمین یعنی کائنات پائیدار نہیں ہے اور ان کی موجودگی کو صرف اللہ کی تخلیق نے ممکن بنایا ہے اور جب وہ اس تخلیق کو ختم کردے گا تو یہ سب کچھ مٹ جائے گا۔ اس ساری بات کا ذکر قرآن پاک کی درج ذیل سورۃ میں بیان فرمادیا گیا ہے:

إِنَّ اللَّهَ يُمْسِكُ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ أَنْ تَزُولَا ۚ وَلَئِنْ زَالَتَا إِنْ أَمْسَكَهُمَا مِنْ أَحَدٍ مِّنْ ۢ بَعْدِهٖ ۗ إِنَّهٗ كَانَ حَلِيمًا غَفُورًا ○

''حقیقت یہ ہے کہ اللہ ہی ہے جو آسمانوں اور زمین کو ٹل جانے سے روکے ہوئے ہے اور اگر وہ ٹل جائیں تو اللہ کے بعد کوئی دوسرا انہیں تھامنے والا نہیں ہے۔ بیشک اللہ بڑا حلیم اور درگزر فرمانے والا ہے''۔ (سورہ فاطر: ۴۱)

جیسا کہ ہم ابتدائی صفحات میں بتا چکے ہیں کچھ لوگ اللہ کے بارے میں صحیح علم نہیں رکھتے اور اسی لئے وہ یہ سمجھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کہیں آسمانوں میں رہتا ہے اور دنیاوی معاملات میں مداخلت نہیں کر رہا۔ اس منطق کی بنیاد دراصل اس تصور میں پوشیدہ ہے کہ یہ کائنات مادے کے باہم مل جانے سے وجود میں آئی ہے اور اللہ اس مادی دنیا سے ''باہر'' ایک دور دراز مقام پر رہتا ہے۔ چند جھوٹے مذاہب میں اللہ کا عقیدہ اس سمجھ بوجھ تک محدود ہے۔

تاہم جیسا کہ ہم نے اب تک اس بات پر غور وفکر کیا مادہ صرف حواس (Sensations) سے ترکیب پا کر وجود میں آیا ہے۔ اور واحد قادر مطلق اللہ کی ذات ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ صرف اللہ ہی ہے جو موجود ہے: ماسوا اللہ کے ہر شے ایک سایہ ہے پرچھائیں ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اس مادے کے اُنبار سے باہر اللہ تعالیٰ کے ایک الگ وجود کا ادراک کرنا ناممکن ہے۔ اللہ یقیناً ''ہر کہیں ہے'' اور ہر شے پر محیط ہے۔ اس حقیقت کو قرآن پاک میں اس طرح بیان فرمایا گیا ہے:

اَللّٰهُ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ج اَلْحَیُّ الْقَیُّوْمُ ج لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ ط لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ ط مَنْ ذَاالَّذِیْ یَشْفَعُ عِنْدَهٗۤ اِلَّا بِاِذْنِهٖ ط یَعْلَمُ مَا بَیْنَ اَیْدِیْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ ج وَلَا یُحِیْطُوْنَ بِشَیْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖۤ اِلَّا بِمَا شَآءَ ج وَسِعَ كُرْسِیُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ ج وَلَا یَئُوْدُهٗ حِفْظُهُمَا ج وَهُوَ الْعَلِیُّ الْعَظِیْمُ o

''اللہ وہ زندۂ جاوید ہستی ہے جو تمام کائنات کو سنبھالے ہوئے ہے، اس کے سوا کوئی خدا نہیں ہے۔ وہ نہ سوتا ہے اور نہ اسے اونگھ لگتی ہے۔ زمین اور آسمانوں میں جو کچھ ہے اسی کا ہے۔ کون ہے جو اس کی جناب میں اس کی اجازت کے بغیر سفارش کر سکے؟ جو کچھ بندوں کے سامنے ہے اسے بھی وہ جانتا ہے اور جو کچھ ان سے اوجھل ہے اس سے بھی واقف ہے اور اس کی معلومات میں سے کوئی چیز ان کی گرفت ادراک میں نہیں آسکتی۔ الا یہ کہ کسی چیز کا علم وہ خود ہی ان کو دینا چاہے۔ اس کی حکومت آسمانوں اور زمین پر چھائی ہوئی ہے اور ان کی نگہبانی اس کے لئے کوئی تھکا دینے والا کام نہیں ہے۔ بس وہی ایک بزرگ وبرتر ذات ہے''۔ (سورۃ البقرۃ: ۲۵۵)

یہ حقیقت کہ اللہ کسی مکاں تک محدود نہیں ہے اور یہ کہ وہ کائنات کی ہر شے پر محیط ہے، اسے قرآن پاک میں یوں بیان فرمایا ہے:

وَلِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ فَاَیْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ ط اِنَّ اللّٰهَ وَاسِعٌ عَلِیْمٌ o

''مشرق اور مغرب سب اللہ کے ہیں جس طرف بھی رخ کرو گے اسی طرف اللہ کا رخ ہے، اللہ بڑی وسعت والا اور سب کچھ جاننے والا ہے''۔(سورۃ البقرۃ:۱۱۵)

چونکہ ہر مادی شے ایک ادراک ہے اس لئے وہ اللہ کو نہیں دیکھ سکتی لیکن وہ مادے کو دیکھ سکتا ہے کہ اس نے اسے اس کی تمام صورتوں میں تخلیق کیا ہے۔قرآن پاک میں اس حقیقت کا ذکر یوں آیا ہے:

لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ وَهُوَ يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ

''اس کی نگاہیں اس کو نہیں پاسکتیں اور وہ نگاہوں کو پالیتا ہے''۔(سورۃ الانعام:۱۰۳)

اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہم اپنی آنکھوں سے اللہ کو نہیں دیکھ سکتے مگر وہ ہمارے ظاہر و باطن یہاں تک کہ نگاہوں اور خیالات تک پر پوری طرح محیط ہے۔اس کے علم کے بغیر ہم ایک لفظ بھی زبان سے نہیں نکال سکتے نہ ہی ایک سانس تک لے سکتے ہیں۔

جب ہم اپنی زندگی میں ان حسی ادراک کو دیکھتے ہیں تو ان احساسات میں سے قریب ترین کوئی ایک بھی نہیں ہوتا ہاں مگر اللہ ہمارے قریب ترین رہتا ہے (ہماری شہ رگ سے بھی قریب) اس حقیقت میں قرآن پاک کی اس آیت کا راز پوشیدہ ہے:

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ وَنَعْلَمُ مَا تُوَسْوِسُ بِهٖ نَفْسُهٗ وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِo

''ہم نے انسان کو پیدا کیا ہے اور اس کے دل میں ابھرنے والے وسوسوں تک کو ہم جانتے ہیں۔ہم اس کی رگ گردن سے بھی زیادہ اس سے قریب ہیں''۔(سورۃ ق:۱۶)

فَلَوْلَآ اِذَا بَلَغَتِ الْحُلْقُوْمَ o وَاَنْتُمْ حِيْنَئِذٍ تَنْظُرُوْنَ o وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْكُمْ وَلٰكِنْ لَّا تُبْصِرُوْنَ o

''تو جب مرنے والے کی جان حلق تک پہنچ چکی ہوتی ہے اور تم آنکھوں دیکھ رہے ہوتے ہو کہ وہ مر رہا ہے اس وقت اس کی نکلتی ہوئی جان کو واپس کیوں نہیں لے آتے؟ اس وقت تمہاری بہ نسبت ہم اس کے زیادہ قریب ہوتے ہیں مگر تم کو نظر نہیں آتے''۔(سورۃ الواقعہ:۸۵-۸۳)

جب ایک انسان یہ سوچتا ہے کہ اس کا جسم ''مادے'' سے بنا ہے تو پھر وہ اس اہم حقیقت کو سمجھ نہیں پاتا۔اگر وہ اپنے دماغ کو ''وہ خود'' تصور کرتا ہے تو پھر باہر کے جس مقام کو وہ تسلیم کرتا ہے وہ اس سے ۳۰-۲۰ سینٹی میٹر دور ہوگا۔تاہم جب وہ یہ سمجھتا ہے کہ مادے کی قسم کی کوئی شے نہیں ہے اور ہر شے ایک تصور ہے، واہمہ و خیال ہے مثلاً باہر، اندر قریب اپنے معانی کھو دیتے ہیں۔اللہ اس پر محیط ہے اور وہی



جو کچھ یہاں کہا گیا ہے اگر کوئی انسان اس پر غور وفکر کرے تو یہ حیرت انگیز اور غیر معمولی صورت حال خود بخود اس کی سمجھ میں آ جائے گی: کہ اس دنیا میں پیش آنے والے تمام واقعات محض خیالی ہیں۔

ذات بے ہمتا اس کے "بے انتہا قریب" ہے۔

اللہ انسانوں کو اس آیت قرآنی کے ذریعے مطلع فرماتا ہے کہ وہ ان کے "بے انتہا قریب" ہے:

وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ ط

"اور اے نبیؐ میرے بندے اگر تم سے میرے متعلق پوچھیں تو انہیں بتا دو کہ میں ان سے قریب ہی ہوں"۔ (سورۃ البقرۃ:۱۸۶)

ایک اور آیت میں اسی حقیقت کا ذکر یوں فرمایا ہے:

قُلْ اِنَّمَآ اَنَا مُنْذِرٌ وَّمَا مِنْ اِلٰهٍ اِلَّا اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ۝ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَیْنَهُمَا الْعَزِیْزُ الْغَفَّارُ ۝

"اے نبیؐ ان سے کہو میں تو بس خبردار کرنے والا ہوں۔ کوئی حقیقی معبود نہیں مگر اللہ جو یکتا ہے سب پر غالب، آسمانوں اور زمین کا مالک اور اور ان ساری چیزوں کا مالک جو ان کے درمیان ہیں"۔ (سورۃ ص:۶۶-۶۵)

انسان نے یہ سمجھنے میں ٹھوکر کھائی ہے کہ وہ جو اس کے قریب ترین ہے یہ وہ خود ہے۔ اللہ تو ہم سے ہماری نسبت بھی زیادہ قریب ہے۔ وہ ہماری توجہ اس آیت کی جانب مبذول کراتا ہے:

فَلَوْلَآ اِذَا بَلَغَتِ الْحُلْقُوْمَ o وَاَنْتُمْ حِيْنَئِذٍ تَنْظُرُوْنَ o وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْكُمْ وَلٰكِنْ لَّا تُبْصِرُوْنَ o

''تو جب مرنے والے کی جان حلق تک پہنچ چکی ہوتی ہے اور تم آنکھوں دیکھ رہے ہوتے ہو کہ وہ مر رہا ہے اس وقت اس کی نکلتی ہوئی جان کو واپس کیوں نہیں لے آتے؟ اس وقت تمہاری بہ نسبت ہم اس کے زیادہ قریب ہوتے ہیں مگر تم کو نظر نہیں آتے''۔ (سورۃ الواقعہ: ۸۵-۸۳)

جیسا کہ اس سورۃ میں مطلع کیا گیا مدرک بالحواس حقیقت سے بے خبر ہو کر زندگی گزارتے ہیں اس لئے کہ وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ نہیں سکتے۔

دوسری طرف انسان جو ایک ظلی وجود رکھتا ہے، اس کے لئے یہ ناممکن ہے کہ وہ اللہ کے بغیر کوئی قوت یا ارادہ رکھتا ہو۔ یہ آیت بتاتی ہے کہ جو کچھ بھی ہمیں پیش آتا ہے وہ اللہ کے قبضۂ قدرت میں ہوتا ہے:

وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ وَمَا تَعْمَلُوْنَ o

''حالانکہ اللہ ہی نے تم کو بھی پیدا کیا ہے اور ان چیزوں کو بھی جنہیں تم بناتے ہو''۔ (سورۃ الصّٰفّٰت: ۹۶)

قرآن کی ایک اور سورۃ میں اس حقیقت کو اس طرح بیان فرمایا گیا ہے:

فَلَمْ تَقْتُلُوْهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ قَتَلَهُمْ وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى ج وَلِيُبْلِيَ الْمُؤْمِنِيْنَ مِنْهُ بَلَآءً حَسَنًا ط

''اور اے نبیؐ تو نے نہیں پھینکا بلکہ اللہ نے پھینکا، اور مومنوں کے ہاتھ جو اس کام میں استعمال کئے گئے''۔ (سورۃ الانفال: ۱۷)

اس سے یہ مراد ہے کہ کوئی کام اللہ کی مرضی کے بغیر انجام نہیں پا سکتا۔ انسان چونکہ ایک ظلّی وجود رکھتا ہے اس لئے پھینکنے کا کام وہ خود نہیں کر سکتا۔ تاہم اللہ اس وجودِ ظلّی کو خود کا احساس عطا کر دیتا ہے۔ درحقیقت یہ اللہ ہی ہے جو تمام کام پایۂ تکمیل تک پہنچاتا ہے۔ چنانچہ اگر کوئی کسی کام کو کرنے لگتا ہے تو وہ ایسا اپنے طور پر کرتا ہے، وہ بظاہر اپنے آپ کو دھوکہ دے رہا ہوتا ہے۔

یہ حقیقت ہے۔ ایک انسان کبھی یہ نہ چاہے گا کہ اسے تسلیم کرلے اور اپنے بارے میں وہ یہ

سوچ سکتا ہے کہ وہ اللہ سے جدا رہ کر خود مختار ہے مگر اس سے کوئی شے تبدیل تو نہیں ہو جاتی ۔ بیشک اس کا یہ احمقانہ انکار بھی ایک بار پھر اللہ کی مرضی و ارادے کے تابع ہوگا۔

آپ کی ہر شے فی نفسہٖ خیالی ہے

جیسا کہ یہ بات بالکل واضح طور پر دیکھی جا سکتی ہے کہ یہ ایک سائنسی اور منطقی حقیقت ہے کہ ''خارجی دنیا'' کی کوئی مادی اصلیت نہیں ہے اور یہ ان خیالی تصاویر کا مجموعہ ہے جسے اللہ ہماری روح کو مسلسل عنایت کرتا رہتا ہے۔ تاہم لوگ عموماً ''خارجی دنیا'' کے تصور میں ہر شے کو شامل نہیں کرتے یا شامل کرنا نہیں چاہتے۔ اگر آپ اس مسئلے پر مخلصانہ اور جرأت مندانہ غور و فکر کریں تو آپ کو یہ احساس ہونے لگے گا کہ آپ کا گھر، اس کا فرنیچر، آپ کی کار غالباً جو آپ نے حال ہی میں خریدی ہے، دفتر، زیورات، بینک میں رکھی ہوئی رقم، کپڑوں کی الماری، آپ کی اہلیہ، بچے، رفقاء اور ہر وہ شے جو آپ کی ملکیت ہے دراصل اس تصوّراتی دنیا میں شامل ہے جسے آپ اپنی نظروں کے سامنے دیکھتے ہیں۔ مختصر یہ کہ ہر وہ شے جسے آپ دیکھتے، سنتے یا سونگھتے ہیں آپ اس کا ادراک اپنے حواس سے کرتے ہیں۔ یہ دراصل اس تصوّراتی دنیا کا ایک حصہ ہوتی ہے۔ جس میں آپ کے پسندیدہ گلوکار کی آواز، اس کرسی کی سخت سطح جس پر آپ بیٹھتے ہیں، عطر جس کی خوشبو آپ پسند کرتے ہیں، وہ سورج جو آپ کو گرم رکھتا ہے، ایک رنگین خوبصورت پھول، آپ کی کھڑکی کے سامنے اڑنے والا ایک پرندہ، پانی کی لہروں پر تیرتی ایک تیز رفتار کشتی، آپ کا زرخیز سرسبز باغیچہ، وہ کمپیوٹر جسے آپ کام کے دوران استعمال کرتے ہیں یا آپ کا ''ہائی فائی (Hi-fi) جس کی ٹیکنالوجی دنیا بھر کی جدید ترین ٹیکنالوجی ہے، سبھی کچھ شامل ہے۔

یہ حقیقت ہے کیونکہ دنیا تو صرف ان تصوّراتی تصویروں کا مجموعہ ہے جسے انسان کی آزمائش کے لئے تخلیق کیا گیا ہے۔ انسانوں کو محدود عمر کے دوران ان ادراکات سے آزمایا جاتا ہے جو کچھ حقیقت نہیں رکھتے۔ ان کو دانستہ طور پر دلکش اور خوشنما بنا کر پیش کیا جاتا ہے۔ قرآن پاک میں اس حقیقت کو یوں بیان فرمایا گیا ہے:

زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ النِّسَآءِ وَالْبَنِيْنَ وَالْقَنَاطِيْرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْاَنْعَامِ وَالْحَرْثِ ط ذٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ج وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الْمَاٰبِ o

''لوگوں کے لئے مرغوباتِ نفس...... عورتیں، اولاد، سونے چاندی کے ڈھیر، چیدہ گھوڑے، مویشی، اور زرعی زمینیں...... بڑی خوش آئند بنا دی گئی ہیں مگر یہ سب دنیا کی چند روزہ زندگی کے سامان ہیں۔ حقیقت میں جو بہتر ٹھکانا ہے وہ تو اللہ کے پاس ہے''۔ (سورۃ آل عمران ۱۴:)

بہت سے لوگ جائیداد، دولتِ دنیا، سونے چاندی کے انبار، ڈالر، ہیرے جواہرات، بنک میں جمع شدہ رقوم، کریڈٹ کارڈ، قیمتی ملبوسات سے بھری ہوئی الماریاں، جدید ماڈل کی کاروں، مختصر یہ کہ عیش وعشرت کے اس سامان کی خاطر جوان کے پاس موجود ہے یا جسے حاصل کرنے کی وہ کوشش کر رہے ہیں، مذہب کو پس پشت ڈال دیتے ہیں اور وہ حیات بعد ممات کو بالکل فراموش کر کے اپنی ساری توجہ اسی دنیا کی زندگی کو دینے لگتے ہیں۔ وہ اس دنیا کی زندگی کے ''خوبصورت اور دل لبھانے والے'' چہرے سے دھوکہ کھا جاتے ہیں۔ اس طرح وہ نماز ادا کرنے میں ناکام رہتے ہیں، غربا و مساکین کی مدد نہیں کرتے اور نہ ہی اللہ کی عبادت کرتے ہیں جو ان کے لئے آخرت کی زندگی کی آسودگی کی ضمانت بن سکتی تھی۔ انہیں یہ کہتے سنا گیا ہے ''مجھے بہت سے کام کرنا ہیں''، ''میرے کچھ خواب ہیں''، ''میری بہت سی ذمہ داریاں ہیں''، ''میرے پاس کافی وقت نہیں ہے''، ''مجھے کئی کام مکمل کرنے ہیں''، ''میں یہ مستقبل میں کرلوں گا''۔ وہ صرف اس دنیا کی زندگی میں خوشحال ہونے کے لئے پوری عمریں گزار دیتے ہیں۔ درج ذیل آیت میں اس غلط فہمی کا ذکر فرمایا گیا ہے:

يَعْلَمُوْنَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ج وَهُمْ عَنِ الْاٰخِرَةِ هُمْ غٰفِلُوْنَ٥

''لوگ دنیا کی زندگی کا بس ظاہری پہلو جانتے ہیں اور آخرت سے وہ خود ہی غافل ہیں''۔ (سورۃ الروم:۷)

اس باب میں ہم جس حقیقت کا ذکر کرنے والے ہیں کہ ہر شے ایک خیالی شبیہ ہے، یہ اس حوالے سے بے حد اہم ہے کیونکہ اس کے اطلاق سے تمام حرص ولالچ کی حدود بے معنی ہو جاتی ہیں۔ اس حقیقت کی تصدیق اسے عیاں کر دیتی ہے کہ ہر وہ شے جو لوگوں کے پاس ہے یا جسے حاصل کرنے کی وہ سعی وکوشش کرتے ہیں، وہ دولت جسے انہوں نے حریصانہ جمع کیا، ان کی اولاد جس پر وہ نازاں ہیں، ان کی بیگمات جن کے بارے میں ان کا خیال ہے کہ وہ ان کے بہت قریب ہیں، ان کے دوست، وہ جن سے انہیں بڑا پیار ہے، ان کے عہدے جن کی وجہ سے ان کو بلند مقام

و مرتبہ حاصل ہے، وہ مشہور درسگاہیں جہاں انہوں نے تعلیم پائی ہے اور آرام کی خاطر ان کی تعطیلات سوائے ایک پرفریب خیال کے کچھ بھی تو نہیں ہیں۔ اس لئے اس سمت کی جانے والی تمام تر کوششیں وقت جو گزارا گیا اور وہ حرص جس سے کام لیا گیا بے سود اور بے ثمر ثابت ہوگا۔

یہی وجہ ہے کہ کچھ لوگ جب اپنے مال و دولت، جائیدادوں اور اپنے ''بجروں (بادبانی کشتیوں)، ہیلی کاپٹروں، کارخانوں، مال و اسباب، حویلیوں، جاگیروں اور زمینوں پر غور کرتے ہیں تو دراصل وہ نادانستہ طور پر اپنے آپ کو احمق بنا رہے ہوتے ہیں۔ اور وہ یہ سمجھ رہے ہوتے ہیں کہ یہ سب کچھ واقعی موجود تھا۔ وہ متمول افراد جو اپنی بادبانی کشتیوں میں نمود و نمائش کے طور پر سیر و تفریح کرتے ہیں، اپنی نہایت قیمتی کاریں دوسروں کو دکھا دکھا کر اتراتے ہیں، اپنی دولت کا ذکر کرتے نہیں تھکتے، یہ سمجھ بیٹھتے ہیں کہ ان کا بڑا عہدہ ہر دوسرے انسان سے ان کو بلند مقام پر بٹھانے کے لئے کافی ہے۔ وہ یہ سمجھ بیٹھتے ہیں کہ اس سب کچھ کی موجودگی میں وہ ایک کامیاب انسان ہیں۔ انہیں دراصل یہ سوچنا چاہئے کہ اگر ان کو ایک بار یہ احساس ہو جائے کہ ان کی یہ کامیابی سوائے ایک پرفریب خیال کے کچھ نہیں تو پھر ان کی کیا حالت ہوگی؟

درحقیقت ایسے مناظر خوابوں میں بھی دیکھنے کو ملتے ہیں۔ یہ لوگ اپنے خوابوں میں بھی عالیشان گھر، تیز رفتار کاریں، نہایت قیمتی ہیرے جواہرات، ڈالروں کے بنڈل، سونے چاندی کے انبار دیکھتے ہیں۔ خوابوں میں بھی وہ اپنے آپ کو اعلیٰ عہدے پر فائز دیکھتے ہیں، ان کے کارخانے ہوتے ہیں جن میں ہزاروں مزدور کام کرتے ہوں یہ بہت سے لوگوں پر حکومت کرنے کے لئے طاقت رکھتے ہیں، ان کے جسم پر ایسا لباس ہوتا ہے جسے دیکھ کر ہر کوئی ان کی تعریف کرے......جس طرح خوابوں میں اپنے مال واسباب پر فخر کرنے والے کا تمسخر اڑایا جاتا ہے اسی طرح حقیقی دنیا میں بھی محض خیالی چیزوں پر فخر کرنے پر بھی ایسے انسان کا مذاق اڑایا جائے گا۔ دراصل جو وہ اپنے خوابوں میں دیکھتا ہے اور جس کا ذکر وہ اس دنیا میں کرتا ہے دونوں وہ خیالی تصویریں ہیں جو اس کے ذہن میں ہوتی ہیں۔

اسی طرح جب لوگ ان واقعات پر ردعمل کا اظہار کرتے ہیں جو انہیں دنیا میں پیش آتے ہیں تو وہ اس پر بھی اس وقت شرمندگی و ندامت محسوس کرتے ہیں جب ان کو حقیقت کا پتہ چلتا ہے۔ وہ جو خوفناک طریقے سے ایک دوسرے کے ساتھ لڑتے ہیں وہ جو غضبناک ہو جاتے ہیں، جو چکمہ دیتے ہیں، جو رشوت لیتے ہیں، جو جعلسازی سے کام لیتے ہیں، جو جھوٹ بولتے ہیں، جو حریصانہ دولت جمع کرتے ہیں، جو دوسروں پر زیادتی کرتے ہیں، جو دوسروں کو مارتے پیٹتے اور لعن

طعن کرتے ہیں، جو غصے میں ظلم وتشدد پر اتر آتے ہیں، وہ جن کو اپنے عہدے اور منصب پر بڑا گھمنڈ ہوتا ہے، جو حاسد ہوتے ہیں، جو نمود ونمائش کی کوشش کرتے ہیں، وہ جو اپنے آپ کو مقدس وپاکیزہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں مگر جب انہیں پتہ چلے گا کہ انہوں نے یہ سب کچھ عالم خواب میں کیا ہے تو وہ کس قدر رذلیل اور بے عزت ہوں گے۔

اللہ ہی ان تمام خیالی شبیہات کو تخلیق کرتا ہے، ہر شے کا اصل مالک بلاشرکت غیرے اللہ ہی ہے۔اس حقیقت پر قرآن پاک میں بڑا زور دیا گیا ہے:

وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ مُّحِيْطًا۝

''آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے اللہ کا ہے اور اللہ ہر چیز پر محیط ہے''۔(سورۃ النساء: ۱۲۶)

خیالی جذبات کی خاطر مذہب کو پس پشت ڈال دینا اور یوں اس ابدی زندگی کو کھو دینا جو ایک ہمیشہ کی محرومی ہوتی ہے، بہت بڑی حماقت ہے۔

اس مرحلے میں ایک بات کو اچھی طرح ذہن نشین کر لینا چاہئے: یہاں یہ نہیں کہا گیا کہ وہ حقیقت جس کا سامنا آپ کرتے ہیں اس بات کی توثیق کرتی ہے کہ ''تمام مال واسباب، روپیہ پیسہ، اولاد، بیویاں، دوست احباب، اور عہدہ جس پر آپ متمکن ہیں سب جلد یا بدیر ختم ہو جائیں گے اس لئے یہ بے معنی ہیں''۔ بلکہ کہا تو یہ جاتا ہے کہ ''وہ تمام مال واسباب جو بظاہر آپ کے پاس ہے دراصل کوئی وجود نہیں رکھتا بلکہ یہ محض ایک خواب ہے اور یہ ان خیالی تصویروں پر مشتمل ہے جو اللہ تمہاری آزمائش کے لئے تمہیں دکھا رہا ہے۔ آپ نے دیکھا کہ دونوں بیانات کے درمیان کتنا بڑا فرق ہے۔

حالانکہ انسان فی الفور اس حقیقت کا اعتراف نہیں کرنا چاہتا اور وہ یہ فرض کر کے اپنے آپ کو دھوکہ دے گا کہ جو کچھ اس کے پاس ہے وہ فی الحقیقت وجود رکھتا ہے اور اسے بالآخر ایک روز مرنا ہے اور جب قیامت کے روز اسے دوبارہ زندہ کیا جائے گا تو ہر بات واضح ہو جائے گی۔اس روز کے حوالے سے سورۃ ق کی آیت ۲۲ میں فرمایا گیا کہ ''آج تیری نگاہ خوب تیز ہے''۔اور وہ ہر شے کو زیادہ سے زیادہ صاف اور واضح طور پر دیکھ سکے گا۔تاہم اگر اس نے پوری عمر خیالی مقاصد کے تعاقب میں گزار دی تو وہ یہ خواہش کرے گا کہ کاش اس نے یہ زندگی گزاری ہی نہ ہوتی۔وہ کہے گا: ''کاش میری وہی موت (جو دنیا میں آئی تھی) فیصلہ کن ہوتی۔آج میرا مال میرے کچھ کام

نہ آیا۔ میرا سارا اقتدار ختم ہو گیا''۔

اس کے برعکس ایک دانا آدمی کیا کرے گا، وہ اس دنیا میں رہتے ہوئے جس وقت ابھی اسے مہلت حاصل ہو گی کائنات کی عظیم ترین حقیقت کو جاننے کی کوشش کرے گا۔ وگرنہ عمر بھر خوابوں کے پیچھے دوڑتا رہے گا اور آخرت میں اسے ایک افسوسناک سزا کا سامنا کرنا پڑے گا۔ وہ لوگ جو دنیا میں سرابوں کے پیچھے دوڑتے رہتے ہیں اور اپنے خالق کو بھلا بیٹھتے ہیں ان کی آخری حالت کے بارے میں قرآن پاک میں اس طرح ارشاد باری تعالیٰ ہوتا ہے:

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَعْمَالُهُمْ كَسَرَابٍۭ بِقِيْعَةٍ يَّحْسَبُهُ الظَّمْاٰنُ مَآءً ؕ حَتّٰٓى اِذَا جَآءَهٗ لَمْ يَجِدْهُ شَيْـًٔا وَّوَجَدَ اللّٰهَ عِنْدَهٗ فَوَفّٰىهُ حِسَابَهٗ ؕ وَاللّٰهُ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ۝

''(اس کے برعکس) جنہوں نے کفر کیا ان کے اعمال کی مثال ایسی ہے جیسے دشت بے آب میں سراب کہ پیاسا اس کو پانی سمجھے ہوئے تھا مگر جب وہاں پہنچا تو کچھ نہ پایا بلکہ وہاں اس نے اللہ کو موجود پایا جس نے اس کا پورا پورا حساب چکا دیا اور اللہ کو حساب لیتے دیر نہیں لگتی''۔ (سورۃ النور:۳۹)

آپ کے لئے حقیقت صرف وہ ہے جسے آپ ''ہاتھ سے چھو سکتے ہوں اور اپنی آنکھوں سے دیکھ سکتے ہوں''، مگر اصل میں تو نہ آپ کا ہاتھ ہے نہ آنکھ نہ کوئی ایسی شے موجود ہے جسے چھوا یا دیکھا جا سکتا ہو۔ سوائے آپ کے دماغ کے کوئی ایسی مادی حقیقت نہیں ہے جو ان چیزوں کو ظہور پذیر ہونے دیتی ہے۔ آپ کو تو دھوکہ دیا جا رہا ہوتا ہے۔

وہ کیا ہے جو حقیقی زندگی اور خوابوں کو ایک دوسرے سے جدا کرتی ہے؟ بالآخر زندگی کی دونوں شکلیں دماغ کے اندر ایک وجود پاتی ہیں۔ اگر ہم اپنے خوابوں میں ایک غیر حقیقی دنیا میں آرام و آسانی کے ساتھ زندہ رہ سکتے ہیں تو یہی بات اس دنیا کے لئے بھی یکساں طور پر درست ہو سکتی ہے جس میں ہم زندگی گزارتے ہیں۔ جب ہم خواب سے بیدار ہوتے ہیں تو اس کے لئے کوئی دلیل نہیں ہوتی کہ ہم ایسا کیوں نہیں سوچتے کہ ہم ایک طویل خواب میں داخل ہو گئے ہیں جسے ہم ''حقیقی زندگی'' کا نام دیتے ہیں۔ ہم اپنے خواب کو ایک خیال تصور کرتے ہیں اور اس دنیا کو حقیقی، اس کی وجہ کوئی نہیں ہے بلکہ یہ تو ہماری عادات اور تعصّبات کی پیداوار ہوتی ہے۔

اس سے ہمیں یہ تاثر ملتا ہے کہ ہم اس زمین پر رہتے ہوئے زندگی سے بھی اُسی طرح بیدار

ہو سکتے ہیں، جس کے بارے میں ہم سمجھتے ہیں کہ ہم اسے گزار رہے ہیں، جس طرح کہ ہم ایک خواب سے بیدار ہو جاتے ہیں۔

مادہ پرستوں کی منطقی خامیاں

اس باب کے آغاز ہی میں اس بات کو بڑی وضاحت کے ساتھ بیان کر دیا گیا ہے کہ مادہ، جیسا کہ مادہ پرستوں کا دعویٰ ہے، ایک مطلق وجود نہیں ہے بلکہ ان حواس (Senses) کا مجموعہ ہے جن کا خالق اللہ ہے۔ مادہ پرست ایک نہایت آمرانہ طریقے سے اس عیاں حقیقت سے انکار کرتے ہیں، جو ان کے فلسفے کو تباہ کر دیتی ہے اور ایک بے بنیاد جواب دعویٰ پیش کرتی ہے۔

مثال کے طور پر بیسویں صدی کے مادہ پرست فلسفے کے سب سے بڑے حامی اور مارکسی نظریے کے پرجوش حمایتی جارج پولائزر نے مادے کے وجود کے لئے "بس کی مثال" دی اور اسے بطور سب سے بڑے ثبوت کے پیش کیا۔ پولائزر کے خیال میں وہ فلسفی جو یہ سمجھتے ہیں کہ مادہ ایک ادراک ہے، جب بس دیکھتے ہیں تو بھاگ جاتے ہیں اور یہ مادے کی طبعی موجودگی کا ثبوت ہے۔

جب ایک اور مشہور مادہ پرست جانسن کو بتایا گیا کہ مادہ ادراکات کا مجموعہ ہے تو اس نے پتھروں کے مادی وجود کا ثبوت پیش کرنے کی کوشش میں انہیں ٹھوکر ماری تھی۔

ایسی ہی ایک مثال Friedrich Engels نے دی جو پولائزر کا استاد اور مارکس کے ساتھ جدلیاتی مادہ پرستی کا بانی تھا، جس نے لکھا کہ "اگر وہ کیک جو ہم کھاتے ہیں محض ادراکات تھے تو ان سے ہماری بھوک نہ مٹنی چاہئے تھی"۔

اسی قسم کی مثالیں اور تند و تیز جملے "جب آپ کے چہرے پر تھپڑ رسید ہوتا ہے تو آپ مادے کی موجودگی سمجھ جاتے ہیں" مشہور مادہ پرستوں مثلاً مارکس، انجلز، لینن اور دوسروں کی کتابوں میں ملتے ہیں۔

جب اسے سمجھنا مشکل ہو جاتا ہے تو اس سے مادہ پرستوں کی ان مثالوں کو راستہ مل جاتا ہے جو اس وضاحت کو ان الفاظ کا جامہ پہناتے ہیں "مادہ ایک ادراک ہے" جس طرح کہ "مادہ روشنی کا فریب نظر ہے"۔ ان کے خیال میں ادراک کا نظریہ صرف دیکھنے تک محدود ہے اور چھونے کے ادراکات ایک طبعی رابطہ رکھتے ہیں۔ ایک بس جب کسی آدمی کو ٹکر مار کر گرا دیتی ہے تو یہ ان کے منہ

سے یہ کہلواتی ہے ''دیکھو اس نے آدمی کو کچل دیا ہے اس لئے یہ ادراک نہیں ہے''۔ جو بات ان کی سمجھ میں نہیں آتی وہ یہ ہے کہ بس کے تصادم کے دوران جتنے ادراکات کا تجزیہ ہوا مثلاً سختی، ٹکراؤ اور درد، یہ سب دماغ کے اندر متشکل ہوئے ہیں۔

خوابوں کی مثال

اس حقیقت کی تشریح کرنے کے لئے بہترین مثال خواب ہیں۔ ایک انسان عالم خواب میں بے حد حقیقی واقعات کا تجزیہ کرتا ہے۔ وہ زینے سے لڑھک سکتا ہے جس میں اس کی ٹانگ ٹوٹ جاتی ہے۔ اس کا کار کا شدید حادثہ ہو سکتا ہے، وہ ایک بس کے نیچے آ سکتا ہے، یا وہ ایک کیک کھاتا ہے، جس سے وہ شکم سیری محسوس کرتا ہے۔ ویسے ہی واقعات، جیسے ہمیں روزمرہ زندگی میں پیش آتے ہیں خواب میں بھی پیش آ سکتے ہیں جن میں ویسی ہی ترغیب ملتی ہے اور ہمارے اندر ویسے ہی جذبات ابھرتے ہیں۔

ایک ایسا انسان جو خواب میں دیکھتا ہے کہ اسے ایک بس نے ٹکر مار کر گرا دیا ہے جب آنکھ کھولتا ہے تو ایک بار پھر خواب ہی میں اپنے آپ کو ہسپتال میں پاتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ وہ معذور ہو گیا ہے مگر یہ سب باتیں عالم خواب کی ہوں گی وہ یہ خواب بھی دیکھ سکتا ہے کہ وہ کار کے حادثے میں جاں بحق ہو گیا ہے اور موت کے فرشتے اس کی روح لے جاتے ہیں اور اس کی آخرت کی زندگی کا آغاز ہو جاتا ہے۔

انسان خیالی تصویروں، آوازوں، سختی کے احساس، روشنیوں رنگینیوں اور خواب میں پیش آنے والے واقعہ سے متعلق تمام دوسرے احساسات کے تجربات کا ادراک بڑی تیزی کے ساتھ کرتا ہے۔ جن ادراکات کا تجربہ اسے خواب میں ہوتا ہے وہ اسی طرح قدرتی ہوتے ہیں جس طرح ''حقیقی'' زندگی میں۔ جو کیک وہ خواب میں کھاتا ہے وہ حالانکہ محض ایک ادراک ہوتا ہے مگر وہ سیر شکم ہو جاتا ہے اس لئے کہ سیر شکمی بھی ایک ادراک ہے۔ تاہم حقیت میں یہ انسان اس وقت اپنے بستر میں لیٹا ہوا ہوتا ہے۔ نہ تو کوئی زینہ ہوتا ہے، نہ ٹریفک نہ بسیں جن پر غور کیا جا سکے۔ خواب دیکھنے والا انسان ان ادراکات اور احساسات کے تجربے سے گزرتا ہے جو خارجی دنیا میں وجود نہیں رکھتے۔ یہ حقیقت کہ ہم اپنے خوابوں میں ان واقعات کے تجربے سے گزرتے ہیں، دیکھتے ہیں، اور انہیں محسوس کرتے ہیں جن کا خارجی دنیا سے کوئی طبعی رابطہ نہیں ہوتا۔ اس سے

خوابوں کی دنیا

آپ کے لئے حقیقت وہ ہے جسے آپ ہاتھ سے چھو سکتے ہیں، اور آنکھ سے دیکھ سکتے ہیں۔ آپ اپنے خواب میں بھی ''اپنے ہاتھ سے چھو سکتے ہیں اور اپنی آنکھ سے دیکھ سکتے ہیں''۔ لیکن درحقیقت نہ آپ کا ہاتھ ہوتا ہے نہ آنکھ نہ کوئی ایسی شے ہوتی ہے جسے چھوا یا دیکھا جا سکتا ہو۔ کوئی مادی حقیقت بھی ایسی نہیں ہوتی جو ان چیزوں کو وقوع پذیر ہونے دے ماسوا آپ کے دماغ کے۔ آپ کو تو دراصل فریب دیا جا رہا ہوتا ہے۔

وہ کیا شے ہے جو حقیقی زندگی اور خوابوں کو ایک دوسرے سے جدا کرتی ہے؟ بالآخر دونوں طرح کی زندگی کی شکلوں کو دماغ کے اندر لایا جاتا ہے۔ اگر ہم اپنے خوابوں میں ایک غیر حقیقی دنیا میں بآسانی رہ سکتے ہیں تو یہی بات اس دنیا کے لئے بھی یکساں طور پر صحیح ہو سکتی ہے جس میں ہم رہتے ہیں۔ جب ہم خواب سے جاگتے ہیں تو اس کے لئے ہمارے پاس کوئی منطقی دلیل نہیں ہوتی کہ ہم ایسا کیوں نہیں سوچتے کہ ہم ایک طویل خواب میں داخل ہو گئے ہیں جسے ہم ''حقیقی زندگی'' کا نام دیتے ہیں۔ ہم اپنے خواب کو ایک خیال تصور کرتے ہیں اور اس دنیا کو حقیقی، اس کی وجہ کوئی نہیں ہے بلکہ یہ تو ہماری عادات اور تعصبات کی پیداوار ہوتی ہے۔ اس سے ہمیں یہ تاثر ملتا ہے کہ ہم اس زمین پر رہتے ہوئے زندگی میں بھی اسی طرح بیدار ہو سکتے ہیں جس کے بارے میں ہم سمجھتے ہیں کہ ہم اسے گزار رہے ہیں، جس طرح کہ ہم ایک خواب سے بیدار ہو جاتے ہیں۔

(یہ تجربہ اسی طرح سے اس دنیا کی حقیقی زندگی میں بھی پیش آتا ہے جو ایک خواب کی مانند ایک ادراک ہے)



صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ''خارجی دنیا'' محض ادراکات پر مشتمل ہوتی ہے۔

وہ لوگ جو مادہ پرستانہ فلسفے میں، بالخصوص مارکسی اس وقت غصے میں آجاتے ہیں جب انہیں اس حقیقت کے بارے میں بتایا جاتا ہے، جو مادے کا جوہر ہے۔ وہ مارکس، اینجلز یا لینن کے سطحی دلائل میں سے مثالیں پیش کرتے ہیں اور جذباتی اعلانات کرتے ہیں۔

تاہم ان افراد کو یہ بھی سوچنا چاہئے کہ وہ یہی اعلانات اپنے خوابوں میں بھی کر سکتے ہیں۔

وہ اپنے خواب میں ''داس کیپٹا'' (مارکس کی مشہور کتاب) کا مطالعہ بھی کر سکتے ہیں، اجلاس میں شرکت کر سکتے ہیں، پولیس سے لڑ سکتے ہیں، ان کے سر میں چوٹ لگ سکتی ہے اور مزید یہ کہ وہ اپنے زخموں کا درد بھی محسوس کر سکتے ہیں۔ جب ان سے خواب ہی میں کوئی بات پوچھی جاتی ہے تو وہ یہ سوچنے لگتے ہیں کہ جس تجربے سے وہ خواب کے دوران گزرے ہیں وہ ''مطلق مادے'' پر مشتمل ہے، بالکل اسی طرح جیسے وہ ان اشیاء کو سمجھتے ہیں جنہیں وہ جاگتے میں دیکھتے ہیں اور جو ''مطلق مادہ'' ہوتی ہیں۔ تاہم یہ سب ان کے خواب کا معاملہ ہو یا روزمرہ زندگی کا، وہ سب کچھ جس کے تجربے سے یہ لوگ گزرتے ہیں دیکھتے ہیں، یا محسوس کرتے ہیں صرف ادراکات پر مشتمل ہوتا ہے۔

رگوں کو ایک دوسرے کے متوازی جوڑنے کی مثال

آیئے اب پولائزر کی دی گئی کار کے حادثے والی مثال پر غور کرتے ہیں: اگر اس حادثے میں کچلے جانے والے انسان کی ان رگوں کو جو اس کے حواس خمسہ سے دماغ کی جانب جا رہی تھیں، ایک دوسرے انسان کی رگوں کے ساتھ جوڑ دیا جائے، مثال کے طور پر پولائزر کے دماغ کی رگوں سے، اور انہیں ایک دوسرے کے متوازی جوڑا گیا ہو، نیز ایسا اسی لمحے کر لیا جائے جس وقت بس نے اس شخص کو ٹکر ماری ہے تو یہ بس پولائزر کو بھی ٹکر مار دے گی۔ ہم اسے مزید بہتر طور پر یوں کہہ سکتے ہیں کہ حادثے کا شکار ہونے والا شخص جن تجربات سے گزرا ہے وہی پولائزر کو بھی پیش آئیں گے۔ بالکل ویسے ہی جس طرح ایک ہی گیت کو بیک وقت دو لاؤڈ سپیکروں پر ایک ہی ٹیپ ریکارڈر کے ساتھ جوڑ کر سنا جا سکتا ہے۔ پولائزر محسوس بھی کرے گا، دیکھے گا اور بس کے بریک لگانے کی آواز کو سننے کے تجربے سے بھی گزرے گا۔ بس کو اپنے جسم سے ٹکراتے محسوس کرے گا، ٹوٹے ہوئے بازو اور بہتے خون، ٹوٹی ہوئی ہڈی کے درد کی خیالی تصویریں اس کے تجربے میں آئیں گی۔ آپریشن تھیٹر میں اپنے داخل ہونے، پلستر کی سخت سطح اور اپنے بازو کی کمزوری کی خیالی تصویریں دیکھے گا۔

پولائزر کی طرح ہر وہ انسان جس کی رگوں کو زخمی کی رگوں کے ساتھ متوازی حالت میں جوڑ دیا گیا ہو، اسی تجربے سے گزرے گا۔ اگر حادثے میں زخمی ہونے والا طویل بے ہوشی (Coma) میں چلا جاتا ہے تو وہ سب کے سب اسی حالت میں چلے جائیں گے۔ مزید یہ کہ کار کے حادثے

کے تمام ادراکات کو اگر ایک ٹیپ ریکارڈر میں ریکارڈ کرلیا جائے اور پھر انہیں ایک دوسرے انسان تک ارسال کیا جائے تو بس اس شخص کو کئی بار ٹکر مار کر گرائے گی۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان افراد کو ٹکر مارنے والی بسوں میں سے اصلی بس کون سی ہوگی؟ مادہ پرستانہ فلسفے کے پاس اس سوال کا کوئی معقول جواب نہیں ہے۔ اس کا صحیح جواب یہ ہے کہ وہ تمام افراد اس کار کے حادثے کی جزئیات سمیت اس تجربے سے گزریں گے۔

یہی اصول کیک اور پتھر والی مثالوں پر لاگو ہوتا ہے۔ اگر اینجلز کے حسی اعضاء کی رگیں جنہوں نے کیک کے کھائے جانے کے بعد پیٹ میں سیر شکمی محسوس کی متوازی حالت میں ایک دوسرے انسان کے دماغ کی رگوں سے جوڑ دی جائیں تو وہ شخص بھی اس وقت سیر شکمی محسوس کرے گا جب اینجلز نے کیک کھایا تھا۔ اگر جانسن کی رگوں کو جس کے پاؤں میں اس وقت درد تھا جب اس نے ایک پتھر کو ٹھوکر ماری تھی، متوازی حالت میں ایک دوسرے انسان کی رگوں سے جوڑ دیا جائے تو وہ شخص جانسن کی طرح درد محسوس کرے گا۔

تو پھر کون سا کیک اور پتھر اصلی ہوا؟ مادہ پرستانہ فلسفہ ایک بار پھر اس سوال کا جواب دینے میں ناکام ہو جائے گا۔ اس سوال کا درست جواب یہ ہے:

اینجلز اور دوسرے انسان دونوں نے اپنے اپنے ذہنوں میں کیک کھایا ہے اور سیر شکمی محسوس کی ہے؛ جانسن اور دوسرے انسان دونوں نے اپنے اپنے ذہنوں میں پتھر کو ٹھوکر مارنے پر درد محسوس کرنے کا تجربہ ایک ہی لمحے کیا ہے۔

پولائزر کے متعلق جو مثال ہم نے دی آیئے اس میں ایک تبدیلی کرلیں۔ ہم بس سے زخمی ہونے والے انسان کے دماغ کی رگوں کو پولائزر کے دماغ کی رگوں کے ساتھ جوڑ دیتے ہیں اور پولائزر جو اپنے گھر میں بیٹھا ہوا ہے کے دماغ کی رگوں کو اس انسان کے دماغ کی رگوں کے ساتھ جسے بس نے ٹکر ماری ہے۔ اس بار پولائزر حالانکہ اپنے گھر میں بیٹھا ہوا ہے مگر پھر بھی وہ سوچے گا کہ بس نے اسے ٹکر ماری ہے اور جو انسان واقعی بس سے ٹکرایا ہے اسے یہ خیال کبھی نہیں آئے گا کہ وہ حادثے کا شکار ہوا ہے اور وہ یہ سمجھے گا کہ پولائزر کے گھر میں بیٹھا ہوا ہے۔ یہی منطق اور استدلال کیک اور پتھر والی مثالوں میں پیش کیا جاسکتا ہے۔

جیسا کہ ہم دیکھیں گے کہ انسان کے لئے یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ اپنے حواس سے ماوراء ہو کر ان کو توڑ کر نکل جائے۔ اس حوالے سے انسان کی روح تمام قسم کی نمائندگیوں کے ماتحت ہوگی

حالانکہ اس کا کوئی مادی جسم نہیں ہوتا نہ ہی یہ کوئی مادی وجود رکھتی ہے اور اس کا کوئی مادی وزن نہیں ہوتا۔ انسان کے لئے یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ اس کا احساس کر سکے کیونکہ وہ ان سہ جہتی خیالی تصاویر کو حقیقی سمجھتا ہے اور ان کے وجود کا پورا پورا یقین رکھتا ہے اس لئے کہ ایک شخص ان ادراکات پر انحصار کرتا ہے جو اس کے حسی اعضاء کے ذریعے سے محسوس کرائے جاتے ہیں۔ ایک مشہور برطانوی فلسفی ڈیوڈ ہیوم نے اس حقیقت پر اپنے خیالات کا اظہار یوں کیا ہے:

میں یہ بات پوری صاف گوئی کے ساتھ کہہ رہا ہوں کہ میں جب اپنے آپ کو اس میں شامل کرتا ہوں جسے ''میں خود'' کہتا ہوں تو میں ہمیشہ ایک خاص ادراک کا سامنا کرتا ہوں جس کا تعلق گرم وسرد، روشنی یا سایے، محبت یا نفرت، کھٹے یا میٹھے یا کسی دوسرے خیال سے ہوتا ہے۔ ایک ادراک کی موجودگی کے بغیر میں ایک خاص وقت میں کبھی بھی اپنے آپ کو تسخیر نہیں کر سکتا اور مجھے سوائے ادراک کے کوئی اور شے نظر نہیں آتی۔

ادراکات کا دماغ میں متشکل ہونا کوئی فلسفہ نہیں بلکہ سائنسی حقیقت ہے

مادہ پرستوں کا دعویٰ ہے کہ ہم جو کچھ یہاں کہہ رہے ہیں وہ ایک فلسفیانہ تصوّر ہے۔ تاہم جسے ہم ''خارجی دنیا'' کہتے ہیں یہ ادراکات کا مجموعہ ہے اور یہ کوئی فلسفہ نہیں ہے بلکہ سیدھی سادہ سی سائنسی حقیقت ہے۔ دماغ میں خیالی شبیہات اور احساسات کیسے متشکل ہوتے ہیں اس بارے میں تمام طبی کالجوں میں پڑھایا جاتا ہے۔ ان حقائق کو بیسویں صدی کی سائنس ثابت کر چکی ہے، بالخصوص طبیعات یہ بات بڑی وضاحت کے ساتھ پیش کرتی ہے کہ مادہ ایک مطلق حقیقت نہیں رکھتا اور ہر انسان ایک طرح سے ''اپنے دماغ میں لگے ہوئے نگراں (مانیٹر) کو دیکھ رہا ہے''۔

ہر وہ انسان جو سائنسی حقائق پر یقین رکھتا ہے خواہ وہ ملحد ہو، بدھسٹ یا کسی دوسرے عقیدے کا ماننے والا، اسے اس حقیقت کو ماننا ہی پڑتا ہے۔ ایک مادہ پرست بھی خالق کے وجود سے انکار کر سکتا ہے مگر وہ بھی اس سائنسی حقیقت سے انکار نہیں کر سکتا۔

کارل مارکس، فریڈرک اینجلز، پولائزر اور دوسرے اس سادہ اور عیاں حقیقت کو نہ سمجھ سکے، یہ بات آج بھی بڑی حیران کن ہے حالانکہ ان کے زمانے میں سائنسی علوم اور دریافتیں ناکافی تھیں۔ ہمارے دور میں سائنس اور ٹیکنالوجی نے حیرت انگیز ترقی کی ہے اور حالیہ دریافتوں اور

تحقیق نے اس حقیقت کو سمجھنا آسان بنا دیا ہے۔ دوسری طرف مادہ پرستوں کو یہ خوف لاحق ہے کہ وہ بھی اس حقیقت کو سمجھے بغیر نہ رہ سکیں گے خواہ ایسا جزوی طور پر ہی کیوں نہ ہو۔ انہیں یہ احساس ہو گیا ہے کہ یہ حقیقت ان کے فلسفے کو باطل قرار دے رہی ہے۔

مادہ پرستوں کا عظیم خوف

تھوڑی مدت کے لئے ترک مادہ پرست حلقوں کی طرف سے اس کتاب میں دیئے گئے موضوع کے خلاف کوئی شدید ردعمل ظاہر نہیں ہوا تھا کہ مادہ محض ایک ادراک ہے۔ اس سے ہم یہ سمجھے کہ ہمارا نقطہ نظر زیادہ واضح نہیں تھا اور اس کی مزید وضاحت اور تشریح ضروری تھی۔ تاہم زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ یہ بات سامنے آ گئی کہ مادہ پرست بڑے بے چین اور مضطرب ہیں کہ یہ موضوع اس قدر مقبول کیوں ہو رہا ہے اور مزید یہ کہ انہیں اس سے بڑا خوف محسوس ہوا۔

کچھ دیر تک تو مادہ پرستوں نے اپنے خوف و ہراس کا اظہار اپنی مطبوعات، کانفرنسوں اور اپنے ہم خیال لوگوں میں بڑھ چڑھ کر کیا تھا۔ ان کے اس احتجاج اور مایوسانہ طرزِ عمل سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ایک شدید دانشورانہ بحران کا شکار ہیں۔ نظریۂ ارتقاء کی سائنسی موت، جو ان کے فلسفے کی بنیاد تھا، بھی ان کے لئے ایک بڑے صدمے سے کم نہ تھی۔ انہیں اب یہ احساس ہو چلا تھا کہ خود مادے کو انہوں نے کھونا شروع کر دیا ہے جو ڈارونیت کی نسبت ان کے لئے زیادہ بڑا اسہارا ہے اور اس سے انہیں مزید بڑا صدمہ ہوا۔ انہوں نے یہ اعلان کر دیا تھا کہ یہ ان کے لئے ایک "سب سے بڑا خطرہ" تھا جو "ان کے تہذیبی تانے بانے کو منسوخ" کر دیتا ہے۔ مادہ پرست حلقوں میں سے ایک نہایت بے باک شخص Renan Pekunlu نے جو ایک مشہور علمی ادارے سے وابستہ تھا اور "سائنس اینڈ یوٹوپیا" (Bilim ve Utopya) نامی جریدے میں لکھتا بھی تھا، مادہ پرستی کے دفاع کا کام اپنے ذمہ لے لیا تھا۔ اپنے مقالات میں جو اس جریدے میں چھپے اور ان سیمیناروں میں جن میں اس نے شرکت کی، اس نے "ارتقاء ایک فریب" (Evolution Deceit) کو مادہ پرستی کیلئے "اوّلین خطرہ" قرار دیا۔

جس بات نے کتاب کے ان ابواب سے بھی زیادہ، جو ڈارونیت کو باطل ٹھہراتے ہیں، Pekunlu کو زیادہ پریشان کیا، وہ کتاب کا وہ حصہ ہے جسے اب آپ پڑھ رہے ہیں۔ اس نے اپنے قارئین (صرف مٹھی بھر) اور سامعین کو یہ پیغام دیا:

''مثالیت کے تلقین عقیدہ سے مرعوب نہ ہوں اور مادہ پرستی میں اپنے عقیدے کو مضبوط رکھیں''۔اس نے ان کے سامنے روس کے خونی انقلاب کے رہنما Vladimir.I. Lenin کو حوالے کے طور پر پیش کیا تھا۔ اس نے ہر ایک سے کہا کہ وہ لینن کی سو سالہ پرانی کتاب Materialism & Empirio-Criticism کا مطالعہ کرے۔ وہ لینن کے مشورے دہراتا رہا اور ساتھ ساتھ یہ کہتا گیا ''اس مسئلے پر مت سوچو ورنہ تم لوگ مادہ پرستی کے راستے سے ہٹ جاؤ گے اور مذہب تم لوگوں کو اپنے ساتھ بہالے جائے گا''۔ مذکورہ بالا جرائد میں سے ایک میں لکھتے وقت اس نے لینن کی درج ذیل سطور کا اقتباس شامل کیا ہے:

ایک بار جب تم لوگ معروضی حقیقت کا انکار کر دیتے ہو، جو ہمیں حواس میں دی جاتی ہے تو آپ ''نظریۂ تیقن'' ۔(Fideism) کے خلاف استعمال ہونے والا ہر ہتھیار ضائع کر چکے ہوتے ہیں۔ جس لمحے ان لوگوں نے ''حواس'' (Sensations) کو خارجی دنیا کی ایک خیالی تصویر نہیں سمجھا تھا بلکہ وہ اسے ایک خاص ''عنصر'' سمجھتے تھے، وہ اس کے دام فریب میں آچکے تھے۔

یہ کسی شخص کی حس، دماغ، روح، مرضی و ارادہ نہیں ہے۔ ان الفاظ سے یہ بات صاف صاف واضح ہو جاتی ہے کہ وہ حقیقت جس کا لینن کو خوفناک حد تک اندازہ ہو گیا تھا اور جسے وہ اپنے ذہن سے اور اپنے ساتھیوں (کامریڈوں) کے ذہنوں سے نکال دینا چاہتا تھا، یہ بات بھی ہمعصر مادہ پرستوں کو یکساں طور پر پریشان کرنے کے لئے کافی تھی۔ تاہم Pekunlu اور دوسرے مادہ پرستوں کو زیادہ پریشانی لاحق ہے؛ اس لئے کہ وہ جانتے ہیں کہ سو سال قبل کی نسبت آج اس حقیقت کو زیادہ صاف صاف، واضح، یقینی اور ذہنوں میں اتر جانے والے انداز میں پیش کیا جارہا ہے۔ دنیا کی تاریخ میں پہلی بار اس موضوع کو اس غیر مزاحمتی طریقے سے پوری وضاحت کے ساتھ سامنے لایا جارہا ہے۔

تاہم عمومی صورت یہ بنتی ہے کہ مادہ پرست سائنسدانوں کی ایک بڑی تعداد اس حقیقت کہ ''مادہ ایک فریب یا سراب کے سوا کچھ بھی نہیں ہے'' کے خلاف بڑا بھونڈا جواز پیش کرتی ہے۔ اس باب میں جس موضوع پر بات کی گئی ہے وہ ایک نہایت اہم اور جذبات انگیز موضوع ہے، شاید ہی ایسا کوئی اور موضوع ہوگا جس سے ایک انسان کا زندگی بھر آمنا سامنا ہو سکتا ہو۔ انہیں اس سے قبل ایسے اہم موضوع سے کبھی واسطہ نہ پڑا ہوگا۔ پھر بھی ان سائنسدانوں کے ردعمل یا جس طرح وہ اپنی تقریروں اور مقالات میں اس کا اظہار کرتے ہیں یہ حال ہے کہ ان کا نقطہ نظر نہایت سطحی اور ان کی

سوچ اور فکر کی گہرائی کم دکھائی دیتی ہے۔

یہاں تک کہ جس موضوع پر یہاں بحث کی گئی ہے اس سے متعلق کچھ مادہ پرستوں کے ردعمل یہ ظاہر کرتے ہیں کہ مادہ پرستی پر ان کے اندھے یقین نے ان کے استدلال کو نقصان پہنچایا ہے اور اسی وجہ سے وہ اس موضوع کو سمجھنے میں بری طرح ناکام ہوئے ہیں۔ مثال کے طور پر Alaattin Senel جو ایک علمی ادارے سے وابستہ تھا اور Bilim Ve Utopia جریدے کے لئے لکھتا تھا، نے اسی طرح کے پیغامات دیئے جیسے Rennan Pekunlu نے دیئے تھے۔ اس نے کہا: ''ڈارونیت کی موت کو بھول جاؤ، اصل خطرہ تو اس موضوع سے ہے''۔ اور اس نے اس طرح کے مطالبے کئے: ''پس جو تم کہتے ہو اسے ثابت کرو'' وہ یہ سمجھ چکا تھا کہ اس کے اپنے فلسفے کی کوئی بنیاد نہیں تھی۔ زیادہ دلچسپ بات یہ ہے کہ اس ادیب نے خود کچھ سطریں ایسی لکھی ہیں جو یہ ظاہر کرتی ہیں کہ وہ کسی طرح بھی اس حقیقت کو گرفت میں نہیں لے سکتا جسے وہ ایک خطرہ سمجھتا ہے۔

مثال کے طور پر اس نے اپنے ایک مقالے میں جس میں صرف وہ اس موضوع پر بحث کر رہا تھا، Senel اس بات کا اعتراف کرتا ہے کہ خارجی دنیا کا ادراک دماغ میں ایک خیالی تصویر کے طور پر ہوتا ہے۔ پھر آگے چل کر وہ یہ دعویٰ کرتا ہے کہ یہ خیالی تصویریں دو حصوں میں تقسیم ہو جاتی ہیں ایک وہ جو طبعی رابطے رکھتی ہیں اور دوسری وہ جو طبعی رابطے نہیں رکھتیں اور یہ کہ خارجی دنیا سے تعلق رکھنے والی خیالی تصویروں کے طبعی رابطے ہوتے ہیں۔ اپنے دعوے کی حمایت میں وہ ''ٹیلیفون کی مثال'' پیش کرتا ہے۔ خلاصے کے طور پر اس نے لکھا کہ ''میں نہیں جانتا کہ میرے دماغ میں تشکیل پانے والی خیالی تصویروں کا خارجی دنیا کے ساتھ کوئی تعلق و رشتہ ہے یا نہیں مگر جب میں فون پر بات کرتا ہوں تو اسی چیز کا اطلاق ہوتا ہے۔ جب فون پر کسی سے بات کرتا ہوں تو جس شخص سے میں بات کر رہا ہوتا ہوں وہ مجھے نظر نہیں آتا مگر جب بعد ازاں میں اس شخص سے بالمشافہ ملتا ہوں تو میں اپنی گفتگو کے بارے میں تصدیق کر سکتا ہوں۔

یہ کہتے وقت دراصل اس ادیب کا مطلب یہ تھا: ''اگر ہم اپنے ادراکات پر شبہ کرنے لگ جائیں تو ہم نہ تو اس مادے کو دیکھ سکتے ہیں نہ اس کی حقیقت کی پڑتال کر سکتے ہیں''۔ تاہم یہ ایک عیاں غلط فہمی ہے اس لئے کہ ہمارے لئے یہ ممکن ہی نہیں کہ ہم اس مادے تک پہنچ سکیں۔ ہم اپنے ذہن سے باہر کبھی نکل ہی نہیں سکتے اور نہ ہی یہ جان سکتے ہیں کہ ''باہر'' کیا ہے۔ خواہ فون پر ہونے

والی بات کا کوئی رشتہ و تعلق ہے یا نہیں، اس کی تصدیق اس شخص سے کی جا سکتی ہے جس کے ساتھ فون پر گفتگو ہوئی۔ تاہم یہ تصدیق بھی دماغ کا ایک خیالی تجربہ ہوگا۔

دراصل یہ لوگ ان ہی واقعات کو اپنے خوابوں میں دیکھتے ہیں۔ مثال کے طور پر ایک شخص خواب میں دیکھتا ہے کہ وہ فون پر بات کر رہا ہے اور پھر وہ اس بات چیت کے بارے میں اس شخص سے تصدیق کر لیتا ہے جس سے اس نے بات کی تھی۔ یا Pekunlu اپنے خواب میں یہ محسوس کر سکتا ہے کہ اسے ''ایک سنگین خطرہ'' لاحق ہے اور وہ لوگوں کو مشورہ دیتا ہے کہ وہ سو سال قبل لکھی گئی لینن کی کتاب پڑھیں۔ تاہم یہ بات قابل غور نہیں کہ وہ کیا کرتے ہیں۔ یہ مادہ پرست اس حقیقت کو نہیں جھٹلا سکتے کہ جن واقعات کے تجربے سے وہ گزر رہے ہیں اور جن لوگوں سے وہ اپنے خوابوں میں ہمکلام ہوئے ہیں وہ سوائے ادراکات کے کچھ نہ تھا۔

مگر ایک شخص کس سے اس بات کی تصدیق کرے گا کہ دماغ کے اندر تشکیل پانے والی یہ خیالی شبیہات رابطہ و تعلق رکھتی ہیں یا نہیں؟ کیا اسے دوبارہ اپنے دماغ میں موجود ان خیالی پیکروں سے رجوع کرنا ہوگا؟ بلاشبہ مادہ پرستوں کے لئے یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ اس معلومات کے ماخذ کو تلاش کر سکیں جو دماغ سے باہر کی دنیا کے بارے میں اعداد و شمار دے سکے اور اس کی تصدیق کر سکے۔

یہ تسلیم کرتے ہوئے کہ تمام ادراکات دماغ میں متشکل ہوتے ہیں مگر یہ فرض کرتے ہوئے کہ کوئی انسان اس سے ''باہر'' قدم رکھ سکتا ہے وہ حقیقی خارجی دنیا کے ذریعے ان ادراکات کی تصدیق کر لینے کے بعد یہ ظاہر کرتا ہے کہ اس شخص کی قوت مدرکہ بہت محدود ہے اور اس کا استدلال بڑا مسخ شدہ ہے۔

تاہم جس حقیقت کے بارے میں یہاں بتایا جا رہا ہے ایک عام فہم و استدلال کا مالک شخص بھی اسے آسانی کے ساتھ تسخیر کر سکتا ہے۔ تعصّبات سے بالاتر ہو کر ہر شخص، جو کچھ ہم نے کہا اس سے متعلق جان جائے گا، کہ حواس کی مدد سے وہ خارجی دنیا کی موجودگی کی پڑتال نہ کر سکے گا۔ تاہم ایسا لگتا ہے کہ مادہ پرستی پر اندھا یقین لوگوں کی استدلالی صلاحیت کو مسخ کر دیتا ہے۔ اس وجہ سے معاصر مادہ پرست اپنے ان نگرانوں (Mentors) کی طرح بہت سے منطقی نقائص کو منظر عام پر لے آتے ہیں، جنہوں نے مادے کی موجودگی کو ''ثابت'' کرنے کے لئے پتھروں کو ٹھوکر ماری اور کیک کھائے تھے۔

یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ یہ کوئی حیرانگیز صورت حال نہیں ہے؛ کیونکہ نہ سمجھنے والی صفت تمام کافروں میں مشترک ہوتی ہے۔ قرآن پاک میں ان کے بارے میں اللہ جل شانہٗ بطور خاص فرماتا ہے: ''یہ لوگ عقل نہیں رکھتے''۔ (سورۃ المائدہ: ۵۸)

مادہ پرست تاریخ کے سب سے بڑے دام میں پھنس چکے ہیں

ترکی میں مادہ پرست حلقوں نے جو وسیع پیمانے پر دہشت کی فضا پیدا کی ہے جس میں سے ہم نے صرف چند مثالیں پیش کی ہیں، اس سے بھی یہ بات واضح ہوگئی ہے کہ مادہ پرستوں کو جس شکست فاش کا یہاں سامنا کرنا پڑا اس کی مثال تاریخ میں کہیں نہیں ملتی۔ جدید سائنس نے یہ حقیقت ثابت کر دی ہے کہ مادہ محض ایک ادراک ہے اور اسے ایک صاف صاف، واضح اور دو ٹوک انداز میں بڑے زوردار طریقے سے سامنے لایا گیا ہے۔ اب یہ مادہ پرستوں پر منحصر ہے کہ وہ یہ دیکھیں کہ پوری مادی دنیا جس پر وہ آنکھیں بند کر کے یقین رکھتے اور اعتبار کیا کرتے تھے کس طرح گر کر ڈھیر ہوگئی ہے۔

انسانیت کی پوری تاریخ میں مادہ پرستانہ فکر ہمیشہ موجود رہی ہے۔ اپنے آپ پر اور اپنے فلسفے پر یقین رکھتے ہوئے انہوں نے اللہ کے خلاف بغاوت کر دی جس نے انہیں تخلیق کیا ہے۔ جو منظر نامہ انہوں نے تشکیل دیا اس میں یہ بتایا گیا تھا کہ مادے کی ابتداء اور انتہاء کوئی نہیں ہے۔ اور ان کا ممکنہ طور پر کوئی خالق نہیں ہے۔ انہوں نے اپنی ہٹ دھرمی کی وجہ سے جب اللہ کا انکار کیا تو انہوں نے اس مادے میں پناہ لی جو ان کے خیال میں ایک حقیقی وجود رکھتا تھا۔ ان کا اس فلسفے پر اس قدر یقین تھا کہ ان کے خیال میں ایسا کبھی ممکن نہ ہوگا کہ اسے اس کے برعکس ثابت کرنے کے لئے کسی تشریح کی ضرورت ہوگی۔

یہی وجہ ہے کہ مادے کی اصل حقیقت کے بارے میں جن حقائق کا اس کتاب میں ذکر کیا گیا اس نے ان لوگوں کو بہت حیران کر دیا تھا۔ جو کچھ یہاں بیان کیا ہے اس نے ان کے فلسفے کی بنیاد ہلا کر رکھ دی ہے اور مزید بحث کی کوئی گنجائش نہیں چھوڑی۔ وہ مادہ جس پر ان کے تمام خیالات، زندگیوں، ہٹ دھرمی اور انکار کی بنیاد تھی اچانک غائب ہوگیا۔ جب مادے کا ہی کوئی وجود نہیں ہے تو مادہ پرستی کیسے موجود ہوگی؟

اللہ کی صفات میں سے ایک یہ ہے کہ وہ منکرین حق کے خلاف بہتر تدبیر کرنے والا ہے۔

اس کا ذکر قرآن پاک کی اس آیت میں یوں آیا ہے:

وَيَمْكُرُوْنَ وَيَمْكُرُ اللّٰهُ ط وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ o

''وہ اپنی چالیں چل رہے تھے اور اللہ سب سے بہتر چال چلنے والا ہے'' (سورۃ الانفال: ۳۰)

اللہ نے مادہ پرستوں کو انہیں یہ سمجھنے کی طرف مائل کر کے گھیر لیا تھا کہ مادہ موجود ہے اور جب انہوں نے ایسا کیا تو انہیں ان دیکھے طریقے سے ذلیل وخوار کر کے رکھ دیا تھا۔ مادہ پرست اپنے مال واسباب، مرتبے، عہدے، طبقہ جس سے ان کا تعلق تھا، پوری دنیا اور جو کچھ اس میں تھا سب پر یقین رکھتے تھے۔ مگر ان سب پر انحصار کرتے ہوئے وہ اللہ کے باغی ہو گئے تھے۔ انہیں اپنے آپ پر بڑا گھمنڈ تھا اور وہ اللہ کے خلاف بغاوت پر اتر آئے تھے۔ ایسا کرتے وقت وہ مکمل طور پر مادے پر انحصار کر رہے تھے۔ مگر ان میں علم وفراست کی اس قدر کمی ہے کہ وہ یہ سمجھنے میں ناکام ہو جاتے ہیں کہ اللہ ان پر چاروں طرف سے محیط ہے۔ منکرین حق جس حالت میں ہیں اور اپنی حماقت اور کوڑھ مغزی کے نتیجے میں کہاں جا رہے ہیں اس کا اعلان اللہ یوں فرماتا ہے:

اَمْ يُرِيْدُوْنَ كَيْدًا ط فَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا هُمُ الْمَكِيْدُوْنَ o

''کیا یہ کوئی چال چلنا چاہتے ہیں؟ اگر یہ بات ہے تو کفر کرنے والوں پر ان کی چال الٹی ہی پڑے گی''۔ (سورۃ الطور: ۴۲)

یہ یقیناً تاریخ میں سب سے بڑی شکست ہے۔ مادہ پرستوں نے جب اللہ کے خلاف جنگ چھیڑ دی تو انہیں اس میں بری طرح شکست ہوئی۔ اس بارے میں قرآن پاک میں ارشاد باری تعالیٰ ہوتا ہے:

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا فِيْ كُلِّ قَرْيَةٍ اَكٰبِرَ مُجْرِمِيْهَا لِيَمْكُرُوْا فِيْهَا ط وَمَا يَمْكُرُوْنَ اِلَّا بِاَنْفُسِهِمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ o

''اور اسی طرح ہم نے ہر بستی میں اس کے بڑے بڑے مجرموں کو لگا دیا ہے کہ وہاں اپنے مکر وفریب کا جال پھیلائیں دراصل وہ اپنے مکر وفریب کے جال میں آپ پھنستے ہیں مگر انہیں اس کا شعور نہیں ہے''۔ (سورۃ الانعام: ۱۲۳)

ایک اور سورۃ میں اسی حقیقت کو اس طرح بیان فرمایا ہے:

يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ج وَمَا يَخْدَعُوْنَ اِلَّا اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ o

''وہ اللہ اور ایمان لانے والوں کے ساتھ دھوکہ بازی کر رہے ہیں مگر دراصل وہ خود اپنے

آپ ہی کو دھوکے میں ڈال رہے ہیں۔ اور انہیں اس کا شعور نہیں ہے"۔ (سورۃ البقرۃ: ۹)

جب یہ منکرین حق کوئی چال چلتے ہیں تو ایک نہایت اہم حقیقت بھول جاتے ہیں کہ وہ اپنے آپ کو دھوکہ دے رہے ہیں جس کا انہیں شعور نہیں رہتا۔ یہ حقیقت ہے کہ ہر وہ شے جوان کے تجربے میں آتی ہے وہ ایک خیالی پیکر ہے، جس کا وہ ادراک کرتے ہیں اور ان کی تمام چالیں جو وہ تشکیل دیتے ہیں ان کے ہر دوسرے کام کی طرح ان کے اپنے ذہنوں میں متشکل ہونے والی خیالی تصویریں ہوتی ہیں۔ وہ احمق ہیں جو یہ بھول جاتے ہیں کہ وہ اللہ کے ساتھ بالکل اکیلے ہیں اور اسی لئے وہ اپنی ہی پرفریب چالوں میں پھنس جاتے ہیں۔

ماضی کے منکرین حق کی مانند آج کے کافروں کو بھی اس حقیقت کا سامنا کرنا پڑتا ہے جو ان کی پرفریب چالوں کو ان کی بنیاد سمیت ہلا کر رکھ دیتی ہے۔ اللہ نے ارشاد فرما دیا ہے کہ کفار کی یہ چالیں جس روز تیار کی گئیں اسی روز انہیں ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ اور مومنین کو یہ خوشخبری سنا دی گئی:

لَا يَضُرُّكُمْ كَيْدُهُمْ شَيْئًا ط

"مگر ان کی کوئی تدبیر تمہارے خلاف کارگر نہیں ہوسکتی"۔ (سورۃ آل عمران: ۱۲۰)

ایک اور سورۃ میں ارشاد باری تعالیٰ ہوتا ہے:

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا اَعْمَالُهُمْ كَسَرَابٍ بِقِيْعَةٍ يَّحْسَبُهُ الظَّمْاٰنُ مَآءً ط حَتّٰى اِذَا جَآءَهٗ لَمْ يَجِدْهُ شَيْئًا ط

"(اس کے برعکس) جنہوں نے کفر کیا ان کے اعمال کی مثال ایسی ہے جیسے دشتِ بے آب میں سراب کہ پیاسا اس کو پانی سمجھے ہوئے تھا مگر جب وہاں پہنچا تو کچھ نہ پایا"۔ (سورۃ النور: ۳۹)

مادہ پرستی بھی باغیوں کے لئے ایک "سراب" بن جاتی ہے بالکل اسی طرح جیسے اوپر دی گئی آیت میں کہ جب وہ وہاں پہنچتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ تو سراب تھا۔ اللہ نے اس قسم کے سراب سے انہیں خود چال چل کے دکھائی اور ان کو اس طرح دھوکے میں ڈال دیا کہ وہ خیالی شبیہات کے مجموعے کو اصلی سمجھنے لگ گئے تھے۔ وہ تمام "مشہور" لوگ، پروفیسر، ماہرین علم فلکیات، ماہرین حیاتیات، طبیعیات دان اور تمام دوسرے بلا امتیاز عہدہ و منصب بچوں کی مانند فریب میں آجاتے ہیں اور اس لئے ذلیل و خوار ہو جاتے ہیں کیونکہ مادے کو اپنا خدا سمجھتے تھے۔ انہوں نے خیالی تصاویر کے مجموعے کو اصلی سمجھا اور اپنے فلسفے کی بنیاد اس نظریے پر رکھ دی تھی۔ وہ بڑی سنجیدہ بحث

کرتے تھے اور انہوں نے اسے ایک نام نہاد ''دانشورانہ'' نام دے دیا تھا۔ وہ اس کائنات کی سچائی کے بارے میں دلائل دیتے وقت اپنے آپ کو بڑا دانا سمجھتے تھے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اپنی محدود سی عقل سے اللہ کے متعلق مناظرے کرتے تھے۔ اللہ نے ان کی حالت کا ذکر درج ذیل سورۃ میں یوں فرمایا ہے:

وَمَكَرُوْا وَمَكَرَ اللّٰهُ ؕ وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ۝

''وہ خفیہ تدبیریں کرنے لگے تھے جواب میں اللہ نے بھی اپنی خفیہ تدبیر کی اور ایسی تدبیروں میں اللہ سب سے بڑھ کر ہے''۔ (سورۃ آل عمران:۵۴)

ممکن ہے کچھ تدبیروں سے بچا جا سکتا ہو مگر اللہ کی اس تدبیر سے بچنا ناممکن تھا جو کفار کے خلاف تھی۔ وہ خواہ کچھ بھی کر لیں اور جس سے چاہیں درخواست کر دیکھیں اللہ کے سوا انہیں کوئی مددگار بھی نہ مل سکے گا۔ اس نے اس بارے میں قرآن پاک میں اس طرح مطلع فرمایا ہے:

وَلَا يَجِدُوْنَ لَهُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا۝

''اللہ کے سوا جن جن کی سرپرستی و مدد پر وہ بھروسہ رکھتے ہیں ان میں سے کسی کو بھی وہ وہاں نہ پائیں گے''۔ (سورۃ النساء:۱۷۳)

مادہ پرستوں نے یہ کبھی توقع نہ کی تھی کہ اس قسم کے جال میں پھنس جائیں گے۔ بیسویں صدی کے تمام وسائل رکھتے ہوئے انہوں نے سوچا تھا کہ وہ اپنے انکار میں ضدی اور ہٹ دھرم ہو سکتے ہیں اور لوگوں کو مذہب سے دور کھینچ لے جا سکتے ہیں۔ منکرین حق کی یہ کبھی نہ بدلنے والی ذہنیت اور ان کے انجام کے بارے میں قرآن پاک کی درج ذیل سورۃ میں یوں ارشاد ہوا ہے:

وَمَكَرُوْا مَكْرًا وَّمَكَرْنَا مَكْرًا وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ۝ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ مَكْرِهِمْ اَنَّا دَمَّرْنٰهُمْ وَقَوْمَهُمْ اَجْمَعِيْنَ۝

''یہ چال تو وہ چلے اور پھر ایک چال ہم نے چلی جس کی انہیں خبر نہ تھی۔ اب دیکھ لو ان کی چال کا انجام کیا ہوا۔ ہم نے تباہ کر کے رکھ دیا ان کو اور ان کی پوری قوم کو''۔ (سورۃ النمل:۵۱-۵۰)

اس کا ایک مفہوم ان آیات میں بیان کردہ حقیقت کے مطابق یہ بنتا ہے: مادہ پرستوں کو احساس دلایا جا رہا ہے کہ ان کے پاس جو کچھ ہے وہ ایک سراب ہے اور اسی لئے جو کچھ ان کے پاس ہے اسے ضائع کر دیا گیا ہے۔ یہ اپنے مال و اسباب، کارخانوں، سونے، ڈالروں، بچوں، بیویوں، دوستوں، عہدہ و منصب یہاں تک کہ اپنے جسموں پر نظر ڈالتے ہیں، جو ان کے خیال میں

موجود ہیں مگر ان کے ہاتھوں سے نکلے جا رہے ہیں۔ یہ سب کچھ سورۃ الانعام کی آیت :۵۱ کے مطابق ''ضائع'' کر دیا گیا ہے۔اس مقام پر وہ مادے نہیں رہے بلکہ روحیں ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ سچائی مادہ پرستوں کے لئے بدترین شے ہے۔ یہ حقیقت کہ جو کچھ ان کے پاس ہے ایک سراب ہے اس کا مطلب ان کے اپنے الفاظ میں اس دنیا میں ''مرنے سے پہلے موت'' ہے۔

یہ حقیقت ان کو اللہ کے ساتھ اکیلا چھوڑ دیتی ہے، اس قرآنی آیت کے مطابق اللہ نے ہماری توجہ اس طرف مبذول کرائی ہے کہ ہر انسان دراصل اللہ کی موجودگی میں تنہا ہوتا ہے:

ذَرۡنِیۡ وَمَنۡ خَلَقۡتُ وَحِیۡدًاۙ

''چھوڑ دو مجھے اور اس شخص کو جسے میں نے اکیلے پیدا کیا''۔ (سورۃ المدثر:۱۱)

اس اہم حقیقت کو قرآن پاک کی اور بھی کئی سورتوں میں دہرایا گیا ہے:

وَلَقَدۡ جِئۡتُمُوۡنَا فُرَادٰی کَمَا خَلَقۡنٰکُمۡ اَوَّلَ مَرَّۃٍ وَّتَرَکۡتُمۡ مَّا خَوَّلۡنٰکُمۡ وَرَآءَ ظُہُوۡرِکُمۡ ۚ

''(اور اللہ فرمائے گا) لو اب تم ویسے ہی تن تنہا ہمارے سامنے حاضر ہو گئے جیسا ہم نے تمہیں پہلی مرتبہ اکیلا پیدا کیا تھا، جو کچھ ہم نے تمہیں دنیا میں دیا تھا وہ سب تم پیچھے چھوڑ آئے ہو''۔ (سورۃ الانعام:۹۴)

وَکُلُّہُمۡ اٰتِیۡہِ یَوۡمَ الۡقِیٰمَۃِ فَرۡدًاؕ

''سب قیامت کے روز فرداً فرداً اس کے سامنے حاضر ہوں گے''۔ (سورۃ مریم:۹۵)

قرآنی آیات میں جس حقیقت کا ذکر کیا گیا، اس کا ایک مفہوم یہ بنتا ہے:

وہ جو مادے کو اپنا خدا مانتے ہیں انہیں اللہ نے تخلیق کیا ہے اور اسی کے پاس انہیں لوٹ کر جانا ہے۔ وہ ایسا چاہیں نہ چاہیں مگر ان کی مرضی ومنشا اللہ کی مرضی کے تابع ہے۔ اب وہ یوم حساب کا انتظار کریں جس دن کہ ان میں سے ہر ایک سے پورا پورا حساب لیا جائے گا۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ اسے سمجھنے کے لئے جس قدر چاہیں بددلی کا اظہار کریں۔

خلاصہ

اب تک جس موضوع پر ہم نے بات کی وہ ایک سب سے بڑی سچائی ہے جو آپ کو پوری

زندگی میں کبھی نہ بتائی گئی ہوگی۔ یہ ثابت کرتے ہوئے کہ تمام مادی دنیا دراصل ایک "پرچھائیں" ہے، یہ موضوع اللہ کے وجود اور اس کے خالق ہونے کے بارے میں اور یہ جاننے کیلئے کہ وہی ذاتِ بے مثل و بے مثال قادر مطلق ہے، ایک کلید کی حیثیت رکھتا ہے۔

وہ شخص جو اس موضوع کو سمجھتا ہے، اسے یہ احساس ہو جاتا ہے کہ یہ دنیا وہ کچھ نہیں جو زیادہ تر لوگوں کی نظر میں ہے۔ یہ دنیا ایک ایسا مطلق مقام نہیں جہاں ایک اصلی وجود پایا جاتا ہو، جیسا کہ وہ لوگ سمجھتے ہیں جو بے مقصد گلی کوچوں میں گھومتے پھرتے ہیں، جو شراب خانوں میں ایک دوسرے سے الجھتے ہیں، جو مہنگے ریستورانوں میں اپنی دولت کا مظاہرہ کرتے ہوں جو اپنی املاک پر شیخی بگھارتے پھرتے ہیں یا جنہوں نے کھوکھلے اور بیکار مقاصد کے لئے اپنی عمریں وقف کر رکھی ہیں۔ یہ دنیا ادراک کا مجموعہ اور ایک سراب ہے وہ تمام لوگ جن کا ہم نے اوپر ذکر کیا سایے ہیں۔ جو ان ادراکات کو اپنے ذہنوں میں دیکھتے ہیں۔ مگر پھر بھی وہ اس حقیقت سے آگاہ نہیں ہیں۔

یہ نظریہ اس لئے اہم ہے کیونکہ یہ اس مادہ پرستانہ فلسفے کی قدر و قیمت گھٹا دیتا ہے جو اللہ کے وجود سے انکار کرتا اور اس کی موت کا باعث بنتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مارکس، اینجلز اور لینن جیسے اشتراکیوں نے خوف محسوس کیا۔ غضبناک ہوئے اور اپنے پیروکاروں کو انتباہ کیا کہ جب کبھی ان کو اس کے بارے میں بتایا جائے تو اس نظریے پر کبھی "مت سوچیں"۔ دراصل ان لوگوں کی ذہنی حالت کچھ اس قسم کی ہوتی ہے کہ وہ اس حقیقت کو سمجھ ہی نہیں پاتے کہ ادراکات دماغ کے اندر متشکل ہوتے ہیں۔ ان کے خیال میں وہ دنیا جو انہیں دماغ کے اندر نظر آتی ہے وہ "خارجی دنیا" ہے۔ اور اس کے برعکس عیاں اور واضح ثبوت کو سمجھ ہی نہیں سکتے۔

یہ بے خبری اس عقل و دانائی کی کمی کی وجہ سے ہوتی ہے جو اللہ نے منکرین حق کو دے رکھی ہوتی ہے۔ ان کفار کے بارے میں قرآن پاک میں یوں ارشاد ہوا:

لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا وَلَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا وَلَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا ط اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ ط اُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ o

"ان کے پاس دل ہیں مگر وہ ان سے سوچتے نہیں، ان کے پاس آنکھیں ہیں مگر وہ ان سے دیکھتے نہیں، ان کے پاس کان ہیں مگر وہ ان سے سنتے نہیں، وہ جانوروں کی طرح ہیں بلکہ ان سے بھی گئے گزرے یہ وہ لوگ ہیں جو غفلت میں کھوئے گئے ہیں"۔ (سورۃ الاعراف: ۱۷۹)

آپ اپنی ذاتی فکر کی قوت سے اس مقام سے آگے تک دریافت کر سکتے ہیں اس کے لئے

آپ کو پورے انہماک کے ساتھ اپنے اردگرد کی چیزوں پر غور وفکر کرنا ہوگا اور ان چیزوں کو اس طرح قبول کرنا ہوگا جیسی وہ نظر آتی ہیں اور جس طرح آپ ان کالمس محسوس کرتے ہیں۔ اگر آپ نے بہ نظرِ عمیق غور وفکر کیا تو آپ محسوس کریں گے کہ ایک دانا و بینا انسان جو دیکھتا ہے، سنتا ہے، چھوتا ہے، سوچتا ہے اور اس لمحے اس کتاب کا مطالعہ کر رہا ہے وہ ایک روح ہے جو ان ادراکات کو پردۂ سکرین پر دیکھ رہی ہے جسے ''مادہ'' کہتے ہیں۔ جو انسان اس کو سمجھتا ہے اس کے بارے میں یہ خیال کیا جاتا ہے کہ وہ مادی دنیا کی سرحدوں سے دور نکل گیا ہے جو بنی نوعِ انسان کی اکثریت کو دھوکہ دیتی ہے اور وہ حقیقی وجود کی اقلیم میں داخل ہو چکا ہے۔

اس حقیقت کو تاریخ میں بہت سے ملحدین اور فلسفیوں نے سمجھ لیا ہے۔ مسلم دانشور مثلاً امام ربانی، محی الدین ابن عربی اور مولانا جامی کو اس حقیقت کا احساس قرآنی آیات کے ذریعے سے ہوا۔ انہوں نے اس کے ساتھ ساتھ اپنا استدلال بھی استعمال کیا۔ کچھ مغربی فلسفیوں مثلاً جارج برکلے وغیرہ نے اس حقیقت کو بذریعہ استدلال سمجھا ہے۔ امام ربانی اپنے مکتوبات میں لکھتے ہیں کہ یہ پوری مادی دنیا ایک ''سراب اور قیاس'' ہے۔ اور ذاتِ مطلق صرف اللہ ہے:

اللہ...... اس نے جو چیزیں تخلیق کیں ان کا وجود حقیقی عدم ہے۔ اس نے سب کچھ حواس اور سرابوں کے حلقے کے اندر تخلیق کیا ہے...... اس کائنات کا وجود ان حواس اور سرابوں پر قائم ہے اور یہ مادی نہیں ہے...... دراصل خارجی دنیا میں سوائے اس جلیل القدر ہستی کے (جو اللہ ہے) کچھ بھی نہیں ہے۔

امام ربانی نے نہایت صاف صاف طور پر فرمایا کہ وہ تمام خیالی پیکر جو انسان کو پیش کئے گئے سراب ہیں اور ''خارجی دنیا'' میں ان کی اصل تصویریں کوئی وجود نہیں رکھتیں۔

اس تصوّراتی دائرہ کی تصویر کشی تخیل میں کی گئی ہے۔ یہ اسی حد تک دیکھا جا سکتا ہے جس حد تک اس کی تصویر کشی کی گئی ہے۔ مگر اسے دیکھا صرف ذہن کی آنکھ سے جا سکتا ہے۔ خارجی دنیا میں ایسا لگتا ہے جیسے اسے سر کی آنکھ سے دیکھا جا رہا ہے۔ تاہم ایسی بات نہیں ہے۔ خارجی دنیا میں نہ اس کا کوئی نمایاں لقب ہے نہ کوئی نشان، کوئی ایسی حالت نہیں ہوتی جسے دیکھا جا سکے۔ ایک آئینے میں منعکس کسی انسان کا چہرہ ایسا ہوتا ہے۔ خارجی دنیا میں اسے کوئی ثبات یا ٹھہراؤ حاصل نہیں ہے۔ بیشک اس کا ٹھہراؤ اور تصویر دونوں تخیل میں ہوتے ہیں۔ اللہ وہ ہے جو بہتر جانتا ہے۔

مولانا جامی نے اسی حقیقت کو بیان کیا ہے جو آپ نے قرآنی آیات کی پیروی کر کے اور

اپنی عقل استعمال کرنے کے بعد دریافت کی: ''کائنات میں جو کچھ بھی ہے وہ حواس اور سراب ہے۔ وہ یا تو آئینہ میں منعکس ہونے والے پرتو ہیں یا سایے''۔

تاہم جن لوگوں نے اس حقیقت کو سمجھا تاریخ میں ان کی تعداد ہمیشہ بہت محدود رہی ہے۔ بڑے بڑے سکالر مثلاً امام ربانی نے لکھا ہے کہ اس حقیقت کو عوام کو بتانا بہت تکلیف دہ بات رہی ہے۔ زیادہ تر لوگ اسے سمجھ ہی نہیں سکتے۔

جس عہد میں ہم رہ رہے ہیں اس میں سائنس نے اس حقیقت کو ثبوت مہیا کر کے اسے تجرباتی بنا دیا ہے۔ یہ حقیقت کہ دنیا ایک سایہ ہے اسے تاریخ میں پہلی بار نہایت ٹھوس، واضح اور صاف صاف انداز میں پیش کیا گیا ہے۔

اس وجہ سے اکیسویں صدی ایک ایسا تاریخی موڑ ہوگا جب لوگ الہامی حقیقتوں کو سمجھنے لگیں گے اور اللہ کی جانب گروہ در گروہ رخ کریں گے، جو واحد ذات مطلق ہے۔ اکیسویں صدی میں انیسویں صدی کے مادہ پرستانہ عقائد کو نکال کر تاریخ کے لغو لٹریچر کے ڈھیر پر پھینک دیا جائے گا۔ اللہ کی موجودگی اور تخلیق کی بات سمجھ میں آ جائے گی، لامکانیت اور لازمانیت کے حقائق سمجھ میں آ جائیں گے۔ نوعِ انسانی صدیوں پرانے پردوں، دھوکہ و فریب اور توہم پرستی کو توڑ کر باہر نکل آئے گی جو انہیں اب تک جکڑے ہوئے تھی۔

اس ناگزیر راستے کے لئے کوئی بھی سایہ سدِ راہ نہیں بن سکے گا۔

اضافیتِ زماں اور مسئلہ تقدیر کی حقیقت

جو کچھ اب تک بیان کیا گیا ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ ''سہ جہتی مکاں'' درحقیقت کوئی وجود نہیں رکھتا۔ اور یہ کہ یہ ایک ایسی بدگمانی ہے جو مکمل طور پر قیاسات کی پیداوار ہے اور یہ کہ انسان پوری عمر ''لامکانیت'' میں گزارتا ہے۔ اس کے برعکس کچھ کہنے کے لئے ایک توہم پرستانہ عقیدہ اختیار کرنا پڑے گا جو استدلال اور سائنسی سچائی سے دور ہوگا، اس لئے کہ سہ جہتی مادی دنیا کی موجودگی کا کوئی معقول ثبوت نہیں ہے۔

یہ حقیقت اس ابتدائی مادہ پرستانہ فلسفے کے مفروضے کی تردید کر دیتی ہے جو نظریۂ ارتقاء کو سہارا دیتا ہے۔ اس مفروضے کے مطابق مادہ مطلق اور دائمی ہے۔ دوسرا مفروضہ جس کے سہارے مادہ پرستانہ فلسفہ کھڑا ہے، وہ یہ ہے کہ زماں مطلق اور دائمی ہے۔ یہ بھی اسی قدر توہم پرستانہ ہے جس قدر پہلا مفروضہ۔

زماں کا ادراک

وہ ادراک جسے ہم زماں کہتے ہیں وہ دراصل ایک ایسا طریقہ ہے جس کے ذریعے ایک لمحے کا موازنہ دوسرے لمحے سے کیا جاتا ہے۔ ہم اس کی تشریح ایک مثال کے ذریعے کر سکتے ہیں۔ جب ایک شخص کسی شے کو ہاتھ سے تھپتھپاتا ہے تو اسے ایک خاص آواز سنائی دیتی ہے۔ وہ شخص اسی شے کو پانچ منٹ بعد تھپتھپائے گا تو ایک اور طرح کی آواز آئے گی۔

وہ شخص یہ سمجھتا ہے کہ پہلی آواز اور دوسری آواز کے درمیان ایک وقفہ ہے اور وہ اس وقفے کو ''زماں'' کا نام دیتا ہے۔ مگر جس وقت وہ دوسری آواز سنتا ہے تو پہلی آواز اس کے ذہن میں ایک

تصور کے طور پر موجود تھی۔ یہ اس کے حافظے میں ایک معلومات کا چھوٹا سا حصہ تھا۔ وہ شخص جس لمحے میں زندہ ہوتا ہے وہ اسے اپنے حافظے میں محفوظ یاد کے ساتھ موازنہ کر کے ''زماں'' کے ادراک کو تشکیل دیتا ہے۔ اگر وہ یہ موازنہ نہیں کرتا تو زماں کا ادراک نہیں ہوگا۔

اسی طرح ایک شخص اس وقت موازنہ کرتا ہے جب وہ کسی کو کمرے میں دروازے سے داخل ہوتے اور کمرے کے وسط میں کرسی پر بیٹھتے دیکھتا ہے۔ جس وقت یہ آدمی کرسی پر بیٹھتا ہے، جب وہ دروازہ کھول کر کمرے میں داخل ہوتا ہے اور کرسی تک چل کر جاتا ہے، تو ان لمحات سے متعلق خیالی تصویریں معلومات کے ایک حصے کے طور پر اس کے دماغ میں یکجا ہو جاتی ہیں۔ زماں کا ادراک اس وقت شروع ہوتا ہے جب یہ شخص کرسی پر بیٹھے ہوئے اس آدمی کا موازنہ اس معلومات کے چھوٹے سے حصے کے ساتھ کرتا ہے جو اس کے پاس ہے۔

مختصراً ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ زماں اس موازنے کے نتیجے میں وجود میں آتا ہے جو دماغ میں ذخیرہ شدہ کچھ سرابوں کے درمیان کیا جاتا ہے۔ اگر انسان کے پاس یادداشت نہ ہوتی تو پھر اس کے دماغ نے اس قسم کی تصریحات نہ کی ہوتیں اور یوں زماں کا ادراک کبھی نہ ہو سکتا تھا۔ ایک انسان یہ کیوں فیصلہ کر لیتا ہے کہ وہ تیس سال کا ہو گیا ہے، اس لئے کہ ان تیس برسوں سے متعلق معلومات اس کے ذہن میں جمع ہو جاتی ہیں۔ اگر اس کا حافظہ کام نہ کرتا تو وہ گزرے ہوئے اس وقت کی موجودگی کے بارے میں کبھی بھی نہ سوچتا اور وہ صرف اس ایک ''لمحے'' کے تجربے سے گزر رہا ہوتا جس میں وہ زندگی گزار رہا تھا۔

لازمانیت کی سائنسی توجیہہ

آیئے ہم اس موضوع کی وضاحت کے لئے مختلف سائنسدانوں اور سکالروں کے خیالات پیش کرتے ہیں۔ زماں کے موضوع پر اس حوالے سے کہ وہ پیچھے کی جانب بہتا ہے مشہور دانشور اور نوبل انعام یافتہ پروفیسر، شعبہ جینیات Francois Jacob اپنی کتاب "Le jeu des Possibles" (The Possible & the Actual) میں لکھتا ہے:

فلمیں پیچھے کی جانب چلتی تھیں، جس سے ہمیں ایک ایسی دنیا کا تصور ملا جس میں وقت پیچھے کی جانب بہتا ہے۔ ایک ایسی دنیا جس میں دودھ اپنے آپ کو کافی سے جدا کر لیتا ہے اور پیالی میں سے اچھل کر دودھ دان میں پہنچ جاتا ہے؛ ایک ایسی دنیا جس میں روشنی کی لہریں روشنی کے ماخذ

میں سے اچھل کر نکلنے کے بجائے دیواروں سے پھوٹ کر ایک مرکز ثقل میں جمع ہو جاتی ہیں؛ ایک ایسی دنیا جس میں ایک پتھر لڑھک کر ایک انسان کی ہتھیلی پر آ جاتا ہے اور ایسا کرنے میں پانی کے لاتعداد قطرے پتھر کی مدد کرتے ہیں کہ وہ اچھل کر پانی سے باہر آ جائے۔ مگر ایک ایسی دنیا جس میں پانی کی اس قدر متضاد صفات ہوں ہمارے دماغ کا عمل اور ہماری یادداشت جس طرح معلومات کو یکجا کرتی ہے اسی طرح سے وہ پچھلی جانب اپنا کام جاری رکھیں گے۔ یہی بات ماضی اور مستقبل کے بارے میں سچ ہے اور دنیا ہمیں بالکل ویسی ہی دکھائی دے گی جیسی یہ اس وقت نظر آ رہی ہے۔

ہمارا دماغ چونکہ واقعات کی ایک خاص ترتیب کا عادی ہوتا ہے اس لئے دنیا اس طرح کام نہیں کرتی جس طرح اوپر ذکر کیا گیا ہے۔ اور ہم یہ سمجھ بیٹھتے ہیں کہ وقت کا بہاؤ ہمیشہ آگے کی جانب ہوتا ہے۔ تاہم یہ ایک ایسا فیصلہ ہے جو دماغ کے اندر تشکیل پاتا ہے اور اسی لئے یہ مکمل طور پر اضافی ہوتا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ہم یہ کبھی بھی نہیں جان سکتے کہ وقت کس طرح بہتا ہے یا یہ کہ وقت بہتا بھی ہے یا نہیں۔ یہ اس حقیقت کی جانب اشارہ ہے کہ وقت ایک مطلق حقیقت نہیں بلکہ ایک قسم کا ادراک ہے۔

اضافیت زماں ایک ایسی حقیقت ہے جس کی تصدیق ۲۰ ویں صدی کے ایک بہت بڑے طبیعات دان البرٹ آئن سٹائن نے کی ہے۔ لنکن بارنٹ اپنی کتاب ''کائنات اور ڈاکٹر آئن سٹائن'' (The Universe & Dr. Einstein) میں لکھتا ہے:

مطلق مکاں کے ساتھ ساتھ آئن سٹائن نے مطلق زماں کے تصور کو بھی مسترد کیا تھا۔ اسے اس بات سے انکار تھا کہ کائنات کا غیر متغیر بے رحم وقت لامحدود ماضی سے بہہ کر لامحدود مستقبل کی طرف جارہا ہے۔ زیادہ تر ابہام جو نظریہ اضافیت کو گھیرے ہوئے ہے انسان کی اس ہچکچاہٹ سے پیدا ہوتا ہے جو رنگ کے احساس کی طرح وقت کے احساس کو تسلیم کرنے سے متعلق ہوتی ہے، جو ادراک کی ایک شکل ہے۔ جس طرح مکاں (Space) مادی اشیاء کی ممکنہ ترتیب کا نام ہے اسی طرح زماں (Time) واقعات کی ممکنہ ترتیب کو کہا جاتا ہے۔ زماں کی موضوعیت کو آئن سٹائن کے اپنے الفاظ میں بہترین طور پر بیان کیا گیا ہے۔ وہ کہتا ہے: ''ایک فرد کے تجربات واقعات کی ممکنہ ترتیب کی صورت میں ہمارے سامنے آتے ہیں۔ ان سلسلہ وار واقعات میں سے ہم ان واقعات کو یاد رکھتے ہیں جو ''پہلے'' اور ''بعد'' کی ترتیب کے لحاظ سے ظاہر ہوتے ہیں۔ ایک فرد کے لئے ایک ''میں زماں'' (I-Time) یا موضوعی زماں ہوتا ہے۔ یہ بذات خود قابل پیمائش نہیں ہے۔ میں

تعداد کو واقعات کے ساتھ وابستہ کر سکتا ہوں وہ اس طرح کہ بڑے ہندسے کو بعد کے واقعہ کے ساتھ بجائے شروع کے واقعہ کے منسوب کیا جائے۔

آئن سٹائن نے خود اس طرف اشارہ کیا، جیسا کہ Barnette کی کتاب کے اس اقتباس سے پتہ چلتا ہے: ''مکان و زماں وجدان اور ادراک کی شکلیں ہیں جن کو اسی طرح شعور و آگاہی سے علیحدہ نہیں کیا جا سکتا جس طرح ہمارے رنگ، شکل یا جسامت کے ہمارے قیاسات و ادراک کو۔ نظریۂ عمومی اضافیت کے مطابق: ''واقعات کی ترتیب سے ہٹ کر زماں کا کوئی آزاد وجود نہیں ہے جس سے ہم اس کی پیمائش کرتے ہیں''۔

زماں چونکہ قیاسات اور ادراک پر مشتمل ہوتا ہے اس لئے یہ مکمل طور پر مدرک (Perceiver) پر منحصر ہے اور اس لئے یہ اضافی ہے۔

وہ رفتار جس کے ساتھ وقت بہتا ہے وہ جن حوالوں کو ہم استعمال کرتے ہیں ان کے مطابق مختلف ہے اس لئے کہ انسانی جسم کے اندر کوئی ایسی قدرتی گھڑی نہیں ہے جو صحیح صحیح یہ بتا سکے کہ وقت کس قدر تیزی سے گزر رہا ہے۔ جیسا کہ لنکن بارنٹ نے لکھا:

''جس طرح آنکھ کے بغیر رنگ کچھ بھی نہیں، جو اسے دیکھتی ہے، اسی طرح ایک لمحہ یا ایک گھنٹہ یا ایک روز اس وقت تک کچھ بھی نہیں جب تک ایک واقعہ ان کی نشاندہی کرنے کے لئے نہ ہو''۔

اضافیت زماں کا صحیح صحیح تجربہ خوابوں میں ہوتا ہے۔ حالانکہ خواب میں ہم جو کچھ دیکھتے ہیں لگتا ہے وہ کئی گھنٹوں پر محیط ہوتا ہے لیکن دراصل یہ چند منٹوں کی بات ہوتی ہے۔ اور کبھی کبھی یہ خواب چند سیکنڈوں پر مشتمل ہوتے ہیں۔

آیئے اس موضوع کی مزید وضاحت کے لئے ایک مثال پر نظر دوڑاتے ہیں۔

ہم یہ فرض کر لیتے ہیں کہ ہمیں ایک ایسے کمرے میں بند کر دیا گیا ہے جس میں صرف ایک کھڑکی ہے، جسے ایک خاص ڈیزائن میں بنایا گیا ہے۔ ہمیں اس کمرے میں ایک خاص عرصے تک رہنا ہے۔ وقت کا اندازہ لگانے کے لئے اس کمرے میں ایک گھڑی بھی رکھ دی گئی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ہم وقتاً فوقتاً کھڑکی میں سے طلوع و غروب آفتاب بھی دیکھ سکتے ہیں۔ چند روز بعد جب ہم سے یہ پوچھا گیا کہ ہم نے اس کمرے میں کتنا وقت گزارا تو ہم اپنا جواب گھڑی سے حاصل کردہ معلومات اور طلوع و غروب آفتاب کی گنتی کی مدد سے تیار کریں گے۔ مثال کے طور پر ہمارا

اندازہ یہ ہوگا کہ ہم نے اس کمرے میں تین روز گزارے ہیں۔ مگر وہ شخص جس نے ہمیں اس کمرے میں بند کیا تھا آ کر یہ بتاتا ہے کہ ہم وہاں صرف دو روز تک رہے اور جو سورج ہم کھڑکی سے طلوع وغروب ہوتے دیکھتے رہے وہ تو جھوٹ موٹ ایک مشین کے ذریعے نکلتا ڈوبتا دکھایا گیا تھا۔ اور کمرے میں رکھی ہوئی گھڑی کو تیز کر دیا گیا تھا یوں وقت کا جو حساب ہم نے لگایا وہ بے معنی ہو گیا تھا۔

اس مثال سے تصدیق ہو جاتی ہے کہ وقت کے گزرنے کی شرح کا انحصار اضافی حوالوں پر تھا۔ اضافیت زماں ایک سائنسی حقیقت ہے جسے سائنسی اصولیات بھی ثابت کر چکا ہے۔ آئن سٹائن کا نظریۂ عمومی اضافیت بتاتا ہے کہ وقت کی رفتار کسی شے کی اپنی رفتار اور مرکز ثقل سے اس کے فاصلے کے مطابق بدل جاتی ہے۔ جوں جوں رفتار بڑھتی ہے وقت مختصر ہوتا جاتا ہے اور سمٹتا جاتا ہے۔ پھر وہ سست پڑ جاتا ہے جیسے ''تھم جانے'' پر آ گیا ہو۔

آیئے اس کی وضاحت آئن سٹائن ہی کی ایک مثال کے ذریعے کرتے ہیں۔ دو جڑواں بھائیوں کا تصور کیجئے جن میں سے ایک زمین پر رہتا ہے جبکہ دوسرا روشنی کی رفتار کے برابر رفتار کے ساتھ خلاء میں سفر کرتا ہے۔ وہ جب خلاء سے واپس زمین پر پہنچتا ہے تو دیکھتا ہے کہ اس کا بھائی (جو زمین پر تھا) اس سے زیادہ بڑا ہو گیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جو شخص روشنی کی رفتار کے ساتھ خلاء میں سفر کرتا ہے وہاں وقت بہت سست رفتاری کے ساتھ گزرتا ہے۔ اگر یہی مثال ایک خلاء میں سفر کرنے والے باپ اور اس کے زمین پر رہنے والے بیٹے کے بارے میں دی جائے، تو باپ سفر پر جاتے وقت اگر ۲۷ برس کا تھا اور بیٹا ۳ سال کا تو باپ جب واپس زمین پر آتا ہے تو ۳۰ سال بعد (زمینی وقت کے مطابق) بیٹا ۳۳ برس کا ہوگا مگر باپ صرف تین برس کا۔

ہم اس بات کو واضح کر دیں کہ یہ اضافیت زماں گھڑی کی رفتار کی تیزی یا سستی کی وجہ سے پیدا نہیں ہوئی نہ ہی یہ کسی مکینیکل سپرنگ کے کم رفتار کے ساتھ چلنے کی وجہ سے ایسا ہوا ہے۔ بلکہ یہ تو پورے مادی نظام کی کارکردگی کے مختلف دورانیے کے نتیجے میں ہوا ہے جو اس قدر گہرائی تک چلا جاتا ہے جس قدر ذیلی جوہری ذرّے جاتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں وقت کا مختصر ہونا اس طرح نہیں جیسے کم حرکت پر چلنے والی وہ فلم جسے کوئی شخص دیکھ رہا ہو۔ ایسی ترکیب کے دوران جس میں وقت مختصر ہو جاتا ہے، دل دھڑکنے لگتا ہے، خلیوں کی گونج سنائی دیتی ہے، دماغ کام کرنے لگتا ہے وغیرہ وغیرہ۔ یہ سب زمین پر سست رفتاری سے چلنے والے انسان سے کہیں زیادہ سست رفتاری

سے چلتے ہیں۔ ایک شخص روزمرہ زندگی کے معمولات جاری رکھتا ہے اور اسے وقت کے مختصر ہو جانے کا قطعاً احساس نہیں ہوتا۔ وقت کے اختصار کا پتہ ہی نہیں چلتا جب تک موازنہ نہ کیا جائے۔

قرآن اور نظریۂ اضافیت

جدید سائنسی دریافتوں سے ہم جس نتیجے پر پہنچتے ہیں وہ یہ ہے کہ وقت ایک مطلق حقیقت نہیں ہے جیسا کہ مادہ پرست سمجھتے ہیں بلکہ یہ ایک اضافی ادراک ہے۔ زیادہ دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ حقیقت سائنس نے بیسویں صدی میں دریافت کی لیکن قرآن نے چودہ صدیاں قبل اسے بنی نوعِ انسان تک پہنچا دیا تھا۔ اضافیت زماں کے بارے میں قرآن پاک میں کئی حوالے موجود ہیں۔

یہ ممکن ہے کہ ہم اس سائنسی ثبوت والی حقیقت کو دیکھ سکیں کہ وقت ایک ایسا نفسیاتی ادراک ہے جس کا انحصار واقعات، ترکیب اور حالات پر ہے۔ اس کا ذکر قرآن حکیم کی بہت سی سورتوں میں آیا ہے۔ مثال کے طور پر قرآن بتاتا ہے کہ انسان کی ساری زندگی بے حد مختصر ہے:

يَوْمَ يَدْعُوكُمْ فَتَسْتَجِيبُونَ بِحَمْدِهِ وَتَظُنُّونَ إِنْ لَبِثْتُمْ إِلَّا قَلِيلًا ۝

''جس روز وہ تمہیں پکارے گا تو تم اس کی حمد کرتے ہوئے اس کی پکار کے جواب میں نکل آؤ گے اور تمہارا گمان اس وقت یہ ہوگا کہ ہم بس تھوڑی دیر ہی اس حالت میں پڑے رہے ہیں''۔ (سورۃ بنی اسرائیل:۵۲)

وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ كَأَنْ لَمْ يَلْبَثُوا إِلَّا سَاعَةً مِنَ النَّهَارِ يَتَعَارَفُونَ بَيْنَهُمْ ط

'' (آج یہ دنیا کی زندگی میں مست ہیں) اور جس روز اللہ ان کو اکٹھا کرے گا تو (یہی دنیا کی زندگی انہیں ایسی محسوس ہوگی) گویا یہ محض ایک گھڑی بھر آپس میں جان پہچان کرنے کو ٹھہرے تھے''۔ (سورۃ یونس:۴۵)

چند قرآنی سورتوں میں اس بات کا اظہار کیا گیا ہے کہ لوگ وقت کا ادراک مختلف طریقے سے کرتے ہیں اور کبھی کبھار تو وہ ایک مختصر سے وقت کو بڑا طویل سمجھ بیٹھتے ہیں۔ ذیل کی گفتگو جو یوم حشر لوگوں کے ساتھ ہوئی وہ اس کی ایک اچھی مثال ہے:

قٰلَ كَمْ لَبِثْتُمْ فِي الْأَرْضِ عَدَدَ سِنِينَ ۝ قٰلَ إِنْ لَبِثْتُمْ إِلَّا قَلِيلًا لَوْ أَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ ۝ أَفَحَسِبْتُمْ أَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا وَأَنَّكُمْ إِلَيْنَا لَا تُرْجَعُونَ ۝

''پھر اللہ تعالیٰ ان سے پوچھے گا، بتاؤ زمین میں تم کتنے سال رہے؟ وہ کہیں گے: ''ایک دن یا دن کا بھی کچھ حصہ ہم وہاں ٹھہرے ہیں، شمار کرنے والوں سے پوچھ لیجئے''۔ ارشاد ہوگا: ''تھوڑی ہی دیر ٹھہرے ہونا، کاش تم نے یہ اس وقت جانا ہوتا''۔ (سورۃ المومنون: ۱۱۴-۱۱۲)

چند دوسری آیات میں بتایا گیا ہے کہ وقت مختلف حالات میں مختلف رفتار سے بہے گا:

وَيَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالْعَذَابِ وَلَنْ يُّخْلِفَ اللّٰهُ وَعْدَهٗ ط وَاِنَّ يَوْمًا عِنْدَ رَبِّكَ كَاَلْفِ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ۔

''یہ لوگ عذاب کے لئے جلدی مچا رہے ہیں، اللہ ہرگز اپنے وعدے کے خلاف نہ کرے گا۔ مگر تیرے رب کے ہاں کا ایک دن تمہارے شمار کے ہزار برس کے برابر ہوا کرتا ہے''۔ (سورۃ الحج: ۴۷)

تَعْرُجُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوْحُ اِلَيْهِ فِيْ يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗ خَمْسِيْنَ اَلْفَ سَنَةٍ۔

''ملائکہ اور روح اس کے حضور چڑھ کر جاتے ہیں ایک ایسے دن میں جس کی مقدار پچاس ہزار سال ہے''۔ (سورۃ المعارج: ۴)

یہ تمام سورتیں اضافیت زماں کی تشریح کرتی ہیں۔ سائنس اس حقیقت کو بیسویں صدی میں سمجھ سکی جبکہ اللہ نے اسے ۱۴۰۰ سال قبل قرآن پاک میں بتا دیا تھا۔ یہ ثبوت ہے اس بات کا کہ قرآن اللہ نے نازل فرمایا اور وہی ذاتِ باری تعالیٰ زمان و مکان پر محیط ہے۔

قرآن پاک کی بہت سی دوسری سورتوں میں بتایا گیا ہے کہ زماں ایک ادراک ہے یہ بطور خاص قصص میں عیاں ہے۔ مثال کے طور پر اللہ نے اصحاب کہف کو غار کے اندر محفوظ رکھا، یہ ان ایمان والوں کا گروہ تھا جو قرآن کے مطابق ۳۰۰ سال سے زائد عرصے تک گہری نیند میں رہے۔ جب انہیں بیدار کیا گیا تو وہ سمجھے تھوڑی ہی دیر کے لئے سوئے تھے۔ وہ یہ اندازہ ہی نہ لگا سکے کہ وہ کتنے عرصے تک سوئے رہے تھے:

فَضَرَبْنَا عَلٰٓى اٰذَانِهِمْ فِي الْكَهْفِ سِنِيْنَ عَدَدًاo ثُمَّ بَعَثْنٰهُمْ لِنَعْلَمَ اَيُّ الْحِزْبَيْنِ اَحْصٰى لِمَا لَبِثُوْٓا اَمَدًاo

''تو ہم نے انہیں اسی غار میں تھپک کر سالہا سال کے لئے گہری نیند سلا دیا تھا پھر ہم نے انہیں اٹھایا تاکہ دیکھیں ان کے دو گروہوں میں سے کون اپنی مدت قیام کا ٹھیک شمار کرتا ہے''۔ (سورۃ الکہف: ۱۲-۱۱)

وَكَذٰلِكَ بَعَثْنٰهُمْ لِيَتَسَآءَلُوْا بَيْنَهُمْ ط قَالَ قَآئِلٌ مِّنْهُمْ كَمْ لَبِثْتُمْ ط قَالُوْا لَبِثْنَا يَوْمًا اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ ط قَالُوْا رَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَا لَبِثْتُمْ ط

''اور اسی عجیب کرشمے سے ہم نے انہیں اٹھا بٹھایا تا کہ ذرا آپس میں پوچھ گوچھ کریں، ان میں سے ایک نے پوچھا: ''کہو کتنی دیر اس حال میں رہے؟'' دوسروں نے کہا: ''شاید دن بھر یا اس سے کچھ کم رہے ہوں گے''۔ پھر وہ بولے: ''اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ ہمارا کتنا وقت اس حالت میں گزرا''۔ (سورۃ الکہف: ۱۹)

درج ذیل سورۃ میں جو صورت حال بتائی گئی ہے وہ بھی اس بات کا ثبوت ہے کہ وقت ایک نفسیاتی ادراک ہے۔

اَوْ كَالَّذِيْ مَرَّ عَلٰى قَرْيَةٍ وَّهِيَ خَاوِيَةٌ عَلٰى عُرُوْشِهَا ج قَالَ اَنّٰى يُحْيِ هٰذِهِ اللّٰهُ بَعْدَ مَوْتِهَا ج فَاَمَاتَهُ اللّٰهُ مِائَةَ عَامٍ ثُمَّ بَعَثَهٗ ط قَالَ كَمْ لَبِثْتَ ط قَالَ لَبِثْتُ يَوْمًا اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ ط قَالَ بَلْ لَّبِثْتَ مِائَةَ عَامٍ فَانْظُرْ اِلٰى طَعَامِكَ وَشَرَابِكَ لَمْ يَتَسَنَّهْ ج وَانْظُرْ اِلٰى حِمَارِكَ وَلِنَجْعَلَكَ اٰيَةً لِّلنَّاسِ وَانْظُرْ اِلَى الْعِظَامِ كَيْفَ نُنْشِزُهَا ثُمَّ نَكْسُوْهَا لَحْمًا ط فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهٗ قَالَ اَعْلَمُ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ○

''یا پھر مثال کے طور پر اس شخص کو دیکھو جس کا گزر ایک ایسی بستی پر ہوا جو اپنی چھتوں پر اوندھی گری پڑی تھی۔ اس نے کہا: ''یہ آبادی جو ہلاک ہو چکی ہے اسے اللہ کس طرح دوبارہ زندگی بخشے گا؟'' اس پر اللہ نے اس کی روح قبض کر لی اور وہ سو برس تک مردہ پڑا رہا۔ پھر اللہ نے اس کو دوبارہ زندگی بخشی اور اس سے پوچھا: ''بتاؤ کتنی مدت پڑے رہے ہو؟'' اس نے کہا: ''ایک دن یا چند گھنٹے رہا ہوں گا''۔ فرمایا: ''تم پر سو برس اسی حالت میں گزر چکے ہیں۔ اب ذرا اپنے کھانے اور پانی کو دیکھو کہ اس میں ذرا تغیر نہیں آیا ہے۔ دوسری طرف ذرا اپنے گدھے کو بھی دیکھو (کہ اس کا پنجر تک بوسیدہ ہو رہا ہے) اور یہ ہم نے اس لئے کیا ہے کہ ہم تمہیں لوگوں کے لئے ایک نشانی بنا دینا چاہتے ہیں۔ پھر دیکھو کہ ہڈیوں کے اس پنجر کو ہم کس طرح اٹھا کر گوشت پوست اس پر چڑھاتے ہیں''۔ اس طرح جب حقیقت اس کے سامنے بالکل نمایاں ہو گئی تو اس نے کہا: ''میں جانتا ہوں کہ اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے''۔ (سورۃ البقرۃ: ۲۵۹)

درج بالا آیت اس بات پر صاف صاف زور دیتی ہے کہ اللہ جس نے وقت تخلیق کیا، اس

نے اسے حدود کا پابند نہیں رکھا۔ دوسری طرف انسان وقت کا پابند بنا دیا جاتا ہے اور ایسا اللہ کے حکم سے ہوتا ہے۔ جیسا کہ اس آیت میں ذکر ہے۔ انسان تو یہ بھی نہیں جانتا کہ وہ کتنی دیر نیند میں رہا۔ اس صورت حال میں یہ دعویٰ کرنا کہ وقت مطلق ہے (جیسا کہ مادہ پرست اپنی پراگندہ ذہنیت کے ساتھ کرتے ہیں) یہ نہایت غیر منطقی بات ہوگی۔

تقدیر

اضافیت زماں ایک نہایت اہم مسئلے کو واضح کر دیتی ہے۔ یہ اضافیت اتنی متنوع ہوتی ہے کہ ایک عرصہ وقت جو ہمیں کئی بلین برسوں پر مشتمل نظر آتا ہے ایک اور جہت میں ایک واحد سیکنڈ میں گزر جاتا ہے۔ مزید یہ کہ ایک وسیع وقت جو ابتدائے کائنات سے لے کر اس کے اختتام تک پھیلا ہوا ہے ایک دوسری جہت میں ممکن ہے یہ ایک سیکنڈ بلکہ ایک لمحے سے زیادہ نہ ہو۔

یہ نظریہ تقدیر کا نچوڑ ہے۔ جو ایک ایسا نظریہ ہے جسے بہت سے لوگ سمجھتے نہیں ہیں، خصوصاً وہ مادہ پرست جو اس سے مکمل انکار کرتے ہیں۔ تقدیر ماضی و مستقبل کے تمام واقعات کا مکمل علم ہے جسے اللہ کی ذات جانتی ہے۔ لوگوں کی اکثریت یہ سوال کرتی ہے کہ جو واقعات ابھی پیش ہی نہیں آئے اللہ انہیں پہلے سے کیسے جان سکتا ہے اور یہ انہیں تقدیر کے استناد کو سمجھنے میں ناکام بنا دیتا ہے۔ تاہم وہ واقعات ''جو ابھی وقوع پذیر نہیں ہوئے'' وہ صرف ہمارے لئے وقوع پذیر نہیں ہوئے۔ اللہ زمان و مکاں کا پابند نہیں ہے کیونکہ اس نے تو انہیں خود تخلیق کیا ہے اسی وجہ سے ماضی، مستقبل اور حال تمام اللہ کے لئے یکساں ہیں اس کے لئے ہر بات ہو چکی اور ختم ہو گئی ہے۔

لنکن بارنٹ اپنی کتاب ''کائنات اور ڈاکٹر آئن سٹائن'' میں اس بات کی وضاحت کرتا ہے کہ نظریہ عمومی اضافیت کیسے اس حقیقت تک پہنچ جاتا ہے: بارنٹ کے خیال میں اس کائنات کا ''پوری شان و شوکت سے صرف ایک وسیع ذہانت کے ساتھ احاطہ کیا جا سکتا ہے'' وہ مرضی و ارادہ جسے بارنٹ نے ''وسیع ذہانت اور عقل و دانش'' کا نام دیا ہے وہ اللہ کی دانائی اور علم ہے وہ ذات جو پوری کائنات پر محیط ہے۔ جس طرح ہم ایک حکمران کی حکومت کے آغاز، وسطی زمانے اور اختتام کو آسانی کے ساتھ دیکھ سکتے ہیں اور ان کی درمیانی اکائیوں کو بھی مجموعی طور ہم دیکھتے ہیں اللہ اس وقت کو آغاز سے انتہا تک ایک واحد لمحے کی مانند جانتا ہے، جس کے ہم زندانی ہیں۔ لوگوں کو مختلف واقعات اپنے اپنے وقت پر پیش آتے ہیں اور اس وقت وہ اس تقدیر کو دیکھتے ہیں جو اللہ نے ان

کے لئے تخلیق کر دی ہے۔

معاشرے میں تقدیر کو سمجھنے کا جو مسخ شدہ تصوّر اپنی بہت محدود سی حقیقت کے ساتھ پایا جاتا ہے اس جانب لوگوں کی توجہ مبذول کرانے کی بڑی ضرورت ہے۔ تقدیر کا یہ مسخ شدہ عقیدہ اس توہم پرستانہ عقیدے پر مشتمل ہے کہ اللہ نے ہر انسان کی ''تقدیر'' کا فیصلہ کر رکھا ہے مگر بعض اوقات لوگ ان کی تقدیر بدل بھی سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر وہ مریض جو موت کے منہ سے واپس آتا ہے اس کے بارے میں لوگ اس طرح کے سطحی بیانات دینا شروع کر دیتے ہیں ''اس نے تقدیر کو شکست دے دی ہے''۔ تاہم کوئی بھی اس کی تقدیر بدلنے کی اہلیت نہیں رکھتا۔ وہ انسان جو موت کے منہ سے واپس آ گیا وہ صرف اس وجہ سے نہیں مرا کیونکہ اس وقت ابھی اس کی موت کا لمحہ نہیں آیا تھا۔ یہ بھی ان لوگوں کی تقدیر ہوتی ہے جو اپنے آپ کو یہ کہہ کر دھوکہ دیتے ہیں: ''میں نے اپنی تقدیر کو شکست دی ہے'' ایسا کہنا ان کا مقدر ہوتا ہے اور ایسا ذہن رکھنا بھی ان کا مقدر ہوتا ہے۔

تقدیر اللہ کا ازلی وابدی علم ہے اور یہ اللہ کے لئے ہے جو وقت کو ایک واحد ثانیے کی مانند جانتا ہے، جو تمام زمان و مکاں پر حاوی ہے، ہر شے کا فیصلہ کر دیا گیا اور اسے تقدیر میں رکھ دیا گیا۔ ہم یہ بھی سمجھتے ہیں کہ قرآن پاک میں جہاں یہ مذکور ہے کہ وقت اللہ کے لئے ایک ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ مستقبل میں ہمارے ساتھ جو واقعات پیش آنے والے ہیں ان کا ذکر قرآن پاک میں اس طرح کیا گیا ہے جیسے وہ وقوع پذیر ہو چکے ہیں۔ مثال کے طور پر جہاں روز قیامت لوگوں کے اللہ کو حساب دینے کا ذکر ہے وہاں ان باتوں کو اس طرح بیان کیا گیا ہے جیسے یہ مدت ہوئی انہیں پیش آ چکی ہیں:

وَنُفِخَ فِی الصُّوْرِ فَصَعِقَ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِی الْاَرْضِ اِلَّا مَنْ شَآءَ اللّٰهُ ط ثُمَّ نُفِخَ فِیْهِ اُخْرٰی فَاِذَا هُمْ قِیَامٌ یَّنْظُرُوْنَ○ وَاَشْرَقَتِ الْاَرْضُ بِنُوْرِ رَبِّهَا وَوُضِعَ الْكِتٰبُ وَجِایْٓءَ بِالنَّبِیّٖنَ وَالشُّهَدَآءِ وَقُضِیَ بَیْنَهُمْ بِالْحَقِّ وَهُمْ لَا یُظْلَمُوْنَ○ وَوُفِّیَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ وَهُوَ اَعْلَمُ بِمَا یَفْعَلُوْنَ○ وَسِیْقَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْٓا اِلٰی جَهَنَّمَ زُمَرًا ط حَتّٰٓی اِذَا جَآءُوْهَا فُتِحَتْ اَبْوَابُهَا وَقَالَ لَهُمْ خَزَنَتُهَآ اَلَمْ یَاْتِكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ یَتْلُوْنَ عَلَیْكُمْ اٰیٰتِ رَبِّكُمْ وَیُنْذِرُوْنَكُمْ لِقَآءَ یَوْمِكُمْ هٰذَا ط قَالُوْا بَلٰی وَلٰكِنْ حَقَّتْ كَلِمَةُ الْعَذَابِ عَلَی الْكٰفِرِیْنَ○ قِیْلَ ادْخُلُوْٓا

اَبْوَابَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَاۚ فَبِئْسَ مَثْوَى الْمُتَكَبِّرِيْنَ۝

''اور اس روز صور پھونکا جائے گا اور وہ سب مر کر گر جائیں گے جو آسمانوں اور زمین میں ہیں سوائے ان کے جنہیں اللہ زندہ رکھنا چاہے۔ پھر ایک دوسرا صور پھونکا جائے گا اور یکا یک سب کے سب اٹھ کر دیکھنے لگیں گے۔ زمین اپنے رب کے نور سے چمک اٹھے گی۔ کتاب اعمال لاکر رکھ دی جائے گی انبیاء اور تمام گواہ حاضر کر دیئے جائیں گے۔ لوگوں کے درمیان ٹھیک ٹھیک حق کے ساتھ فیصلہ کر دیا جائے گا۔ ان پر کوئی ظلم نہ ہوگا اور ہر متنفس کو جو کچھ بھی اس نے عمل کیا تھا اس کا پورا پورا بدلہ دے دیا جائے گا۔ لوگ جو کچھ بھی کرتے ہیں اللہ اس کو خوب جانتا ہے۔ (اس فیصلہ کے بعد) وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا تھا، جہنم کی طرف گروہ در گروہ ہانکے جائیں گے''۔ (سورۃ الزمر:۷۲-۶۸)

اس موضوع پر قرآن پاک میں کچھ اور آیات بھی ہیں:

وَجَآءَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّعَهَا سَآئِقٌ وَّشَهِيْدٌ۝

''ہر شخص اس حال میں آگیا کہ اس کے ساتھ ایک ہانک کر لانے والا ہے اور ایک گواہی دینے والا''۔ (سورۃ ق:۲۱)

وَانْشَقَّتِ السَّمَآءُ فَهِيَ يَوْمَئِذٍ وَّاهِيَةٌ۝

''اس دن آسمان پھٹے گا اور اس کی بندش ڈھیلی پڑ جائے گی''۔ (سورۃ الحاقۃ:۱۶)

وَبُرِّزَتِ الْجَحِيْمُ لِمَنْ يَّرٰى۝

''اور ہر دیکھنے والے کے سامنے دوزخ کھول کر رکھ دی جائے گی''۔ (سورۃ النّٰزعٰت:۳۶)

فَالْيَوْمَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنَ الْكُفَّارِ يَضْحَكُوْنَ۝

''آج ایمان لانے والے کفار پر ہنس رہے ہیں''۔ (سورۃ المطففین:۳۴)

وَرَاَ الْمُجْرِمُوْنَ النَّارَ فَظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ مُّوَاقِعُوْهَا وَلَمْ يَجِدُوْا عَنْهَا مَصْرِفًا۝

''سارے مجرم اس روز آگ دیکھیں گے اور سمجھ لیں گے کہ اب انہیں اس میں گرنا ہے اور وہ اس سے بچنے کے لئے کوئی جائے پناہ نہ پائیں گے''۔ (سورۃ الکہف:۵۳)

جیسا کہ ہم دیکھ سکتے ہیں کہ ایسے واقعات جو ہماری موت (ہمارے نقطۂ نظر سے) کے بعد پیش آنے والے ہیں انہیں قرآن پاک میں اس طرح بیان فرمایا گیا ہے جیسے وہ پیش آ چکے

ہوں اور ان کا تعلق ماضی سے ہو۔ اللہ تعالیٰ وقت کی اس اضافیت کے دائرہ کا پابند نہیں ہے جس میں ہم پابند ہیں۔ اللہ نے ان چیزوں کا ارادہ لازمانیت میں فرمایا ہے: لوگ پہلے ہی انہیں سرانجام دے چکے ہیں اور یہ تمام واقعات وقوع پذیر ہو کر اختتام کو پہنچ چکے ہیں۔ ذیل کی سورۃ میں بتایا گیا ہے کہ ہر واقعہ خواہ بڑا ہو یا چھوٹا اللہ کے علم میں ہے اور اس کا اندراج ایک کتاب میں ہو چکا ہے:

وَمَا تَكُونُ فِي شَأْنٍ وَّمَا تَتْلُوا مِنْهُ مِنْ قُرْآنٍ وَّلَا تَعْمَلُونَ مِنْ عَمَلٍ إِلَّا كُنَّا عَلَيْكُمْ شُهُودًا إِذْ تُفِيضُونَ فِيهِ ؕ وَمَا يَعْزُبُ عَنْ رَّبِّكَ مِنْ مِّثْقَالِ ذَرَّةٍ فِي الْأَرْضِ وَلَا فِي السَّمَاءِ وَلَا أَصْغَرَ مِنْ ذَٰلِكَ وَلَا أَكْبَرَ إِلَّا فِي كِتَابٍ مُّبِينٍ ۝

''اے نبی تم جس حال میں بھی ہوتے ہو اور قرآن میں سے جو کچھ بھی سناتے ہو اور لوگو تم بھی جو کچھ کرتے ہو اس سب کے دوران ہم تم کو دیکھتے رہتے ہیں۔ کوئی ذرہ برابر چیز آسمان اور زمین میں ایسی نہیں ہے نہ چھوٹی نہ بڑی جو تیرے رب کی نظر سے پوشیدہ ہو اور ایک صاف دفتر میں درج نہ ہو''۔ (سورۃ یونس:۶۱)

مادہ پرستوں کی پریشانی

جن باتوں پر اس باب میں بحث کی گئی ان میں وہ سچائی جس پر مادے کی بنیاد ہے لازمانیت اور لامکانیت نہایت واضح اور صاف وشفاف طور پر بیان کئے گئے ہیں۔ جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا کوئی ایسا فلسفہ یا طرز فکر نہیں ہے جو واضح وعیاں سچائیوں کی شکل میں موجود نہ ہو، جسے مسترد کرنا ناممکن ہے اس کے ایک فنی حقیقت ہونے کے ساتھ ساتھ معقول اور منطقی ثبوت بھی اس مسئلے پر دیگر متبادلات کو تسلیم نہیں کرتا: یہ کائنات اس تمام مادے سمیت جو اسے تشکیل دے رہا ہے اور ان لوگوں سمیت جو اس میں بستے ہیں ایک خیالی وجود رکھتی ہے۔ یہ ادراکات کا مجموعہ ہے۔

مادہ پرستوں کے لئے اس مسئلے کو سمجھنا بڑا مشکل ہو گیا ہے۔ مثال کے طور پر اگر ہم پولائزر کی بس والی مثال کی طرف رخ کرتے ہیں: حالانکہ وہ فنی طور پر جانتا تھا کہ وہ اپنے قیاسات سے باہر قدم نہ رکھ سکتا تھا اسے تو مختلف وجوہ کی بنا پر اسے تسلیم کرنا ہی تھا۔ یعنی یہ کہ پولائزر کے خیال میں واقعات اس وقت تک دماغ میں وقوع پذیر ہوتے ہیں جب تک بس کا تصادم نہیں ہو جاتا مگر جونہی تصادم ہو جاتا ہے چیزیں دماغ میں سے نکل جاتی ہیں اور ایک طبعی حقیقت کا روپ دھار لیتی ہیں۔ اس مقام پر منطقی نقص یہ رہ جاتا ہے: پولائزر نے بھی وہی غلطی کی ہے جو مادہ پرست فلسفی جانسن سے سرزد ہوئی جس نے کہا کہ

''میں پتھر کو ٹھوکر مارتا ہوں، میرے پاؤں کو چوٹ لگتی ہے اس لئے یہ وجود رکھتا ہے''۔ وہ یہ نہ سمجھ سکا تھا کہ بس کے حادثے کے بعد جو دھچکا محسوس کیا گیا وہ دراصل ایک ادراک بھی تھا۔

مادہ پرست اس موضوع کو کیوں نہیں سمجھ سکتے اس کا تحت الشعوری سبب یہ ہے کہ وہ اس بات سے خائف ہوتے ہیں کہ یہ حقیقت انہیں خوفزدہ کر دے گی جب ان کی سمجھ میں آجائے گی۔ لنکن بارنٹ مطلع کرتا ہے کہ کچھ سائنسدانوں نے اس موضوع کو سمجھ لیا تھا:

''فلسفیوں نے جب تمام معروضی حقیقت کو کم کر کے قیاسات وادراکات کی ایک ظلّی دنیا تک محدود کر دیا تو سائنسدان انسانی حواس کی چونکا دینے والی حدود سے باخبر ہو گئے تھے۔''

کوئی بھی حوالہ جو اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہو کہ مادہ اور وقت ایک ایسا ادراک ہے جو ایک مادہ پرست میں خوف اور ڈر پیدا کر دیتا ہے کیونکہ یہی وہ واحد خیال ہے جو اس کے ذہن میں بطور مطلق چیزوں کے آتا ہے۔ ایک لحاظ سے وہ انہیں بتوں کے طور پر تصور کرتا ہے جن کی پرستش کی جانی چاہئے؛ ایسا وہ اس لئے کرتا ہے کیونکہ اس کے خیال میں اسے مادے اور وقت سے (بذریعہ اِرتقاء) تخلیق کیا گیا ہے۔

جب وہ یہ محسوس کرتا ہے کہ جس کائنات میں وہ زندگی گزار رہا ہے وُہ، یہ دنیا، اس کا اپنا جسم، دوسرے لوگ، دیگر مادہ پرست فلسفی جن کے نظریات نے اسے متاثر کیا ہے اور مختصراً یہ کہ ہر شے ایک ادراک ہے تو اس پر ان سب کی دہشت طاری ہو جاتی ہے۔ ہر وہ شے جس پر وہ انحصار کرتا ہے جس میں وہ یقین رکھتا ہے، اور جس میں وہ پناہ لیتا ہے یا جس کی طرف وہ رجوع کرتا ہے اچانک غائب ہو جاتی ہے۔ اسے مایوسی ہوتی ہے جو وہ لازمی طور پر یوم حساب محسوس کرے گا جس کا ذکر اس آیت میں یوں کیا گیا ہے:

وَاَلْقَوْا اِلَى اللّٰهِ يَوْمَئِذِ نِ السَّلَمَ وَضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ٥

''اس وقت یہ سب اللہ کے آگے جھک جائیں گے اور ان کی وہ ساری افترا پردازیاں رفو چکر ہو جائیں گی جو یہ دنیا میں کرتے رہے تھے''۔ (سورۃ النحل: ۸۷)

اس کے بعد یہ مادہ پرست مادے کی حقیقت کے بارے میں اپنے آپ کو یقین دلانے کی کوشش کرتا ہے اور اس انجام کے لئے ''ثبوت'' پیدا کرتا ہے؛ وہ دیوار پر مکا مارتا ہے، پتھروں کو ٹھوکر لگاتا ہے، چیختا، چلاتا ہے مگر کسی طور حقیقت سے فرار نہیں ہو سکتا۔

جس طرح وہ اس حقیقت کو اپنے ذہنوں سے نکال دینا چاہتے ہیں اسی طرح وہ یہ چاہتے ہیں کہ دوسرے بھی اسے مسترد کر دیں۔ وہ اس بات سے بھی باخبر ہیں کہ اگر مادے کی اصلیت

سے عام لوگ واقف ہو گئے، انہیں ان کے اپنے فلسفے کا کہنہ پن اور عالمی نقطہ نظر سے ان کی بے خبری کا پتہ چل گیا تو یہ سب کے لئے ممنوع قرار دے دیا جائے گا۔ پھر کوئی ایسی بنیاد ان کے پاس باقی نہیں بچے گی جس پر وہ اپنے نظریات کی معقولیت پیش کر سکیں۔ یہ وہ خدشات ہیں جن کی بنا پر وہ اس حقیقت سے اس قدر پریشان ہیں جس کا ذکر یہاں کیا گیا ہے:

وَيَوْمَ نَحْشُرُهُمْ جَمِيعًا ثُمَّ نَقُولُ لِلَّذِينَ أَشْرَكُوا أَيْنَ شُرَكَاؤُكُمُ الَّذِينَ كُنتُمْ تَزْعُمُونَ ○

یوم حساب ان سے اللہ اس طرح مخاطب ہوگا: ''جس روز ہم ان سب کو اکٹھا کریں گے اور مشرکوں سے پوچھیں گے کہ اب وہ تمہارے ٹھہرائے ہوئے شریک کہاں ہیں جن کو تم اپنا خدا سمجھتے تھے؟'' (سورۃ الانعام:۲۲)

اس کے بعد منکرین حق کے مال و دولت، اولاد، اور ان کے قریبی عزیز جن کو وہ اپنے حقیقی سمجھتے تھے اور ان کو اللہ کا شریک ٹھہراتے تھے انہیں چھوڑ کر غائب ہونا شروع ہو جائیں گے۔ اللہ نے اس حقیقت کو قرآن پاک کی اس آیت میں اس طرح بیان فرمایا ہے:

انْظُرْ كَيْفَ كَذَبُوا عَلَىٰ أَنفُسِهِمْ وَضَلَّ عَنْهُم مَّا كَانُوا يَفْتَرُونَ ○

''دیکھو اس وقت یہ کس طرح اپنے اوپر جھوٹ گھڑیں گے اور وہاں ان کے سارے بناوٹی معبود گم ہو جائیں گے''۔ (سورۃ الانعام:۲۴)

مومنین کی منفعت

جہاں یہ حقیقت مادہ پرستوں کو پریشان کر دیتی ہے کہ مادہ اور وقت ایک ادراک ہے اس کے برعکس یہ مومنین کے لئے اپنے اندر ایک سچائی رکھتی ہے۔ ایمان والے اس وقت بیحد خوش ہو جاتے ہیں جب انہیں مادے کے پیچھے چھپی حقیقت کا ادراک ہو جاتا ہے کیونکہ یہ حقیقت تمام سوالات کی کنجی ہے۔ اس کلید سے تمام رازوں کے قفل کھولے جاتے ہیں۔ وہ بہت سی باتیں جنہیں سمجھنے میں کبھی ایک شخص کو دقت ہوتی تھی اب آسانی سے اس کی سمجھ میں آجاتی ہیں۔

جیسا کہ گزشتہ صفحات میں بتایا جا چکا ہے کہ اس قسم کے سوالات کہ موت، جنت، دوزخ، آخرت، تبدیل ہونے والی جہتیں کیا ہیں؟ اور اس قسم کے اہم سوالات مثلاً ''اللہ کہاں ہے؟''، ''اللہ سے پہلے کیا تھا؟''، ''اللہ کو کس نے تخلیق کیا؟''، ''قبر کے اندر قیام کی مدت کتنی ہوگی؟''، ''جنت اور جہنم کہاں ہیں؟'' اور ''اس وقت جنت اور جہنم کہاں ہیں؟'' کا جواب بڑی آسانی کے

ساتھ دیا جا سکے گا۔ یہ بات سمجھ میں آ جائے گی کہ اللہ کس نظام کے تحت اس پوری کائنات کو عدم سے وجود میں لایا ہے۔

یہاں تک کہ اس راز کے کھلنے کے ساتھ، ''کب'' اور ''کہاں'' کے سوالات بے معنی ہو جاتے ہیں اس لئے کہ کوئی زمان ومکاں باقی نہیں رہ جائیں گے۔ جب لامکانیت سمجھ میں آ جاتی ہے تو یہ بھی سمجھ میں آ جائے گا کہ جہنم، جنت اور یہ زمین درحقیقت سب ایک ہی جگہ ہیں۔ اگر لازمانیت سمجھ میں آ جائے تو یہ سمجھ میں آ جائے گا کہ ہر چیز ایک واحد لمحے میں واقع ہوتی ہے، کسی چیز کا انتظار نہیں کرنا پڑتا اور وقت گزر نہیں جاتا اس لئے کہ ہر بات پہلے ہی ہو چکی اور اختتام کو پہنچ چکی ہے۔

اس راز کی تحقیق ہو جائے تو مومن کے لئے یہ دنیا جنت نما بن جاتی ہے۔ تمام قسم کی مادی پریشانیاں، تفکرات اور ڈر غائب ہو جاتے ہیں۔ انسان اس حقیقت کو پالیتا ہے کہ پوری کائنات کا ایک ہی حاکم اعلیٰ ہے اور یہ کہ وہ جس طرح چاہتا ہے اس پوری طبعی دنیا کو تبدیل کرتا ہے اور انسان کو صرف یہ کرنا ہے کہ وہ اس ذاتِ باری تعالیٰ کی طرف رجوع کرے اور پھر پوری طرح اسی کے کام کے لئے اپنے آپ کو وقف کر دے۔

اس راز کو پالینا اس دنیا کی سب سے بڑی منفعت ہے۔ اس راز سے ایک اور بہت اہم حقیقت جس کا قرآن پاک میں ذکر آیا ہے ہم پر آشکار ہو جاتی ہے:

وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ۔

''ہم اس کی رگ گردن سے بھی زیادہ اس سے قریب ہیں''۔ (سورۃ ق:۱۶)

جیسا کہ ہر انسان جانتا ہے کہ رگ گردن انسانی جسم کے اندر ہوتی ہے۔ تو پھر اس سے زیادہ اس سے قریب اور کیا ہو سکتا تھا؟ اس صورت حال کی لامکانیت کی حقیقت کے ذریعے آسانی سے وضاحت کی جا سکتی ہے۔ اس راز کو سمجھنے کے بعد اس آیت قرآنی کو مزید بہتر طور پر سمجھا جا سکتا ہے۔

یہ ایک واضح سچائی ہے۔ اسے خوب اچھی طرح ذہن نشین کر لیا جائے کہ اللہ سے زیادہ انسان کا کوئی بھی معاون ومددگار، سہارا اور فراہم کنندہ نہیں ہے۔ کچھ بھی نہیں ہے سوائے اللہ کی ذات کے؛ وہی واحد ذات مطلق ہے جس کی پناہ ڈھونڈی جا سکتی ہے، جس سے مدد کی درخواست کی جا سکتی ہے اور انعام واکرام کے لئے جس کی طرف نگاہ اٹھائی جا سکتی ہے۔

ہم جس سمت بھی رخ کریں اللہ ہی اللہ کو موجود پائیں گے۔

اِرتقاء ایک فریب

نظریۂ اِرتقاء ایک فلسفہ اور دنیا کا ایک ایسا نظریہ ہے جو غلط اور نادرست اعلانات، قیاسات اور تصوراتی منظر نامے پیش کرتا ہے تاکہ زندگی کے آغاز اور اس کی موجودگی کو محض اتفاقات کا نتیجہ ثابت کرسکے۔ اس فلسفے کی جڑیں عہد عتیق اور قدیم یونان تک جا پہنچتی ہیں۔

تمام ملحدانہ فلسفے جو تخلیق سے انکار کرتے ہیں بالواسطہ یا بلاواسطہ نظریۂ اِرتقاء کا دفاع کرتے ہیں۔ کچھ ایسی ہی صورت حال کا اطلاق آج ان تمام نظریات، اور نظاموں پر ہوتا ہے جو مذہب سے مخاصمت رکھتے ہیں۔

اِرتقائی تصور کو پچھلی ڈیڑھ صدی سے سائنسی بہروپ دے دیا گیا ہے تاکہ اسے صحیح ثابت کیا جاسکے۔ اسے حالانکہ ۱۹ویں صدی کے وسط میں ایک سائنسی نظریے کے طور پر پیش کیا گیا مگر پھر بھی اس نظریے کو اس کی وکالت کرنے والوں کی تمام تر کوششوں کے باوجود، کسی سائنسی دریافت یا تجربے سے اب تک صحیح ثابت نہیں کیا جاسکا۔ بیشک ''خود سائنس'' جس پر یہ نظریہ اس قدر انحصار کرتا ہے مسلسل یہ بات پیش کررہی ہے کہ درحقیقت اس نظریے میں اہلیت کی بنیاد پر زندہ رہنے کے لئے کچھ بھی موجود نہیں ہے۔

تجربہ گاہوں کے تجربات اور امکانی تخمینوں نے یہ واضح کردیا ہے کہ وہ امینو ترشے جن سے زندگی جنم لیتی ہے اتفاق سے وجود میں نہیں آسکتے تھے۔ اِرتقاء پسندوں کے دعوے کے مطابق وہ خلیہ جو قدیم اور غیر منضبط زمینی حالات کے تحت وجود میں آیا تھا، بیسویں صدی کی جدید ترین تجربہ گاہوں کے اعلیٰ تکنیکی آلات کے ذریعے بھی اس کی ترکیب وتالیف ممکن نہیں ہے۔

نو ڈارونی نظریے کے دعوؤں کی روشنی میں کوئی واحد جاندار بھی دنیا میں کسی جگہ فوسل

ریکارڈ کی طویل تحقیق کے باوجود تلاش نہیں کیا جا سکا جس سے وہ ''عبوری شکل'' سامنے آتی جس میں ان کے خیال میں بتدریج اِرتقاء ہوا تھا۔

اِرتقاء کے ثبوت جمع کرنے کی خاطر ارتقاء پسندوں نے پوری کوشش کی ہے کہ کسی طرح اسے ثابت کرسکیں مگر اس کے برعکس خود وہ اپنے ہاتھوں یہ ثبوت مہیا کرنے لگے ہیں کہ اِرتقاء سرے سے ہوا ہی نہیں ہے!

وہ شخص جس نے بنیادی طور پر نظریۂ اِرتقاء پیش کیا اس کا نام چارلس رابرٹ ڈارون تھا جو ایک انگریز غیر پیشہ ور ماہر حیاتیات تھا، اس نے سب سے پہلے اپنے خیالات کو جس کتاب میں پیش کیا، وہ کتاب ۱۸۵۹ء میں شائع ہوئی، نام تھا ''نوع کی ابتداء، بذریعہ فطری انتخاب'' (The Origin of Species by means of Natural Selection) ڈارون نے اپنی کتاب میں یہ دعویٰ پیش کیا کہ تمام جانداروں کا جد امجد ایک ہے اور یہ سب کے سب فطری انتخاب کے ذریعے بذریعہ اِرتقائی عمل وجود میں آئے تھے۔ وہ جاندار جو اپنے مسکن کے مطابق ڈھل گئے تھے انہوں نے اپنی صفات اپنے بعد آنے والی نسلوں میں منتقل کردی تھیں۔ پھر ایک طویل عرصے تک جمع ہو جانے کے بعد ان مفید صفات نے ایک واحد شے کو اپنے اجداد سے بالکل مختلف نوع (Species) میں تبدیل کر دیا تھا۔ اس فطری انتخاب کے میکانکی عمل کی بہترین پیداوار انسان تھا۔ مختصر یہ کہ ایک نوع کی ابتداء ایک دوسری نوع سے ہوئی تھی۔

ڈارون کے تخیلاتی نظریات کو ہاتھ میں لے کر انہیں مزید فروغ دینے کے لئے کئی نظریاتی اور سیاسی حلقے سرگرم عمل ہو گئے تھے اور یوں یہ نظریہ بہت مقبول ہوا۔ اس مقبولیت کے پس پردہ ایک بڑی حقیقت یہ کارفرما تھی کہ اس دور میں ابھی علوم نے اتنی ترقی نہیں کی تھی کہ ڈارون کے تصوراتی منظر نامے کو غلط اور نادرست ثابت کیا جا سکتا۔ جس وقت ڈارون نے اپنے مفروضات پیش کئے اس وقت جینیات، خورد حیاتیات اور حیاتیاتی کیمیا کا وجود ہی نہ تھا۔ اگر یہ علوم موجود ہوتے تو ڈارون نے بڑی آسانی کے ساتھ یہ بات تسلیم کر لی ہوتی کہ اس کا نظریہ مکمل طور پر غیر سائنسی تھا اور یوں وہ اس طرح کے لغو اور بے معنی دعوے کرنے سے باز آ گیا ہوتا:-

کہ وہ معلومات جو نوع کا تعین کرتی ہے پہلے سے جین میں موجود ہوتی ہے اور فطری انتخاب کے لئے یہ ناممکن ہے کہ وہ جین تبدیل کر کے نئی نوع پیدا کر سکے۔

ابھی ڈارون کی کتاب کی بازگشت سنائی دے رہی تھی کہ ایک آسٹریائی ماہر نباتات گریگر

مینڈل(Gregor Mendol) نے ۱۸۶۵ء میں موروثیت کے قوانین دریافت کر لئے تھے۔ صدی کے آخر تک اس بارے میں زیادہ کچھ سننے میں نہ آیا تھا لیکن ۱۹ویں صدی کے آغاز میں جینیات کی سائنس کی پیدائش کے ساتھ ہی مینڈل کی دریافت کو بڑی پذیرائی حاصل ہوئی۔ پھر کچھ عرصے بعد جین اور لونیوں کی ساخت دریافت ہوگئی تھی۔ ۱۹۵۰ء میں ڈی این اے سالمے کی دریافت نے جو جینیاتی معلومات تشکیل دیتی ہے نظریۂ ارتقاء کو ایک بہت بڑے بحران سے دوچار کر دیا تھا۔ اس لئے کہ ڈی این اے میں پائی جانے والی بے پناہ معلومات کے ماخذ کو اتفاقیہ طور پر پیش آنے والے واقعات سے واضح کرنا ممکن نہ تھا۔

اس تمام سائنسی ترقی کے باوجود کوئی بھی عبوری شکلیں، جن سے جاندار نامیوں کو قدیم نوع سے ترقی یافتہ نوع میں بتدریج ارتقاء سے پہنچنا تھا، برسوں کی تحقیق کے باوجود تلاش نہیں کی جا سکی تھیں۔

چاہئے تو یہ تھا کہ اس ساری ترقی نے ڈارون کے نظریے کو منسوخ کر کے تاریخ کے کوڑے دان میں پھینک دیا ہوتا۔ تاہم ایسا اس لئے نہ ہوا کیونکہ کچھ حلقے ایسے تھے جو اس نظریے پر نظر ثانی، اس کی تجدید اور اسے بلند کر کے سائنسی پلیٹ فارم پر لے آنے پر زور دے رہے تھے۔ یہ ساری کوششیں اس وقت بے معنی ہو جاتی ہیں جب ہمیں یہ احساس ہو جائے کہ اس نظریے کے پس پردہ نظریاتی ادارے موجود تھے سائنسی فکرمندی نہیں۔ اس کے باوجود کچھ حلقے جو اس بات پر یقین رکھتے تھے کہ ایک ایسا نظریہ جو ایک بند گلی میں پہنچ چکا تھا اسے سہارا دینے کے لئے ایک نیا ماڈل تشکیل دیا جائے۔ اس نئے ماڈل کا نام نوڈارونیت تھا۔ اس نظریے کے مطابق وہ نوع جو عمل تغیر کے نتیجے میں بنتی ہیں جن میں معمولی سی جینیاتی تبدیلیاں آ جاتی ہیں، ان میں سے وہ جو زندہ رہنے کے لئے سب سے زیادہ موزوں ہوں گی وہ فطری انتخاب کے میکانکی عمل کے ذریعے زندہ رہ جائیں گی۔ تاہم جب یہ ثابت ہو گیا کہ نوڈارونیت نے جو میکانکی عمل تجویز کئے تھے وہ قابل عمل نہ تھے اور جانداروں کے متشکل ہونے کیلئے معمولی تبدیلیاں کافی نہ تھیں، تو ارتقاء پسندوں نے نئے نمونوں کی تلاش شروع کر دی تھی۔ وہ ایک نیا دعویٰ لے کر آئے جسے ''تاکیدی توازن'' (Punctuated Equilibrium) کا نام دیا گیا، جس کی بنیاد کسی معقول ثبوت یا سائنسی بنیادوں پر نہیں رکھی گئی تھی۔ اس ماڈل نے یہ نقطہ نظر دیا کہ جاندار اچانک عبوری شکلوں کے بغیر کسی دوسری نوع میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں ایسی نوع جن کے ارتقائی

''مورث اعلیٰ'' نہیں ہوتے وہ اچانک نمودار ہو جاتے ہیں۔ دراصل یہ تخلیق کی وضاحت کا ایک طریقہ تھا حالانکہ ارتقاء پسند اسے تسلیم کرنے میں تذبذب سے کام لے رہے تھے۔ انہوں نے اس حقیقت کو تحفظ دینے کے لئے نا قابل فہم منظر ناموں کا سہارا لینے کی کوشش کی تھی۔ مثلاً انہوں نے کہا کہ پہلا پرندہ تاریخ میں اچانک ایک رینگنے والے چھپکلی یا مگر مچھ نما جانور کے انڈے سے اچانک پھدک کر اس طرح نکل آیا ہوگا۔ کہ اس بات کی وضاحت نہیں کی جاسکتی۔ اسی نظریے کے مطابق خشکی پر رہنے والے گوشت خور جانور قوی ہیکل مچھلیوں میں تبدیل ہو گئے ہوں گے اور ان میں ایک اچانک اور قابل فہم قلب ماہیت ہوئی ہوگی۔

یہ ایسے دعوے ہیں جو جینیات، حیاتیاتی طبیعات اور حیاتیاتی کیمیا کے تمام اصولوں کی تردید کرتے ہیں۔ یہ اسی قدر سائنسی ہیں جس قدر وہ پریوں کی کہانیاں ہوتی ہیں جن میں مینڈک شہزادوں میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ تاہم نوڈارونی دعویٰ جس بحران کا شکار تھا اس سے مایوس ہو کر کچھ ارتقاء پسند ماہرین قدیم حیاتیات نے اس نظریے کو گلے لگا لیا تھا جو خود نوڈارونیت سے کہیں زیادہ عجیب وغریب اور اوٹ پٹانگ تھا۔

اس ماڈل کا ایک مقصد تھا کہ فوسل ریکارڈ میں جو گمشدہ کڑیاں تھیں انکے لئے وضاحت پیش کی جائے، جس کی وضاحت نوڈارونی ماڈل نہیں کرسکتا تھا۔ تاہم یہ کوئی معقول بات تو نہیں لگتی کہ پرندوں کے ارتقاء کو اس دعوے کے ذریعے پیش کیا جائے کہ ''ایک پرندہ اچانک چھپکلی نما جانور کے انڈے سے پھدک کر باہر آ گیا تھا'' اور یوں فوسل ریکارڈ میں پائی جانے والی گمشدہ کڑیوں کی وضاحت کرنے کی کوشش کی جائے۔ کیونکہ ارتقاء پسندوں کے اپنے اعتراف کے مطابق ایک نوع سے دوسری نوع میں ارتقاء کے لئے جینیاتی معلومات میں ایک بڑی اور مفید تبدیلی کی ضرورت ہوتی ہے۔ تاہم کسی قسم کا عمل تغیر جینیاتی معلومات کو تبدیل نہیں کرتا نہ ہی اس میں نئی معلومات کا اضافہ کرتا ہے۔ عمل تغیر تو جنیاتی معلومات کو پراگندہ کر دیتا ہے پس ایسے عظیم عمل تغیر جن کا تصوّر تاکیدی توازنی ماڈل کرتے ہیں جینیاتی معلومات میں صرف ''بڑی'' یا ''عظیم'' تخفیفات اور نقائص پیدا کرتے ہیں۔

نظریہ تاکیدی توازن محض تخیل کی پیداوار تھا۔ اس عیاں سچائی کے باوجود ارتقاء کے حامی اس نظریے کی تعریف کرنے سے نہیں ہچکچاتے۔ حقیقت یہ ہے کہ ڈارون نے جو ارتقاء کا ماڈل تجویز کیا تھا اسے فوسل ریکارڈ ثابت نہ کرسکا اور انہیں مجبوراً ایسا کرنا پڑا۔ ڈارون نے دعویٰ کیا تھا

کہ نوع ایک بتدریج اِرتقاء سے گزری تھیں جس نے نصف پرندے اور نصف چھپکلی نما جانور یا نصف مچھلی نصف چھپکلی نما جانور کے اعجوبے کو لازمی بنا دیا تھا۔ تاہم ان میں سے کوئی ایک بھی ''عبوری شکل'' اِرتقاء پسندوں کو وسیع تحقیقی مطالعہ اور ہزاروں فوسلز کو کھود کر نکالنے کے باوجود دستیاب نہ ہو سکی۔

اِرتقاء پسندوں نے تاکیدی توازن کے ماڈل پر اس امید کے ساتھ ہاتھ رکھے کہ وہ اس طرح ایک بڑے فوسل سے ملنے والی ذلت آمیز شکست کو چھپا سکیں گے۔ جیسا کہ ہم پہلے یہ ذکر کر چکے ہیں کہ یہ بات بالکل عیاں تھی کہ یہ نظریہ ایک واہمہ تھا۔ اور اسی لئے یہ جلد اپنے انجام کو پہنچ گیا۔ تاکیدی توازن کے ماڈل کو ایک مستقل ماڈل کے طور پر کبھی پیش نہ کیا گیا تھا بلکہ اسے ان حالات میں بطور ایک جائے فرار کے استعمال کیا گیا تھا جو بتدریج اِرتقاء کے ماڈل سے پوری طرح ہم آہنگ نہ تھے۔ چونکہ آج اِرتقاء پسندوں کو اس بات کا احساس ہے کہ پیچیدہ و مکمل اعضاء مثلاً آنکھیں، پنکھ، پھیپھڑے، دماغ وغیرہ بتدریج اِرتقاء کے ماڈل کی صاف صاف تردید کرتے ہیں اس لئے ان مخصوص مقامات پر وہ تاکیدی توازن کے ماڈل کی مضحکہ خیز تشریحات میں پناہ لینے پر مجبور ہیں۔

کیا کوئی فوسل ریکارڈ ہے جو نظریۂ اِرتقاء کی تصدیق کر سکے؟

نظریۂ اِرتقاء یہ استدلال پیش کرتا ہے کہ ایک نوع سے دوسری نوع میں اِرتقاء بتدریج اور مرحلہ وار ہوتا ہے جس میں کئی ملین برس لگتے ہیں۔ یہ منطقی دخل اندازی جو اس قسم کے دعوے سے اخذ کی جاتی ہے اس بات کو لازمی قرار دیتی ہے کہ ایسے جسیم زندہ نامیے جنہیں ''عبوری شکلیں'' کہا جاتا ہے، ان کو اس ماہیت قلبی کے دوران ضرور زندہ رہنا چاہئے تھا۔ چونکہ اِرتقاء پسندوں کا یہ دعویٰ ہے کہ تمام جاندار مرحلہ وار عمل تغیر سے ایک شکل سے دوسری شکل میں آئے اس لئے ان عبوری شکلوں کی تعداد اور قسمیں کئی ملین ہونی چاہئیں تھیں۔ اگر یہ مخلوق کبھی زندہ تھی تو پھر ہم کہیں نہ کہیں ان کی باقیات ضرور دیکھیں گے۔ دراصل اگر یہ مفروضہ صحیح ہو تو پھر تو آج جتنے جانور زندہ ہیں ان کی عبوری شکلوں کی تعداد بھی زیادہ ہونی چاہئے تھی۔ اور دنیا بھر میں ان کے فوسلز کی باقیات بھی بکثرت ملنی چاہئیں تھیں۔

ڈارون کے زمانے سے اِرتقاء پسند فوسلز کی تلاش میں ہیں مگر نتیجہ بری طرح مایوسی و

ناامیدی کے سوا کچھ نہیں نکلا۔کوئی سے بھی دو نوع کے درمیان کی عبوری شکلیں دنیا کے بحروبر میں کہیں بھی نہیں مل سکیں۔

ڈارون خود بھی اس قسم کی عبوری شکلوں کی عدم موجودگی سے خوب واقف تھا۔اسے قوی امید تھی کہ مستقبل میں وہ ضرور تلاش کر لئے جائیں گے۔امید وتوقع کے باوجود اس نے دیکھا کہ اس کے نظریے میں سب سے بڑا سنگ راہ عبوری شکلوں کی گمشدگی تھی۔اسی لئے اس نے اپنی کتاب ''نوع کی ابتداء'' (The Origin of Species) میں لکھا:

اگر ایک نوع سے دوسری نوع میں بتدریج منتقلی ہوئی ہے تو پھر ہمیں ہر کہیں عبوری شکلیں نظر کیوں نہیں آتیں؟ نوع کے بجائے فطرت ابتر اور منتشر کیوں نہیں ہے ہم تو اسے واضح اور صراحت کے ساتھ دیکھتے ہیں۔

اس نظریۂ ارتقاء کے مطابق تو لاتعداد عبوری شکلیں کرۂ ارض پر موجود ہونی چاہئیں تھیں مگر وہ ہمیں کیوں نہیں ملتیں؟...... درمیانی خطے میں، جہاں زندگی درمیانی حالت میں ملتی ہے، ہم بہت مربوط قسمیں کیوں نہیں پاتے؟ اس مشکل نے طویل عرصے تک مجھے بے حد پریشان رکھا!

ڈارون کو بھی بجا طور پر ضرور پریشان ہونا چاہئے تھا۔اس مسئلے نے دوسرے ارتقاء پسندوں کو بھی پریشان رکھا۔ایک برطانوی مشہور ماہر قدیم حیاتیات Derek V.Ager اس الجھا دینے والی حقیقت کا اعتراف یوں کرتا ہے:

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر ہم تمام فوسل ریکارڈ کا تفصیلی جائزہ لیں خواہ یہ درجہ وترتیب کی سطح تک ہو یا انواع کی سطح تک، ہمیں کہیں بھی بتدریج ارتقاء نظر نہیں آتا بلکہ ایک گروہ کا دوسرے گروہ کی بنیاد پر اچانک دھماکہ خیز انداز میں سامنے آنا دکھائی دیتا ہے۔

فوسل ریکارڈ کی گمشدہ کڑیوں کی اس حسرت زدہ خیال کے ساتھ وضاحت نہیں کی جاسکتی کہ فوسلز ابھی تک زیادہ دریافت نہیں ہو سکے اور ایک دن یہ ضرور تلاش کر لئے جائیں گے۔ایک اور ارتقاء پسند ماہر قدیم حیاتیات T.Neville George اس کا سبب یہ بیان کرتا ہے:

فوسل ریکارڈ کی کمی کے لئے اب مزید معذرت خواہانہ انداز اختیار کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔کئی لحاظ سے یہ کافی حد تک موجود ہے اور مزید جو دریافتیں ہو رہی ہیں ان سے یہ تکمیل کی رفتار سے بڑھ گیا ہے تاہم فوسل ریکارڈ زیادہ تر درمیانی گمشدہ کڑیوں سے مل کر بننے کے تسلسل سے گزر رہا ہے۔



بائیں: لال بیگ کا ۳۲۰ ملین برس پرانا فوسل۔
نیچے: سہ لختہ دار، بحری جانور کا ۳۶۰ ملین برس پرانا فوسل



زندگی کرۂ ارض پر اچانک اور جامع و مکمل شکل میں نمودار ہوئی

جب قدیم کرۂ ارض کے پرتوں اور فوسل ریکارڈ کا جائزہ لیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ جاندار نامیاتی جسم بھی ان کے ساتھ ساتھ وجود میں آئے تھے۔ زمین کا قدیم ترین پرت جس میں جاندار مخلوق کے فوسلز ملے ہیں وہ ''کیمبری'' (Cambrian) ہیں جن کی عمر تخمیناً ۵۳۰-۵۲۰ ملین برس ہے۔

وہ جاندار جو زمین کے کیمبری عہد میں پائے گئے فوسل ریکارڈ میں اچانک شامل ہو گئے تھے اور ان کے کوئی آباؤ اجداد اس سے قبل موجود نہ تھے۔ جاندار نامیوں کے وسیع نقوش جو اتنے لاتعداد، جامع و مکمل مخلوق سے بنے تھے اس قدر اچانک پیدا ہوئے کہ اس حیرت انگیز عہد کو سائنسی ادب میں ''کیمبری دھماکہ'' کے نام سے منسوب کیا جاتا ہے۔

زمین کے اس پرت میں پائے جانے والے نامیے بے حد ترقی یافتہ اعضاء تھے مثلاً آنکھیں ، یا وہ نظام جو ان نامیاتی اجسام میں نہایت ترقی یافتہ شکل میں نظر آتے تھے جیسے گلپھڑے اور دورانِ خون کے نظام وغیرہ۔ اس فوسل ریکارڈ میں کوئی بھی ایسی علامت نہیں تھی جس سے یہ ظاہر ہوتا کہ ان نامیوں کے کوئی آباؤ اجداد بھی تھے۔



اِرتقاء کے نہایت اہم ثبوت جو مسترد کردیے گئے

(نیچے) Coelacanth مچھلی کے ۴۱۰ ملین برس پرانے فوسل ارتقاء پسندوں کا دعویٰ یہ تھا کہ یہ ایک ایسی درمیانی شکل تھی جو ثابت کرتی تھی کہ یہ مچھلی پانی سے خشکی پر کس طرح منتقل ہوئی۔ یہ حقیقت کہ اس مچھلی کی ۴۰ سے زیادہ زندہ مثالیں موجود ہیں کہ گزشتہ ڈیڑھ سو برس کے دوران اسے کئی بار پکڑا گیا جو اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ ایک ایسی مکمل مچھلی ہے جو آج بھی زندہ ہے۔(بائیں) ۱۳۵ ملین برس پرانا فوسل جو ARCHAEOPTERYX کا تھا جسے پرندوں کا جدِ امجد بتایا گیا اور جس کے متعلق کہا گیا کہ یہ ڈائینوساروں سے بذریعہ عمل تغیر وجود میں آیا تھا۔ اس فوسل پر کی گئی تحقیق سے پتہ چلا کہ یہ ایک ناپید پرندہ ہے جو کبھی اُڑتا تھا۔



Richard Monestarsky جو ''اَرتھ سائنسز'' (Earth Sciences) رسالے کا مدیر تھا جانداروں کے اچانک پیدا ہونے کے بارے میں لکھتا ہے:

نصف بلین برس قبل جانوروں کے قابلِ ذکر حد تک مکمل اجسام، جو آج ہمیں نظر آتے ہیں، اچانک نمودار ہوئے تھے۔ یہ لمحہ ارضی کیمبری عہد کے آغاز میں تقریباً ۵۵۰ ملین برس قبل اس اِرتقائی دھماکے کی نشاندہی کرتا ہے جس نے سمندروں کو دنیا کے اوّلین مکمل جانداروں سے بھر دیا تھا۔

آج کے بڑے بڑے جانور کیمبری عہد کے آغاز میں موجود تھے اور آج کی طرح اس زمانے میں بھی ایک دوسرے سے بالکل مختلف تھے۔

اِرتقاء پسند جب اس سوال کا جواب نہ دے سکے کہ کرۂ ارض کس طرح جانوروں کی ہزاروں نوع سے بھر گیا تھا تو انہوں نے ایک ایسے تصوّراتی عہد میں پناہ ڈھونڈی جو کیمبری عہد سے بیس ملین برس قبل کا تھا تاکہ وہ یہ بتا سکیں کہ زندگی کی ابتداء کیسے ہوئی اور ''نامعلوم کیسے وقوع پذیر ہوا''۔ اس عہد کو ''اِرتقائی خلاء تا گمشدہ کڑی'' کا نام دیا گیا۔ اس کے لئے کبھی بھی کوئی ثبوت نہیں مل سکا اور یہ نظریہ اب بھی غیر واضح ہے جس کی کوئی تشریح نہیں کی جاسکی۔

۱۹۸۴ء میں لاتعداد مکمل ریڑھ دار جانوروں کی باقیات کو جنوب مغربی چین کے مرکزی Yunnan کے پہاڑی علاقے Chengjiang کی زمین کھود کر نکالا گیا تھا۔ ان میں سہ لختہ دار بحری جانور (Trilobites ۔ حجری دور کے بحری جانور۔ ان کے جسم بیضوی شکل کے چپٹے ہوتے تھے اور لمبائی ایک انچ سے دو فٹ تک) شامل تھے جو اب اس دنیا سے ناپید ہو چکے ہیں مگر یہ جدید ریڑھ دار جانوروں کی نسبت کسی طرح بھی کم جامع و مکمل شکل میں نہیں تھے۔

ایک سویڈنی ارتقاء پسند اور ماہر قدیم حیاتیات اس صورت حال کے بارے میں یوں وضاحت کرتا ہے:

اگر تاریخ حیاتِ انسانی کا کوئی واقعہ انسان کی تخلیق کی داستاں سے ملتا جلتا ہے تو وہ یہی سمندری زندگی کے اچانک متنوع صورت میں نمودار ہونے کا واقعہ ہے جب ماحولیات اور ارتقاء میں بین الخلیاتی نامیاتی اجسام نے اپنی بالادستی سمیت مخصوص کارندوں کے طور پر نظام سنبھال لیا تھا۔ ڈارون کے لئے یہ بات بڑی حیران کن (اور پریشان کن) تھی اور یہ واقعہ اب بھی ہماری آنکھوں کو خیرہ کر دیتا ہے۔

ارتقاء پسندوں کے لئے آج ان مکمل جانداروں کا نمودار ہونا جن کے آباؤ اجداد کوئی نہ تھے کوئی کم حیرت انگیز نہیں ہے (اور پریشان کن بھی) جتنا کہ ۱۳۵ برس قبل تھا۔ تقریباً ڈیڑھ سو سال میں وہ اس مقام سے ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھے جس نے ڈارون کو ناقابل حل پریشانی سے دوچار کیا تھا۔

جیسا کہ ہم دیکھیں گے کہ فوسل ریکارڈ سے پتہ چلتا ہے کہ جاندار قدیم سے جدید شکلوں میں تبدیل نہیں ہوئے۔ بلکہ یہ تو اچانک اور مکمل شکل میں پیدا ہوئے عبوری یا درمیانی شکلوں کی عدم موجودگی صرف کیمبری عہد کے ساتھ ہی وابستہ نہیں ہے۔ کوئی ایک بھی تو عبوری شکل ریڑھ دار جانوروں، مچھلیوں، جل تھلیاؤں، چھپکلی نما جانوروں، پرندوں، دودھیلے جانوروں، کی آج تک نہیں ملی۔ ہر جاندار نوع فوسل ریکارڈ میں جامع و مکمل شکل میں اور اچانک نمودار ہوتی ہے۔

دوسرے لفظوں میں جاندار بذریعہ ارتقاء وجود میں نہیں آئے تھے بلکہ انہیں تخلیق کیا گیا تھا۔

نظریۂ اِرتقاء کی فریب کاریاں - تصاویر میں دھوکہ وفریب

وہ لوگ جو نظریۂ اِرتقاء کے لئے ثبوت ڈھونڈتے ہیں ان کے لئے فوسل ریکارڈ ایک بڑا



کتابوں اور دوسری مطبوعات میں اس قدر مہارت سے نصف انسان اور نصف بندر کی مسلسل بنائی ہوئی تصاویر کو دیکھ کر لوگ یقین کر لیتے ہیں کہ انسان عمل تغیر کے بعد بندر یا اس جیسے کسی جانور کی شکل سے موجودہ صورت میں آیا مگر یہ ساری تصاویر جعلسازی اور دھوکہ وفریب کی پیداوار ہیں۔



ماخذ ہے۔ اگر احتیاط کے ساتھ اور بلا تعصب اس کا معائنہ کیا جائے تو بجائے تصدیق کرنے کے فوسل ریکارڈ نظریۂ اِرتقاء کی تردید کرتا ہے۔ تاہم اِرتقاء پسندوں نے فوسلز کی گمراہ کن تشریحات پیش کر کے اور لوگوں کے سامنے موضوعی انداز میں ان کی نمائندگی سے یہ تاثر دیا ہے کہ فوسل ریکارڈ نظریۂ اِرتقاء کی حمایت کرتا ہے۔ فوسل ریکارڈ میں چند دریافتوں کی تمام قسم کی تشریحات اثر پذیری ہی وہ شے ہے جو اِرتقاء پسندوں کے مقصد کو بہترین طور پر پورا کرتی ہے۔ وہ فوسلز جن کو زمین کھود کر نکالا گیا ہے وہ زیادہ تر تو قابل اعتماد شناخت کے لئے غیر تسلی بخش ثابت ہوئے ہیں۔ وہ عموماً ہڈیوں کے بکھرے ہوئے نامکمل ٹکڑوں پر مشتمل ہوتے ہیں۔ اسی وجہ سے دستیاب اعداد وشمار میں جعلسازی کے ذریعے ردوبدل بہت آسان ہو جاتا ہے اور پھر وہ اسے حسب منشاء استعمال کر سکتے ہیں۔

اِس میں حیرت کی کوئی بات نہیں کہ جو تصاویر اور خاکے اِرتقاء پسند از سر نو بناتے ہیں وہ ان فوسلز کی باقیات پر مبنی ہوتے ہیں جن کو وہ محض تخیلات کی مدد سے تیار کرتے ہیں تا کہ اپنے اِرتقائی دعووں کی تصدیق کر سکیں۔ لوگ چونکہ بصری معلومات سے بآسانی متاثر ہو جاتے ہیں اس لئے یہ نوساختہ نمونے انہیں متاثر کرنے کے لئے استعمال کئے جاتے ہیں تا کہ یہ ثابت کر سکیں کہ جس مخلوق کے یہ ماڈل ہیں وہ ماضی میں زندہ تھی۔

اِرتقاء پسند محققین تصوراتی مخلوق کی تصاویر اور خاکے بناتے وقت عموماً ایک دانت یا جبڑے

کے ٹکڑے یا بازو کی ہڈی سے مدد لیتے ہیں اور انہیں ایسے سنسنی خیز انداز میں لوگوں کے سامنے پیش کرتے ہیں جیسے وہ انسانی اِرتقاء کی ایک کڑی ہوں۔ ان تصاویر نے ''قدیم انسانوں'' کی شبیہ کو بہت سے انسانوں کے ذہنوں میں پختہ کرنے میں بڑا کردار ادا کیا ہے۔

یہ مطالعاتی جائزے جن کی بنیاد ہڈیوں کی باقیات ہوتی ہے دستیاب شے کی بہت عام قسم کی خصوصیات ظاہر کرتی ہیں۔ اصل نمایاں جزئیات نرم ریشوں میں موجود ہوتی ہیں جو بہت جلد غائب ہو جاتی ہیں۔ وہ نرم ریشے جن کی تشریح محض تخیلات کی مدد سے کی جاتی ہے اس سے تخیلات کی حدود کے اندر اندر ہر شے ممکن نظر آتی ہے۔ ہارورڈ یونیورسٹی کا Earnest A.Hooten اس صورت حال پر یوں اظہار خیال کرتا ہے:

نرم اعضاء کو بحال کرنے کی کوشش اور زیادہ پر خطر کام ہے۔ ہونٹ، آنکھیں، کان، ناک کا سرا ہڈیوں والے اعضاء پر کوئی نشانات نہیں چھوڑتے۔ آپ یکساں سہولت کے ساتھ ایک Neanderthaloid (انسان سے مشابہ ایک مخلوق) کی کھوپڑی پر کسی (چمپانیز) افریقی لنگور کے خدوخال یا کسی فلسفی کا حلیہ بنا سکتے ہیں۔ قدیم انسان کی قسموں کی بہت کم سائنسی قدر و قیمت ہے اور ان سے لوگوں کو گمراہ کیا جا سکتا ہے...... پس اس تعمیر نو پر یقین نہ کیجئے۔

جعلی فوسلز کی تصوّراتی تصاویر

جب اِرتقاء پسندوں کو نظریۂ اِرتقاء کے لئے فوسل ریکارڈ میں قابل تسلیم ثبوت نہ ملا تو انہوں نے اپنے پاس سے اسے گھڑ لینے کی کوشش کی۔ ان کوششوں کو انسائیکلو پیڈیاؤں میں ''نظریۂ اِرتقاء کی فریب کاریاں'' کے عنوان سے شامل کیا گیا ہے جس سے اس بات کی واضح نشاندہی ہوتی ہے کہ نظریۂ اِرتقاء ایک ایسا نظریاتی اور فلسفیانہ معاملہ ہے جس کا دفاع کرنے میں وہ ناکام رہے ہیں۔ اس دھوکہ وفریب میں سب سے بڑے اور بدنام زمانہ فریب دو ہیں جن کا ذکر نیچے کیا جا رہا ہے۔

پلٹ ڈاؤن آدمی (Piltdown Man)

چارلس ڈاسن، ایک نامور ڈاکٹر اور غیر پیشہ ور ماہر قدیم حیاتیات، اس دعوے کے ساتھ سامنے آیا کہ اسے ایک جبڑے کی ہڈی اور ایک کھوپڑی کا ٹکڑا پلٹ ڈاؤن، برطانیہ سے (۱۹۱۲ء)

ملا ہے۔ یہ کھوپڑی انسانی نظر آتی تھی مگر جبڑا صاف طور پر بندر کا دکھائی دیتا تھا۔ ان نمونوں کو "پلٹ ڈاؤن آدمی" کا نام دیا گیا۔ یہ ۵۰۰ ہزار برس پرانے بتائے جاتے تھے اور انہیں انسانی ارتقاء کے واضح ثبوتوں کے طور پر دکھایا گیا تھا۔ چالیس سے زائد برسوں تک "پلٹ ڈاؤن آدمی" پر سائنسی مضامین لکھے جاتے رہے، بہت سی تشریحات کی گئیں اور بہت سی تصاویر بنائی گئیں۔ اور اس فوسل کو انسانی ارتقاء کے ایک قطعی ثبوت کے طور پر پیش کیا گیا تھا۔

۱۹۴۹ء میں سائنسدانوں نے ایک بار پھر اس فوسل کا معائنہ کیا اور وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ یہ فوسل دانستہ طور پر بذریعہ جعلسازی بنایا گیا تھا جس میں کھوپڑی انسانی تھی اور جبڑا ایک انسان نما بندر (Orang-utan) کا تھا۔ فلورین کے ذریعے عرصہ و مدت معلوم کرنے کا طریقہ استعمال کرتے ہوئے محققین نے دریافت کیا کہ یہ کھوپڑی تو چند ہزار برس پرانی تھی۔ جبڑے میں جو دانت تھے وہ ایک انسان نما بندر کے تھے جنہیں مصنوعی طریقے سے پرانا اور قدیم بنایا گیا تھا اور "قدیم" اوزار جو فوسلز کے ساتھ تھے واضح جعلسازی کے ذریعے اس طرح بنائے گئے تھے کہ انہیں فولاد کے اوزاروں سے تیز کیا گیا تھا۔



جعلی فوسل: پلٹ ڈاؤن آدمی

ان مفصل تجزیوں میں جو اوکلے، ویز اور کلارک (Oakley, Weiner, Clark) نے کیے اس جعلسازی کو ۱۹۵۳ء میں لوگوں پر منکشف کیا گیا تھا۔ یہ کھوپڑی ۵۰۰ سالہ بوڑھے انسان کی تھی اور جبڑے کی ہڈی حال ہی میں مرنے والے ایک بندر کی تھی۔ دانتوں کو اس کے بعد ایک ہی سیدھ میں ترتیب دی گئی تھی اور پھر جبڑے کے ساتھ جوڑ دیا گیا تھا اور جوڑوں کو اس طرح پر کر دیا گیا تھا کہ وہ ایک انسان کے دانت اور جبڑے سے مشابہ نظر آئیں۔ پھر ان سب ٹکڑوں پر پوٹاشیم ڈکرومیٹ سے داغ دھبے لگا دیئے گئے تھے تاکہ یہ پرانے نظر آئیں۔ (جب تیزاب میں ڈبویا گیا تو یہ داغ دھبے دھل گئے تھے) لی گراس کلارک نے جو اس تحقیقی ٹیم کا رکن تھا اس جعلسازی کا سراغ لگا لیا تھا مگر وہ بھی اس صورتحال پر اپنی حیرت کو نہ چھپا سکا تھا۔ وہ لکھتا ہے:

دانتوں کی مصنوعی کھرچن کے ثبوت فوراً نظروں کے سامنے آ گئے تھے۔ بیشک وہ اس قدر عیاں تھے کہ یہ سوال پوچھا جا سکتا تھا: "یہ کیسے ممکن تھا کہ یہ اس سے قبل نظروں سے اوجھل رہے؟"

نبراسکا آدمی (Nebraska Man)

ہنری فیئر فیلڈ اوسبارن (Henry Fairfield Osborn) نے جو امریکن میوزیم آف نیچرل ہسٹری کا ڈائریکٹر تھا ۱۹۲۲ء میں یہ اعلان کیا کہ اسے ایک ڈاڑھ مغربی نبراسکا، سینک بروک سے ملی ہے جو عہد Pliocene (جدید تر عصر) سے تعلق رکھتی ہے۔ اس پچلی دانت میں انسان اور بندر دونوں کے پچلی دانت کی خصوصیات ملتی تھیں۔

ایسے سائنسی بحث مباحثے شروع ہو گئے تھے جن میں کچھ نے تو اس دانت کو جاوا کے بن مانس کا دانت قرار دیا جبکہ دوسروں کے خیال میں یہ جدید دور کے انسان کے دانت کے ساتھ بہت مشابہت رکھتا تھا۔ یہ فوسل جس نے وسیع بحث کا آغاز کرا دیا تھا، اسے "نبراسکا مین" (نبراسکا آدمی) کا نام دے دیا گیا تھا۔ اسے پھر جلد ہی ایک سائنسی نام "Hesperopithecus Harol Cooki" بھی دے دیا گیا تھا۔

کئی صاحب الرائے لوگوں نے اوسبارن (Osborn) کی حمایت کی۔ اس دانت کو بنیاد بنا کر نبراسکا آدمی کے سر اور جسم کی تصویر بنالی گئی تھی۔ مزید یہ کہ نبراسکا آدمی کے پورے خاندان کی تصویر بھی بنائی گئی جو یقیناً تصوراتی تھی۔



اوپر دی گئی تصویر ایک واحد دانت کی بنیاد پر بنائی گئی تھی، اسے ۲۴ جولائی ۱۹۲۲ء کے السٹریٹڈ لندن نیوز میں شائع کیا گیا تھا۔ تاہم جب یہ بات منکشف ہوئی کہ یہ دانت نہ بندر نما مخلوق کا ہے نہ ہی انسان کا بلکہ یہ تو سور کی ایک ناپید ہو جانے والی نوع کا ہے تو ارتقاء پسندوں کو بے حد مایوسی ہوئی۔

پھر ۱۹۲۷ء میں ڈھانچے کے دوسرے اعضاء بھی تلاش کر لئے گئے تھے۔نو دریافت شدہ ٹکڑوں کے مطابق یہ دانت نہ بندر کا تھا نہ ہی انسان کا۔اب اس بات کا پتہ چلا تھا کہ یہ دانت تو ایک ایسے امریکی سور کا تھا جس کی نسل ختم ہو چکی تھی اور جسے PROSTHENNOPS کہتے تھے۔

کیا انسانوں اور بندروں کا جدامجد مشترک تھا؟

نظریۂ اِرتقاء کے دعووں کے مطابق انسانوں اور جدید بندروں کے آباؤاجداد مشترک ہیں ۔یہ جاندار ایک وقت ایسا تھا جب عمل تغیر سے گزرے تھے جس سے ان میں سے کچھ تو آج کے بندر بن گئے تھے جبکہ ایک دوسرا گروہ جو ایک دوسری شاخ اِرتقاء میں سے گزرا اس دور کے انسانوں میں تبدیل ہو گیا تھا۔

اِرتقاء پسند انسانوں اور بندروں کے اِس مشترک جدامجد کو "Australopithecus" کہتے تھے جس کا مطلب ہے ''جنوبی افریقی بندر''۔ یہ بندوں کی ایک قدیم نوع سے تعلق رکھتا تھا جواب ناپید ہو چکی ہے اور اس کی بہت سی قسمیں ہیں۔ان میں سے کچھ تو تنومند ہیں جبکہ دوسرے چھوٹے اور دھان پان ہیں۔

اِرتقاء پسند انسانی اِرتقاء کے اگلے مرحلے کو ''ہومو'' (Homo) یعنی ''انسان'' کہتے ہیں۔ اِرتقاء پسندوں کے دعوے کے مطابق ہوموسلسلے سے تعلق رکھنے والے جاندار افریقی بندر کی نسبت زیادہ نشوونما یافتہ ہیں اور دورِ جدید کے انسان سے زیادہ مختلف بھی نہیں ہیں۔آج کے جدید انسان یعنی Homo Sapiens کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ اس نوع کے اِرتقاء کے آخری مراحل میں متشکل ہوا تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ جس مخلوق کو اس تصوّراتی منظر نامے میں اِرتقاء پسندوں کی زبانی افریقی بندر کہا گیا حقیقی بندر ہیں جواب ناپید ہو چکے ہیں۔اور جن جانداروں کا ذکر ہوموسلسلے میں ہوا ہے وہ ان مختلف انسانی نسلوں سے تعلق رکھتے تھے جو ماضی میں زندہ تھے اور پھر ناپید ہو گئے۔اِرتقاء پسندوں نے مختلف بندوں اور انسانوں کے فوسلز کو سب سے چھوٹے سے لے کر سب سے بڑے تک ایک ترتیب میں رکھا تا کہ ''انسانی اِرتقاء'' کے منصوبے کو تشکیل دے سکیں۔تاہم سائنسی حقائق بتاتے ہیں کہ ان فوسلز میں کوئی اِرتقائی عمل دکھائی نہیں دیتا اور ان میں سے جن کو انسان کا جدامجد کہا ہے وہ اصلی بندر تھے جبکہ ان میں سے کچھ اصلی انسان ہیں۔

آیئے اب ہم ایک نظر افریقی بندر پر ڈالتے ہیں جو انسانی اِرتقاء کے منصوبے کے پہلے مرحلے کو جنم دیتا ہے۔

افریقی بندر (Australopithecus)-ناپید بندر

اِرتقاء پسندوں کا دعویٰ ہے کہ افریقی بندر (Australopithecus) دورِ جدید کے انسان کے قدیم آباؤ اجداد ہیں۔ یہ ایک قدیم نوع (Species) ہے جس کا ایک سر اور کھوپڑی جدید بندر کی کھوپڑی اور سر جیسی ہوتی ہے لیکن کھوپڑی کی وسعت ان کی کھوپڑی کی وسعت سے کم ہوتی ہے۔ اِرتقاء پسندوں کے دعووں کے مطابق ان جانوروں کے اعضاء میں سے ایک ایسا ہوتا ہے جو انہیں انسان کے آباؤ اجداد ہونے کا ثبوت فراہم کرتا ہے اور وہ ہیں اس کے دو پاؤں۔

بندروں اور انسانوں کی چال ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہوتی ہے۔ انسان وہ واحد مخلوق ہے جو دو پاؤں پر آسانی کے ساتھ چلتی پھرتی ہے۔ کچھ جانور اس طرح چلنے میں محدود اہلیت رکھتے ہیں اور جو اس طرح چل سکتے ہیں ان کے ڈھانچے جھکے ہوتے ہیں۔

اِرتقاء پسندوں کے نزدیک یہ افریقی بندر جھک کر چلتے تھے اور انسانوں کی مانند کھڑے ہو کر نہیں چل سکتے تھے۔ دو پاؤں پر چلنے کی یہ محدود سی صلاحیت اِرتقاء پسندوں کو یہ حوصلہ بخشنے کو کافی تھی کہ یہ مخلوق انسان کے آباؤ اجداد کی تھی۔ تاہم وہ پہلا ثبوت جو اِرتقاء پسندوں کے اس دعوے کی تردید کرتا تھا کہ افریقی بندر دو پایے تھے، بھی اِرتقاء پسندوں ہی کی طرف سے پیش کیا گیا تھا۔ افریقی بندروں کے فوسلز پر کی گئی تحقیق نے اِرتقاء پسندوں کو بھی اس بات کے ماننے پر مجبور کر دیا تھا کہ یہ ''بھی'' بندر نما تھے۔ افریقی بندروں کے فوسلز پر تشریح الاعضاء کے حوالے سے کی گئی مفصل تحقیق نے ۱۹۷۰ء کی دہائی کے وسط میں Charles E.Oxnard کو اس جانور کی جسمانی ساخت نے جدید انسان نما بندر (Orang-utans) کی جسمانی ساخت کی مانند قرار دینے پر آمادہ کر دیا تھا۔

انسانی اِرتقاء پر آج رسمی عقلمندی و دانائی کا ایک اہم حصہ افریقی بندر کے دانتوں، جبڑوں اور کھوپڑی کے ٹکڑوں کے فوسلز کی تحقیق پر مشتمل ہے۔ یہ سب گواہی دیتے ہیں کہ افریقی بندر کا انسانی نسل کے ساتھ قریبی رشتہ و تعلق سچ نہیں ہو سکتا۔ یہ تمام فوسلز گوریلوں، بن مانسوں اور انسانوں سے مختلف ہیں۔ گروہ کی شکل میں تحقیق کی جائے تو افریقی بندر انسان نما بندر سے زیادہ ملتا

چلتا ہے۔

جس بات نے اِرتقاء پسندوں کو زیادہ پریشان کیا وہ یہ دریافت تھی کہ افریقی بندر دو پاؤں پر جھک کر چل نہیں سکتے تھے۔ یہ بات افریقی بندر کے لئے جسمانی طور پر بہت بے اثر ہوتی جس کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ اس کے دو پاؤں ہیں مگر وہ جھک کر چلتا ہے۔ اور وہ ایسا اس لئے کرتا ہے کیونکہ قوت و دانائی کی زیادتی اس بات کا مطالبہ کرتی ہے اور یہ بات اس سے مشروط تھی۔ ۱۹۹۶ء میں کمپیوٹر کے ذریعے جعلسازی کی گئی تھی اور انگریز ماہر قدیم حیاتیات Robin Crompton نے بھی بتایا کہ اس قسم کی ''مخلوط'' چال (ڈگ بھرنا) ممکن نہ تھی۔ وہ اس نتیجے پر پہنچا تھا: ایک جاندار یا تو سیدھا چل سکتا ہے یا چاروں پاؤں پر۔ ان دو کے درمیان چلنا زیادہ عرصے تک برقرار نہیں رکھا جاسکتا کیونکہ اس میں بے حد توانائی خرچ ہوتی ہے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ افریقی بندر کے پاس دونوں چیزیں نہیں ہوسکتی تھیں کہ وہ دو پایہ بھی ہو اور جھک کر بھی چلتا ہو۔

غالباً ۱۹۹۴ء میں ایک محقق ماہر علم تشریح الاعضاء نے جس کا نام Fred Spoor تھا لیور پول یونیورسٹی برطانیہ میں اپنے رفقاء کی ٹیم کے ساتھ اس نہایت اہم تحقیقی مطالعے کو پیش کیا تھا۔ اس کا تعلق انسانی علم تشریح الاعضاء کے شعبے سے اور خلوی حیاتیات سے تھا۔ ان ماہرین نے دو پایہ جانداروں کے فوسلز پر تحقیق کی۔ ان کی تحقیق نے دریافت کیا کہ کان کے حلزونے (COCHLEA) میں پایا جانے والا غیر ارادی توازنِ میکانکی عمل اور جو دریافتیں سامنے آئیں یہ نتیجہ پیش کرتی تھیں کہ افریقی بندر انسان کی مانند دو پایہ نہیں ہوسکتا تھا۔

انسانی سلسلہ (Homo Series): اصل انسان

تصوّراتی انسانی اِرتقاء میں اگلا مرحلہ ''ہومو'' (Homo) ہے یعنی انسانی سلسلہ۔ یہ جاندار انسان ہیں جو جدید دور کے انسانوں سے مختلف نہیں مگر ان میں نسلی امتیازات پائے جاتے ہیں۔ ان امتیازات کو غلو کی حد تک لے جانے کی کوشش میں، اِرتقاء پسند ان لوگوں کو جدید انسان کی ''نسل'' کے طور پر پیش نہیں کرتے بلکہ ایک مخلوق ''نوع'' کے طور پر لاتے ہیں۔ تاہم جیسا کہ ہم جلد دیکھیں گے ''انسانی سلسلے'' کے لوگ عام انسانی نسل کی قسموں کے سوا کچھ بھی نہیں ہیں۔

اِرتقاء پسندوں کی تخیلاتی پرواز کے مطابق انسانی سلسلے کا داخلی تخیلاتی اِرتقاء یہ ہے: سب سے پہلے سیدھے کھڑے ہونے کا انسانی عمل۔ پھر جدید دور کے انسان کا عہد قدیم، اور نینڈرتھل

آدمی (Neanderthal Man) ، ازاں بعد کرومیگن انسان (Cro-Magan Man) اور سب سے آخر میں جدید انسان۔

اِرتقاء پسندوں کے دعووں کے برعکس ، درج بالا تمام Species سوائے اصل انسانوں کے کچھ بھی نہیں ہیں۔ آیئے سب سے پہلے سیدھے کھڑے ہونے کے انسانی عمل کا جائزہ لیتے ہیں جسے اِرتقاء پسندوں نے قدیم ترین انسانی نوع کے طور پر پیش کیا ہے۔

سب سے زیادہ متاثر کرنے والا ثبوت جو یہ بتاتا ہے کہ انسان کا سیدھا کھڑا ہوکر چلنا ایک ''قدیم'' نوع نہیں ہے وہ ''ترکانہ بوائے کا فوسل'' ہے جو سیدھا کھڑا ہوکر چلنے والے انسانی سلسلے کی قدیم ترین باقیات ہے۔ یہ اندازہ لگایا گیا ہے کہ یہ فوسل ایک بارہ سالہ لڑکے کا تھا جو نو بلوغیت میں ۱.۸۳ میٹر لمبا ہوگا۔ اس فوسل کا سیدھا کھڑا ہونے والا ڈھانچہ جدید دور کے انسان کے ڈھانچے سے کچھ مختلف نہیں ہے۔ اس کا لمبا اور دھان پان جسم کا باقی بچا ہوا پنجر بالکل ان لوگوں کے پنجروں جیسا ہے جو آج منطقہ حارہ میں واقع علاقوں میں بستے ہیں۔ یہ فوسل ثبوت کا ایک نہایت اہم ٹکڑا ہے کہ سیدھا کھڑا ہوکر چلنے والا انسان جدید انسانی نسل سے تعلق رکھتا ہے۔ اِرتقاء پسند ماہر قدیم حیاتیات رچرڈ لیکیے سیدھا کھڑا ہوکر چلنے والے انسان کا درج ذیل طور پر جدید انسان سے موازنہ کرتا ہے:

''کھوپڑی کی ساخت ، باہر کو نکلے ہوئے چہرے ، بھنوؤں کا گھنا ہونا وغیرہ میں بھی ہمیں فرق نظر آئے گا۔ جہاں تک جدید انسان کی علیحدہ علیحدہ جغرافیائی نسلوں کا تعلق ہے اس حوالے سے ان امتیازات کا غالباً اب اس قدر اعلان نہیں کیا جاتا جس قدر ہم انہیں دیکھتے ہیں۔ اس قسم کے حیاتیاتی امتیازات اس وقت پیدا ہوتے ہیں جب آبادیوں کو جغرافیائی طور پر ایک دوسرے سے مختلف مدتوں کے لئے جدا جدا کردیا جاتا ہے''۔

لیکیے کہنا یہ چاہتا ہے کہ کھڑے ہوکر چلنے والے انسان اور ہمارے درمیان اس سے زیادہ فرق نہیں جس قدر حبشیوں اور اسکیموؤں کے درمیان ہے۔ کھڑا ہوکر چلنے والے انسانوں کی کھوپڑی کے خدوخال ان کے خوراک کھلانے کے طریقے اور جینیاتی منتقلی ان کے دوسری انسانی نسلوں سے زیادہ لمبے عرصے تک میل جول نہ رکھنے کے نتیجے میں پیدا ہوئے۔

اس بات کا ایک اور مضبوط ثبوت کہ کھڑے ہوکر چلنے والے انسان ''قدیم'' نوع سے تعلق نہیں رکھتے ، اُس وقت سامنے آیا جب اس نوع کے فوسلز جن کی عمر ۲۷ ہزار برس بلکہ ۱۳ ہزار برس

بنتی ہے انہیں زمین کھود کر نکالا گیا تھا۔ ایک مضمون کے مطابق جو ''ٹائم'' میں شائع ہوا، (جو بیشک سائنسی جریدہ نہ تھا مگر سائنسی دنیا پر اس کا بڑا دور رس اثر ہوا۔) کھڑے ہو کر چلنے والے جاندار کے ۲۷ ہزار سالہ قدیم فوسل جزیرہ جاوا سے ملے تھے۔ آسٹریلیا کے دلدلی علاقے Kow میں ۱۳ ہزار سالہ پرانے فوسلز ملے تھے جن میں جدید اور قدیم انسان کی صفات پائی جاتی تھیں۔ ان تمام فوسلز سے پتہ چلتا ہے کہ قدیم انسان آج کے اس عہد سے ماضی قریب تک میں زندہ تھا اور یہ نسل انسانی کے سوا کچھ نہ تھے جواب تاریخ کے اوراق میں دفن ہو چکے ہیں۔

قدیم انسان اور نینڈرتھل آدمی

تصوّراتی اِرتقائی اسکیم میں قدیم انسان عصر حاضر کے انسان کی سابقہ شکل ہے۔ دراصل اِرتقاء پسندوں کے پاس ان انسانوں کے بارے میں کہنے کو زیادہ کچھ موجود نہیں ہے۔ جس کی وجہ یہ ہے کہ ان میں اور دور جدید کے انسان میں زیادہ فرق نہیں ہے۔ چند محققین تو یہاں تک کہتے ہیں کہ اس نسل کے نمائندے تو آج بھی زندہ ہیں۔ اور اس کی مثال پیش کرتے وقت وہ آسٹریلیا کے ابتدائی باشندوں (Aborigines) کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ قدیم انسانوں (Homo Sapiens) کی طرح یہ آسٹریلوی باشندے گھنی اور باہر کی طرف ابھری ہوئی بھنویں رکھتے تھے۔ اور ان کے جبڑے کی ساخت بھی اندر کی جانب جھکی ہوئی تھی۔ اور ان کی کھوپڑی کا حجم بھی قدرے چھوٹا ہوتا تھا۔ مزید یہ کہ کئی قابل ذکر دریافتوں نے یہ انکشاف کیا ہے کہ ایسے لوگ زیادہ عرصہ نہیں ہوا کہ ہنگری اور اٹلی کے کچھ دیہات میں آباد تھے۔

اِرتقاء پسند ان انسانی فوسلز کا حوالہ دیتے ہیں جو ہالینڈ کی نینڈر وادی میں زمین کھود کر نکالے گئے تھے انہیں نینڈرتھل آدمی کہا جاتا ہے۔ بہت سے معاصر محققین نینڈرتھل آدمی کو جدید انسان کی ذیلی نوع قرار دیتے ہیں۔ اور اسے "Homo Sapiens Neandarthal" کہتے ہیں یہ بات یقینی ہے کہ یہ نسل جدید انسانوں کے ساتھ ایک ہی زمانے میں ایک ہی مقام پر آباد تھی۔ جو دریافتیں سامنے آئی ہیں ان کے مطابق نینڈرتھل آدمی اپنے مرنے والوں کو دفن کرتے تھے، آلات موسیقی بناتے تھے اور اسی عہد میں بسنے والے قدیم انسانوں کے ساتھ ان کے تہذیبی و ثقافتی روابط تھے۔ نینڈرتھل آدمی کے فوسلز کی بالکل جدید انسانوں کی جیسی کھوپڑیوں اور پنجر پر کسی قیاس آرائی یا ظن و تخمین سے کام نہیں لیا جا سکتا۔

اس موضوع پر ایک مشہور اتھارٹی ERIK TRINKAUS کی ہے جو نیو میکسیکو یونیورسٹی سے وابستہ ہے۔ وہ لکھتا ہے:

نینڈرتھل کے پنجر کی باقیات کا جدید انسانوں کے پنجر کے ساتھ جزئیات کی حد تک موازنہ کرنے سے پتہ چلا ہے کہ نینڈرتھل کے اعضاء ایسے ہیں جن میں کوئی بھی اہلیت مثلاً نقل و حرکت، چالاکی و ہوشیاری، ذہانت یا لسانی ایسی نہیں جو جدید انسانوں سے کم تر ہو۔

دراصل نینڈرتھل کو جدید انسانوں پر کچھ ''ارتقائی'' فوائد کی برتری حاصل ہے۔ نینڈرتھل کی کھوپڑی جدید انسان کی کھوپڑی کی نسبت بڑی ہوتی ہے۔ اور وہ ہماری نسبت زیادہ تنومند اور اچھے جسم کے مالک ہیں۔ TRINKAUS اس میں اضافہ کرتے ہوئے کہتا ہے:

''نینڈرتھل کے خدوخال میں ایک شے بڑی نمایاں ہے اور وہ ہے ان کے دھڑ اور پٹھوں کی ہڈیوں کا بڑا ہونا۔ وہ تمام ہڈیاں جو محفوظ کر لی گئی تھیں ایک ایسی طاقت کی طرف اشارہ کرتی ہیں جو شاید ہی جدید انسانوں کو میسر آئی ہوگی۔ یہ طاقت نہ صرف مردوں میں پائی جاتی ہے بلکہ یہ بالغ خواتین میں، نوجوانوں اور بچوں تک میں پائی جاتی ہے۔

مختصراً ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ نینڈرتھل وہ خاص نسل انسانی ہے جو وقت کے ساتھ ساتھ دوسری نسلوں کے ساتھ گھل مل گئی تھی۔

اس ساری تفصیل سے پتہ چلتا ہے کہ ''انسانی اِرتقاء'' کا منظر نامہ جسے اِرتقاء پسندوں نے جعلسازی سے تیار کیا تھا ان کے تخیل کی پیداوار ہے ورنہ حقیقت تو یہ ہے کہ انسان ہمیشہ انسان اور بندر ہمیشہ بندر ہی تھے۔

کیا اِرتقاء کی دلیل کے مطابق زندگی اتفاقات اور انطباق سے وجود میں آ سکتی ہے؟

نظریۂ اِرتقاء کا دعویٰ یہ ہے کہ زندگی ایک ایسے خلیے سے وجود میں آئی جو اتفاق سے قدیم ارضی حالات کے تحت متشکل ہو گیا تھا۔ آیئے ہم خلیے کی تشکیل کا سادہ سی نظیر کے ساتھ جائزہ لیتے ہیں تا کہ ہم یہ بتا سکیں کہ خلیے کی موجودگی کو قدرتی مظاہر اور اتفاقات پر محمول کیا جاتا ہے حالانکہ اس کی ساخت جو ابھی تک ویسی ہی ہے کئی لحاظ سے اب بھی اپنی پراسراریت کو قائم رکھے ہوئے ہے، اور ایسا اس وقت ہے جب ہم اکیسویں صدی کی دہلیز پر قدم رکھ رہے ہیں۔ اپنی تمام تر

سرگرمیوں کے نظاموں کے ساتھ جن میں نظام مواصلات، نقل وحمل اور نظم ونسق شامل ہیں ایک خلیہ کسی شہر کی نسبت کم مکمل و پیچیدہ نہیں ہے: اِس کے اندر ایسے پاور سٹیشن ہیں جو اس توانائی کو پیدا کرتے ہیں جسے خلیہ استعمال کرتا ہے، وہ کارخانے استعمال کرتے ہیں جو ایسے خامرے اور ہارمونز پیدا کرتے ہیں جو زندگی کے لئے لازمی ہیں۔ وہ ڈیٹا بنک (Databank) استعمال کرتا ہے جہاں پیدا کی جانے والی تمام مصنوعات کے بارے میں معلومات ریکارڈ ہوتی ہے، پیچیدہ نظام ہائے نقل وحمل اور ایسی پائپ لائنیں جو خام مواد اور پیداواری اشیاء کو ایک مقام سے دوسرے مقام تک لے جاتی ہیں۔ جدید لیبارٹریاں اور ریفائنریاں ہیں جو خارجی خام مواد کو ان کے قابل استعمال حصوں میں توڑتی ہیں اور اندر آنے اور باہر جانے والے مواد کو کنٹرول کرنے کے لئے خصوصی خلوی جھلی دار لحمیات ہیں۔ اور یہ اس ناقابل یقین حد تک پیچیدہ نظام کا ایک چھوٹا سا حصہ تشکیل دیتی ہیں۔

قطع نظر اس بات کے کہ یہ خلیہ قدیم ارضی حالات کے تحت متشکل ہوا، اس کی تالیف اور میکانکی نظام کو ہمارے عہد کی جدید تجربہ گاہوں میں بھی ترکیب نہیں دیا جاسکتا۔ خلیے کے امینو ترشوں اور تعمیری سہاروں کے استعمال سے بھی یہ ممکن نہیں ہے کہ مکمل خلیہ تو کجا خلیے کا واحد عضو مثلاً خیطی ریزہ (Mitochondria) یا رائبوسوم (Ribosome) ہی بنایا جاسکے۔ پہلا خلیہ جو نظریۂ اِرتقاء کے دعوے کے مطابق اتفاق سے پیدا ہو گیا تھا اسی طرح تخیل کی پیداوار ہے جیسے داستانی یا فرضی حیوان۔

لحمیات اتفاق یا انطباق کیلئے ایک چیلنج ہے

اور صرف ایک خلیہ ہی پر موقوف نہیں: ان ہزاروں پیچیدہ و جامع لحمیاتی سالموں میں سے ایک کا بھی قدرتی حالات کے تحت اتفاقاً وجود میں آجانا ناممکن ہے۔

لحمیات بہت بڑے سالمے ہوتے ہیں جو اُن امینوترشوں پر مشتمل ہوتے ہیں جو مختلف مقداروں اور ساختیاتی جسموں کے ساتھ ایک خاص ترتیب میں پائے جاتے ہیں۔ یہ سالمے ایک جاندار خلیے کے تعمیری سہاروں سے بنتے ہیں۔ سادہ سا خلیہ بھی ۵۰ امینوترشوں سے بنتا ہے لیکن کچھ لحمیات ایسے ہوتے ہیں جن میں ہزاروں امینوترشے ہوتے ہیں۔ جاندار خلیوں میں ایک لحمیے کی ساخت میں کسی ایک امینوترشے کی کمی، بیشی یا تبدیلی، جن میں سے ہر ایک کا ایک خاص کام

ہوتا ہے لحمیے کو ایک بیکار سالماتی ڈھیر میں بدل دیتی ہے۔ نظریۂ اِرتقاء جب امینو ترشوں کی ''اتفاقیہ تشکیل'' کا مظاہرہ کرنے میں ناکام رہتا ہے تو لحمیات کی تشکیل کے معاملے میں بھی اسے مایوسی ہوتی ہے۔

بیس مختلف امینو ترشے ہیں۔ اگر ہم یہ فرض کرلیں کہ ایک اوسط سائز کا لحمیاتی سالمہ ۲۸۸ امینو ترشے رکھتا ہے تو ترشوں کے ''۳۰۰ ۱۰ مختلف مجموعے ہوتے ہیں۔ ان تمام ممکنہ ترتیبوں میں صرف ایک ترتیب ایسی ہوتی ہے جو مطلوبہ لحمیاتی سالمے کو متشکل کرتی ہے۔ بقیہ امینو ترشوں کی زنجیریں ہوتی ہیں جو یا تو بالکل بیکار ہوتی ہیں یا جانداروں کے لئے امکانی طور پر ضرر رساں۔ دوسرے لفظوں میں مذکورہ بالا صرف ایک لحمیاتی سالمے کی اتفاقیہ تشکیل کا امکان ''۳۰۰ ۱۰ میں سے ا'' رہ جاتا ہے۔ اس ''ا'' کے واقع ہونے کا امکان کہ یہ ایک ''فلکیاتی'' تعداد میں سے جو اپر مشتمل ہو اور جس کے بعد ۳۰۰ صفر آتے ہوں عملاً ناممکن ہے۔ مزید یہ کہ ایک لحمیاتی سالمہ جس میں ۱۲۸۸ امینو ترشے ہوں، اس کا اگر کچھ قوی ہیکل لحمیاتی سالموں کے ساتھ موازنہ کیا جائے جن میں ہزاروں امینو ترشے ہوتے ہیں تو وہ ان کے مقابلے میں بہت چھوٹا سا دکھائی دے گا۔ جب ہم اس امکانی صورت کے اندازوں کو ان قوی ہیکل لحمیاتی سالموں پر منطبق کرتے ہیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ لفظ ''ناممکن'' بھی موزوں نہیں دکھائی دیتا۔

اگر ان لحمیات میں سے ایک کا بھی اتفاقاً وجود میں آجانا ناممکن ہو تو ان ایک ملین لحمیات کے لئے ایک خاص ترتیب سے اتفاقاً یکجا ہو جانا کئی بلین مرتبہ زیادہ ناممکن ہو جاتا ہے کہ وہ ایک مکمل انسانی خلیے کو بنا سکیں۔ پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ ایک خلیہ کسی بھی وقت لحمیات کا محض ایک ڈھیر نہیں ہوتا۔ لحمیات کے علاوہ ایک خلیے میں مرکزائی ترشے (Nucleic acids) بھی شامل ہوتے ہیں، کاربوہائیڈریٹ بھی، شحمے (Lipids) وٹامنز اور بہت سے کیمیائی مادے مثلاً برق پاش جو ایک خاص تناسب اور ہم آہنگی سے ترتیب دیئے جاتے ہیں۔ ان کے ڈیزائن میں بھی ساخت اور کام دونوں اعتبار سے ایک خاص تناسب اور ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔ ان میں سے ہر ایک مختلف خلوی اعضاء میں تعمیری سہارے یا ایک جزو ترکیبی کے طور پر کام کرتا ہے۔ جیسا کہ ہم نے دیکھا کہ ایک خلیے کے کئی ملین لحمیات میں سے صرف ایک کے متشکل ہونے کے بارے میں اِرتقاء پسند کچھ نہیں بتا سکتا۔

ترکی کے Dr. Ali Demirsoy جو اپنے وطن میں اِرتقاء پسندانہ فکر کے حوالے سے

ایک بہت بڑی اتھارٹی تصوّر کیے جاتے ہیں، خلوی رنگتوں (Cytochrome-C) جو زندگی کے لئے لازمی ہوتی ہیں کی اتفاقیہ تشکیل کے امکان پر اپنی کتاب "Kalitimve Evrim" (موروثیت اور اِرتقاء) میں بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

ایک Cytochrome-C کے ترتیب کے ساتھ متشکل ہونے کا امکان صفر کے برابر ہے۔اس کے معنی یہ ہیں کہ اگر زندگی کو ایک خاص نظم و ترتیب کی ضرورت ہے تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ پوری کائنات میں صرف ایک بار اس کے حصول کا امکان ہے وگرنہ کچھ مابعد الطبیعاتی قوتیں ایسی ہیں (جن کی تشریح ہمارے بس میں نہیں) جنہوں نے اس کو متشکل کرنے میں اپنا کردار ادا کیا ہوتا۔ مؤخر الذکر کو تسلیم کر لینا سائنسی اہداف کے حصول کے لئے موزوں نہیں ہے۔اس لئے ہمیں پہلے مفروضے کی طرف دیکھنا ہوگا۔

ان سطور کے بعد Dr. Demirsoy یہ تسلیم کرتا ہے کہ یہ امکانیت کس قدر غیر حقیقی ہے جسے اس نے صرف اس لئے تسلیم کر لیا تھا کیونکہ یہ ''سائنس کے اہداف کے لئے زیادہ موزوں تھی''۔

CYtochrome-C (خلوی رنگتوں) کو ایک خاص ترتیب کے ساتھ مخصوص امینو ترشوں کی فراہمی کا امکان اسی قدر کم ہے جس قدر ایک بندر کے تاریخ انسانیت کے ایک ٹائپ مشین پر لکھنے کا۔اس بات کو بلا حیل و حجت تسلیم کر لیا جانا چاہئے کہ بندر ٹائپ مشین کی کلیدوں پر الل ٹپ پنجے مارے گا۔

جانداروں میں موجود لحمیاتی سالمے کے متشکل ہونے کے لئے موزوں امینو ترشوں کا صحیح ترتیب میں ہونا ہی کافی نہیں ہے۔اس کے علاوہ ان ۲۰ امینو ترشوں میں سے ہر ایک کا بایاں ہاتھ استعمال کرنا ضروری ہے جو لحمیات کی تالیف میں موجود ہوں۔ کیمیائی طور پر دو مختلف قسم کے امینو ترشے ہوتے ہیں جنہیں ''بائیں ہاتھ والے'' اور ''دائیں ہاتھ والے'' کہا جاتا ہے ان میں فرق اس Mirror Symmetry کا ہوتا ہے جو ان کے سہ جہتی اجسام میں ہوتا ہے جو ایک انسان کے دائیں اور بائیں ہاتھ جیسا ہوتا ہے۔دونوں قسموں کے یہ امینو ترشے نیچر میں مساوی تعداد میں پائے جاتے ہیں اور وہ بڑی عمدگی کے ساتھ ایک دوسرے سے مل جاتے ہیں۔تاہم ایک حیرت انگیز حقیقت تحقیق کے ذریعے سامنے آئی ہے: جانداروں کی ساخت میں شامل تمام لحمیات میں بائیں ہاتھ والے امینو ترشے پائے جاتے ہیں۔اگر کسی لحمیے کی ساخت میں ایک بھی دائیں ہاتھ

والا امینو ترشہ رہ جائے تو وہ اسے بیکار بنا دیتا ہے۔

آیئے ہم یہ فرض کر لیتے ہیں کہ زندگی اتفاق سے وجود میں آ گئی تھی جیسا کہ اِرتقاء پسندوں کا دعویٰ ہے۔ اس صورت میں دائیں اور بائیں ہاتھ والے امینو ترشے نیچر میں تقریباً یکساں تعداد میں ہونے چاہئیں تھے۔ لحمیات کس طرح تمام امینو ترشوں میں سے صرف بائیں ہاتھ والے امینو ترشے چن لیتے ہیں اور زندگی کے عمل میں ایک بھی دائیں ہاتھ والا امینو ترشہ کیوں شامل نہیں ہو پاتا، اِرتقاء پسندوں کو یہ سوال بہت پریشان کیے ہوئے ہے۔

برطانیکا سائنس انسائیکلوپیڈیا میں، جو اِرتقاء کا پُرجوش محافظ ہے، یہ لکھا ہوا ہے کہ کرۂ ارض پر موجود تمام جاندار نامیوں کے امینو ترشے اور پیچیدہ کثیر سالمی مرکبات کے تعمیری سہارے مثلاً لحمیات میں وہی بائیں ہاتھ والا تناسب اور خوبصورتی پائی جاتی ہے اس میں اضافہ کر کے کہا جائے تو بات یہ بنتی ہے کہ یہ ایک سکے کو کئی ملین بار ہوا میں پھینکنا ہے جو ہر بار اس طرح زمین پر گرتا ہے کہ اس کا ''سر'' والا حصہ ہی جیتنے والے کے حصے میں آتا ہے۔ اسی انسائیکلوپیڈیا میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ یہ بتانا ممکن نہیں ہے کہ سالمے بائیں یا دائیں ہاتھ والے کیوں بن جاتے ہیں اور اس انتخاب کو بڑے مسحور کن انداز میں کرۂ ارض پر موجود زندگی کے ساتھ ملا دیا گیا ہے۔

امینو ترشوں کے لئے یہ کافی ہے کہ ان کو صحیح تعداد، صحیح ترتیب اور مطلوبہ سہ جہتی ساختیاتی جسموں میں رکھا جائے۔ ایک لحمیے کی تشکیل یہ بھی چاہتی ہے کہ ایسے سالماتی امینو ترشے جن کا ایک سے زیادہ بازو ہو مختلف بازوؤں کے ذریعے ایک دوسرے کے ساتھ جوڑ دیئے جائیں۔ اس قسم کے ملاپ کو ''پپٹائیڈ ملاپ'' کا نام دیا گیا ہے۔ امینو ترشے ایک دوسرے کے ساتھ مختلف بندھنوں میں جکڑے جا سکتے ہیں مگر لحمیات صرف اور صرف ان امینو ترشوں سے مل کر بنتے ہیں جن کو ''پپٹائیڈ ملاپ'' کے ذریعے جوڑ دیا جاتا ہے۔

تحقیق نے یہ بات منکشف کی ہے کہ وہ امینو ترشے جو الل ٹپ اکٹھے ہو جاتے ہیں وہ ۵۰% کے تناسب سے ''پپٹائیڈ ملاپ'' سے یکجا ہوتے ہیں اور بقیہ دیگر ان بندھنوں کے ساتھ یکجا ہو جاتے ہیں جو لحمیات میں موجود نہیں ہوتے۔ صحیح طور پر کام کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ ہر وہ امینو ترشہ جو ایک لحمیہ بنا رہا ہے صرف اس پپٹائیڈ ملاپ کے ساتھ اسی طرح شامل ہو کہ اسے صرف بائیں ہاتھ والے امینو ترشوں سے انتخاب کرنا ہے۔ بے شک ایسا کوئی کنٹرول میں رکھا جانے والا میکانکی عمل نہیں ہے جس کے ذریعے انتخاب کرتے وقت دائیں ہاتھ والے امینو ترشوں

کو باقی رہنے دیا جائے، اور ذاتی طور پر یہ یقین کرلیا جائے کہ ہر امینو ترشہ دوسرے امینو ترشے کے ساتھ بپٹائڈ ملاپ کے ذریعے یکجا ہو گیا ہے۔

ان حالات میں ایک اوسط درجے کے لحمیاتی سالمے کے لئے جس میں ۵٠٠ امینو ترشے صحیح مقدار اور ترتیب کے ساتھ رکھے ہوئے ہوتے ہیں اور اس بات کا امکان ہوتا ہے کہ اس میں شامل تمام امینو ترشے صرف بائیں ہاتھ والے ہیں اور ان کو صرف بپٹائڈ ملاپوں کے ذریعے یکجا کیا گیا ہے۔ یہ ترتیب اور مقدار درج ذیل ہونی چاہئے:

......صحیح ترتیب میں ہونے کا امکان = $۱/۲٠^{۵٠٠} = ۱/۱٠^{۶۵٠}$

......بائیں ہاتھ والے ہونے کا امکان = $۱/۲^{۵٠٠} = ۱/۱٠^{۶۵٠}$

......"پپٹائڈ ملاپ" کے ذریعے یکجا ہونے کا امکان = $۱/۲^{۴۹۹} = ۱/۱٠^{۱۵٠}$

میزان امکانیت = $۱/۱٠^{۹۵٠}$ یعنی "۱" امکان $۱٠^{۹۵٠}$ پر

جیسا کہ نیچے دکھایا جا رہا ہے ایک لحمیاتی سالمے کے ۵٠٠ امینو ترشوں سے تشکیل کا امکان "۱" ہے جو اکے بعد ۹۵٠ صفر ڈالنے کے بعد بنتا ہے اور یہ وہ تعداد ہے جو انسانی ذہن کے ادراک سے باہر ہے۔ اور یہ وہ امکانیت ہے جو صرف کاغذ پر ہے۔ عملاً اس بات کے ممکنہ حصول کا امکان صفر ہے۔ ریاضی کا فارمولا استعمال کیا جائے تو وہ امکانیت جو $۱/۱٠^{۵٠}$ سے کم ہو وہ اعداد و شمار کے

ایک اس اوسط لحمیاتی سالمے کا امکان، جو ۵٠٠ امینو ترشوں سے بنتا ہے، جنہیں صحیح تعداد میں، ایک خاص ترتیب کے ساتھ رکھا جاتا ہے۔ تمام امینو ترشوں کے امکان کے علاوہ اس میں صرف بائیں ہاتھ والے ہوتے ہیں اور انہیں پیپٹائڈ بندھنوں سے اکٹھا کیا جاتا ہے۔ یہ "lover$۱٠^{۹۵٠}$" ہوتا ہے۔ ہم اس عدد کو درج ذیل طریقے سے لکھ سکتے ہیں، جو "۱" کے بعد ۹۵٠ صفر ڈالنے سے بنتا ہے۔

$$۱٠^{۹۵٠} =$$

۱٠٠,٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠
٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠
٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠
٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠
٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠
٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠
٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠
٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠
٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠
٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠
٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠
٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠
٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠
٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠
٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠
٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠
٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠,٠٠٠

اعتبار سے قابل حصول ہونے کی ''صفر'' امکانیت رکھتی ہے۔

جب ایک ایسے لحمیاتی سالمے کے متشکل ہونے کی امکانیت اس حد تک پہنچ جاتی ہے جو ۵۰۰ امینوترشوں سے بنتا ہے تو ہم ذہنی حدود کو زیادہ سطح کی عدم امکانیات کی جانب دھکیل دیتے ہیں۔ ''ہوموگلوبین'' سالمے میں، جو ایک اہم لحمیہ ہوتا ہے، ۵۷۴ امینوترشے ہوتے ہیں جو ان امینو ترشوں سے زیادہ ہوتے ہیں جو مذکورہ بالا لحمیہ بناتے ہیں۔ اسے اپنے جسم کے سرخ خون کے کئی بلین خلیوں میں سے صرف ایک تصور کریں۔ انسانی جسم میں ۲۸۰,۰۰۰,۰۰۰ (۲۸۰ ملین) ہوموگلوبین سالمے ہوتے ہیں۔ فرض کیجئے یہی ایک سرخ خون کا خلیہ ہے۔ اس کرۂ ارض کی عمر ایک واحد لحمیے کو بھی ''سعی وخطا'' (Trial & error) کے طریقے سے متشکل کرنے کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ اس ساری گفتگو سے نتیجہ یہ اخذ کیا جاتا ہے کہ ارتقاء امکانیت کی ایک خطرناک کھائی میں اسی وقت گر جاتا ہے جب ایک لحمیہ متشکل ہو رہا ہو۔

تخلیق زندگی کے بارے میں جوابات کی تلاش

اتفاقاً وجود میں آ جانے والی زندگی کے امکان سے متعلق پائے جانے والے شدید اختلافات سے بخوبی باخبر ہوتے ہوئے ارتقاء پسند اپنے اعتقادات کے بارے میں کوئی بھی استدلالی تشریح یا وضاحت پیش نہ کر سکتے تھے جس کی وجہ سے وہ اس کوشش میں لگے رہتے تھے کہ ایسے طریقے اختیار کریں جن سے یہ ظاہر کر سکیں کہ اختلافات کچھ زیادہ حوصلہ شکن نہ تھے۔

تجربہ گاہوں میں کئی تجربات کئے گئے تھے تاکہ اس سوال کا جواب دیا جا سکے کہ بے جان مادے سے زندگی کیسے وجود میں آ گئی تھی۔ ان تجربات میں سے سب سے زیادہ معروف اور عزت کی نگاہ سے دیکھا جانے والا تجربہ ''ملر تجربہ'' یا ''یورے ملر تجربہ'' کہلاتا ہے جو ایک امریکی محقق سٹینلے ملر نے ۱۹۵۳ء میں کیا تھا۔

یہ ثابت کرنے کی غرض سے کہ امینوترشے اتفاقاً وجود میں آ گئے ہوں گے ملر نے اپنی تجربہ گاہ میں ایک ماحول تیار کیا جو اس کے خیال میں قدیم کرۂ ارض پر کبھی موجود تھا (جو بعد میں غیر حقیقی ثابت ہوا تھا) اور پھر وہ اپنے تجربے میں مصروف ہو گیا تھا۔ جو آمیزہ اس نے اس قدم ارضی ماحول کے لئے استعمال کیا اس میں ایمونیا، میتھین، ہائیڈروجن اور آبی بخارات شامل تھے۔

ملر جانتا تھا کہ قدرتی حالات کے تحت میتھین، ایمونیا، ہائیڈروجن اور آبی بخارات ایک

دوسرے پر کوئی ردعمل ظاہر نہیں کریں گے۔ وہ یہ جانتا تھا کہ ردعمل پیدا کرنے کے لئے اسے آمیزے میں توانائی داخل کرنی تھی۔ اس نے تجویز کیا کہ یہ توانائی قدیم ترین زمین کے کرۂ ہوائی میں بجلی کی چمک سے حاصل کی گئی ہوگی اور اس مفروضے پر انحصار کرتے ہوئے اس نے اپنے تجربات میں مصنوعی برقی اخراج سے کام لیا تھا۔

ملر نے ایک ہفتے تک اس گیسی آمیزے کو ۱۰۰ اسی پر اُبالا تھا اور اس کے ساتھ ہی اس نے کمرے میں برقی رو چھوڑ دی تھی۔ ملر نے ایک ہفتہ گزرنے کے بعد تجربہ گاہ کے اندر بننے والے کیمیائی مادوں کا تجزیہ کیا۔ اسے معلوم ہوا کہ ۲۰ امینوترشوں میں سے لحمیات کے بنیادی عناصر کو تشکیل دینے والے تین امینوترشے مرکب سازی کر چکے تھے۔

اس تجربے سے اِرتقاء پسندوں کو بڑا حوصلہ ملا اور اسے ایک نمایاں کامیابی سمجھا گیا تھا۔ اس خیال سے ہمت پا کر کہ اس تجربے نے ان کے نظریے کی تصدیق کر دی ہے اِرتقاء پسندوں نے فوراً نئے منظرنامے پیش کر دیئے تھے۔ ملر نے قیاساً یہ ثابت کر دیا تھا کہ امینوترشے ازخود متشکل ہو سکتے تھے۔ اس پر بھروسہ کرتے ہوئے بعد کے مراحل تیزی کے ساتھ قیاس میں لائے گئے تھے۔ اس منظرنامے کے مطابق بعد ازاں امینوترشے حادثے کے طور پر ایک خاص ترتیب سے یکجا ہو گئے تھے تاکہ لحمیات کی تشکیل کر سکیں۔ اس طرح اتفاقاً وجود میں آنے والے لحمیات میں سے کچھ نے اپنے آپ کو ان ساختیاتی اجسام کی مانند خلوی جھلی کے اندر رکھ لیا تھا جو کسی طرح وجود میں آ گئے تھے اور ایک قدیم خلیے کی شکل اختیار کر لی تھی۔ ایک خاص وقت کے اندر یکجا ہو کر ان خلیوں نے جاندار نامیوں کی شکل اختیار کر لی تھی۔ اس منظرنامے کا سب سے بڑا سہارا ملر کا تجربہ تھا۔

تاہم ملر کا تجربہ اس کے سوا کچھ بھی نہیں تھا کہ جو کئی پہلوؤں سے باطل ثابت ہو چکا تھا۔

ملر کا تجربہ باطل وغیر معتبر تھا

ملر کے تجربے کو اب نصف صدی گزر چکی ہے اور اسے بہت سے پہلوؤں سے باطل اور غیر معتبر قرار دیا جا چکا ہے مگر اِرتقاء پسند ہیں کہ اب بھی اسے ایک ثبوت کے طور پر پیش کر رہے ہیں کہ زندگی بے جان مادے سے اچانک وجود میں آ سکتی تھی۔ جب ملر کے تجربے کا بلا کسی تعصب کے ناقدانہ جائزہ لیا جائے اور اِرتقاء پسندوں کے موضوعی نقطہ نظر کو سامنے رکھا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ صورتحال اتنی بھی اُمید افزا نہیں جس قدر وہ چاہتے ہیں کہ ہم سمجھ لیں۔ ملر کا ہدف یہ ثابت

کرنا تھا کہ قدیم ترین ارضی حالات کے تحت امینو ترشے خود بخود متشکل ہو سکتے تھے۔ کچھ امینو ترشے پیدا کئے گئے تھے مگر ہم دیکھیں گے کہ یہ تجربہ اس ہدف سے کئی پہلوؤں سے خود متصادم نظر آتا ہے۔

ایک میکانکی عمل استعمال کرنے سے جسے ''سرد پھندا'' کہا گیا ملر نے امینو ترشوں کو متشکل ہوتے ہی ان کے ماحول سے جدا کر دیا تھا۔ اگر اس نے ایسا نہ کیا ہوتا تو ماحول کے حالات نے سالموں کو فوراً نیست و نابود کر دیا ہوتا۔

یہ فرض کرنا بالکل بے معنی نظر آتا ہے کہ اس قسم کا کوئی شعوری میکانکی عمل قدیم ارضی حالات کے تحت ایسا تھا جس میں بالائے بنفشی شعاعوں، بجلی کے کڑکوں، مختلف کیمیائی مادوں، اور زیادہ فیصد آزاد آکسیجن شامل تھے۔ اور اس قسم کے میکانکی عمل کے بغیر کوئی بھی امینو ترشہ جو متشکل ہونے میں کامیاب ہو گیا ہوتا فوری طور پر تباہ کر دیا گیا ہوتا۔ ملر نے اپنے تجربے میں جس قدیم ارضی ماحول کو پیدا کرنا چاہا وہ حقیقت پر مبنی نہ تھا۔ نائٹروجن اور کاربن ڈائی آکسائڈ کو قدیم ارضی کرۂ ہوائی کے عناصر ترکیبی میں شامل ہونا چاہئے تھا مگر ملر نے اسے نظر انداز کر دیا تھا اور ان کی جگہ اس نے میتھین اور ایمونیا استعمال کی تھی۔

ایسا کیوں؟ اِرتقاء پسند اس بات پر کیوں مصر تھے کہ قدیم ارضی کرۂ ہوائی میں میتھین (CH_4)، ایمونیا (NH_3) اور آبی بخارات (H_2O) کی زیادہ مقدار شامل تھی۔ جواب بالکل سیدھا سادہ ہے: ایمونیا کے بغیر ایک امینو ترشے کی مرکب سازی ناممکن تھی۔ Kevin Mc kean اپنے ایک مضمون میں، جو Discover رسالے میں شائع ہوا اس بارے میں لکھتا ہے:

ملر اور یورے نے زمین کے قدیم کرۂ ہوائی کی نقالی کے لئے میتھین اور ایمونیا کا آمیزہ استعمال کیا۔ ان کے نزدیک یہ زمین دھات، چٹانوں اور برف کا ہم صورت آمیزہ تھا۔ تاہم بعد کے تحقیقی جائزوں سے پتہ چلا کہ اس زمانے میں زمین بے حد گرم تھی اور یہ پگھلے ہوئے نکل اور لوہے سے مل کر بنی تھی۔ اس لئے اس زمانے کا کیمیائی کرۂ ہوائی زیادہ تر نائٹروجن (N_2) کاربن ڈائی آکسائڈ (Co_2) اور آبی بخارات (H_2O) سے مل کر بنا چاہئے تھا تاہم نامیاتی سالموں کے لئے یہ میتھین اور ایمونیا کی نسبت زیادہ موزوں نہیں ہے۔

ایک طویل خاموشی کے بعد ملر نے خود بھی اس بات کا اعتراف کر لیا تھا کہ اس نے اپنے تجربے میں جو کرۂ ہوائی سے متعلق ماحول استعمال کیا تھا وہ حقیقت پر مبنی نہیں تھا۔

ایک اور اہم بات جو ملر کے تجربے کو باطل ٹھہراتی ہے، یہ ہے کہ تمام امینو ترشوں کو اس وقت کرۂ ہوائی کے اندر تباہ کرنے کے لئے کافی آکسیجن موجود تھی جب یہ سمجھ لیا گیا تھا کہ وہ متشکل ہو چکے ہیں۔ اس آکسیجن کی موجودگی کو امینو ترشوں کے متشکل ہونے کی راہ میں مزاحم ہونا چاہئے تھا۔ یہ صورت حال ملر کے اس تجربے کی مکمل طور پر نفی کرتی ہے جس میں آکسیجن کو مکمل طور پر نظر انداز کر دیا گیا تھا۔ اگر اس تجربے میں آکسیجن استعمال کر لی گئی ہوتی تو میتھین کاربن ڈائی آکسائڈ اور پانی میں تحلیل ہو گئی ہوتی۔ اور ایمونیا، نائٹروجن اور پانی میں تحلیل ہو گئی ہوتی۔

دوسری طرف قابل غور بات یہ ہے کہ اس زمانے میں اوزون کی تہ ابھی تک موجود نہ تھی اور زمین پر کوئی نامیاتی سالمہ زندہ نہیں رہ سکتا تھا اس لئے کہ وہ تو شدید بالائے بنفشی شعاعوں سے بالکل غیر محفوظ تھی۔

چند امینو ترشوں کے علاوہ جو زندگی کے لئے لازمی ہیں ملر کے تجربے نے بہت سے نامیاتی ترشے پیدا کئے تھے جن میں ایسی خاصیتیں موجود تھیں جو جانداروں کی ساخت اور کام کے لئے بہت ضرر رساں اور مہلک ہوتی ہیں۔ اگر امینو ترشوں کو الگ نہ کر لیا گیا ہوتا اور انہیں اسی ماحول میں ان کیمیائی مادوں کے ساتھ نہ چھوڑ دیا گیا ہوتا تو کیمیائی ردعمل کی وجہ سے ان کی تباہی اور مختلف آمیختوں میں ان کی منتقلی ناگزیر تھی۔ مزید یہ کہ دائیں ہاتھ والے امینو ترشے زیادہ تعداد میں متشکل ہو گئے تھے۔ صرف ان امینو ترشوں کی موجودگی ہی کافی تھی جو اس نظریے کو اس کے تمام استدلال کے باوجود مسترد کرتی تھی۔ اس لئے کہ دائیں ہاتھ والے امینو ترشے ان امینو ترشوں میں سے تھے جو جاندار نامیاتی اجسام کی تالیف میں کام کرنا چھوڑ دیتے ہیں اور جو لحمیات کو اس وقت بیکار ٹھہرا دیتے ہیں جب وہ ان کی تالیف میں مصروف ہوتے ہیں۔

اس ساری گفتگو کا لب لباب یہ ہے کہ ملر کے تجربے میں جن حالات میں امینو ترشے متشکل ہوئے تھے وہ زندگی کے لئے موزوں نہ تھے۔ سچ تو یہ ہے کہ اس واسطے (medium) نے ایک تیزابی آمیزے کی شکل اختیار کر لی تھی جس نے ان مفید سالموں کو تباہ کر دیا تھا اور ان کی تکسید کر دی تھی جن کو حاصل کر لیا گیا تھا۔

جیسا کہ وہ اس بات کے خوگر ہیں ارتقاء پسند اس ''تجربہ'' کو سامنے لا کر خود ہی نظریۂ ارتقاء کو مسترد کرتے رہتے ہیں۔ اگر یہ تجربہ کچھ ثابت بھی کرتا ہے تو وہ اس قدر ہے کہ امینو ترشے صرف ایک زیر کنٹرول تجربہ گاہ کے ماحول میں پیدا کئے جا سکتے ہیں جہاں ایک مخصوص قسم کے حالات

خاص طور پر شعوری مداخلت سے پیدا کئے جاتے ہیں۔

گویا یہ تجربہ ظاہر کرتا ہے کہ جو کچھ (یہاں تک کہ امینو ترشوں کی "مختصر زندگی" Near Life بھی) زندگی کو وجود میں لاتا ہے وہ غیر شعوری اتفاق نہیں ہوسکتا بلکہ کسی کی ایک شعوری مرضی سے ایسا ہوتا ہے جسے ایک لفظ میں تخلیق کہہ سکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ تخلیق کا ہر مرحلہ زندگی کے وجود اور اللہ کے جلیل القدر ہونے کا ثبوت پیش کرتا ہے۔

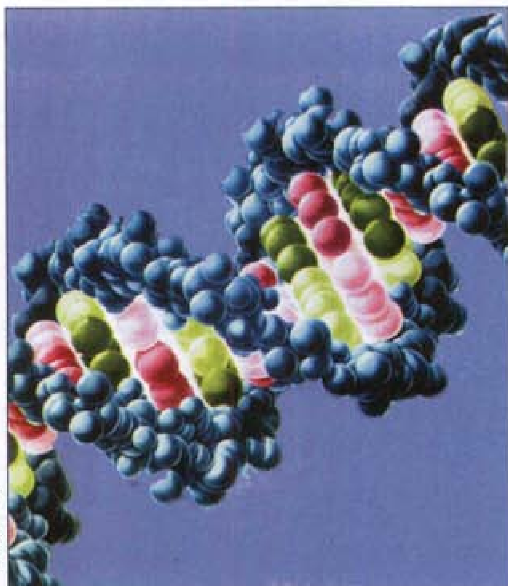
ڈی این اے (DNA): حیرت انگیز سالمہ

نظریۂ اِرتقاء ان سالموں کی موجودگی کی منطقی وضاحت پیش کرنے میں ناکام رہا ہے جو ایک خلیے کی بنیاد ہوتے ہیں نہ ہی وہ جینیات کی سائنس اور نیوکلینی ترشوں کی دریافت (DNA & RNA) کی وضاحت کر سکے ہیں، جنہوں نے نظریۂ اِرتقاء کے لئے بالکل نئے مسائل پیدا کر دیئے ہیں۔

۱۹۵۵ء میں ڈی این اے پر دو سائنسدانوں جیمز واٹسن اور فرانسس کرک کے کام نے حیاتیات میں ایک نئے عہد کا آغاز کیا تھا۔ بہت سے سائنسدانوں نے ان کی توجہ جینیات کی سائنس کی طرف مبذول کرائی تھی۔ آج برسوں کی تحقیق کے بعد ڈی این اے کی ساخت کافی حد تک منکشف ہوگئی ہے۔

اب ہم ڈی این اے کی ساخت اور کام پر بنیادی معلومات دینا چاہیں گے:

وہ سالمہ جسے ڈی این اے کہتے ہیں اور جو ہمارے جسم کے ۱۰۰ ٹریلین خلیوں میں سے ہر ایک میں پایا جاتا ہے، اس میں مکمل انسانی جسم کی تعمیر کا منصوبہ ہوتا ہے۔ ایک خاص کوڈ پر مشتمل نظام کے ذریعے کسی انسان کی تمام صفات سے متعلق معلومات، جسمانی خدوخال سے لے کر داخلی اجزاء کی ساخت تک ریکارڈ کر لی جاتی ہیں۔ ڈی این اے میں موجود وہ معلومات چار خاص بنیادوں کی ترتیب کے اندر رمزی صورت میں (Coded) ریکارڈ کر لی جاتی ہے، جو اس سالمے کو وجود بخشتی ہے۔ ان بنیادوں کو اے، ٹی، جی اور سی، ان کے ناموں کے ابتدائی حروف کے لحاظ سے پکارا جاتا ہے۔ ان حروف کی ترتیب میں جو فرق ہوتا ہے وہی فرق لوگوں کی جسمانی ساخت میں ہوتا ہے۔ ایک اندازے کے مطابق ۳.۵ بلین نیوکلیوٹائیڈ (Nucleotides) ہوتے ہیں یعنی ایک ڈی این اے سالمے میں ۳.۵ بلین حروف ہوتے ہیں۔



ڈی این اے سالمہ اپنے
دوہرے پیچیدار ساختیاتی
جسم کے ساتھ

ڈی این اے کا ایک خاص عضو یا لحمیہ ان خصوصی عناصر ترکیبی میں شامل ہوتا ہے جن کو ''جین'' (Genes) کہا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر آنکھ سے متعلق معلومات خصوصی جینز کے ایک پورے سلسلے میں پائی جاتی ہیں جبکہ قلب سے متعلق معلومات ایک دوسرے جینز کے سلسلے میں پائی جاتی ہے۔ خلیے میں لحمیے کی پیداوار ان جینز میں شامل معلومات کو استعمال کر کے حاصل کی جاتی ہے۔ وہ امینو ترشے جو ایک لحمیے کی ساخت کو ترکیب دیتے ہیں انہیں ڈی این اے میں موجود تین نیوکلیوٹائیڈز (Nucleotides) کی ترتیب و تنظیم سے واضح کیا جاتا ہے۔

اس مقام پر ایک اور اہم تفصیل توجہ طلب نظر آتی ہے۔ اگر ان نیوکلیوٹائیڈز کی ترتیب میں غلطی سرزد ہو جائے، جو ایک جین بناتے ہیں تو اس سے جین مکمل طور پر بیکار ہو جائے گا۔ جب یہ تصور کر لیا جائے کہ انسانی جسم میں ۲۰۰ ہزار جین ہیں تو یہ بات اور زیادہ عیاں ہو جاتی ہے کہ ان کئی ملین نیوکلیوٹائیڈز کے لئے کس قدر ناممکن ہو جاتا ہے، جو یہ جین بناتے ہیں کہ وہ صحیح ترتیب میں اتفاقاً متشکل ہو جائیں۔ ایک اِرتقاء پسند ماہر حیاتیات فرنک سیلسبری (Frank Salisbury) اس ناممکنہ بات پر یوں تبصرہ کرتا ہے:

ایک درمیانے لحمیے میں ۳۰۰ امینو ترشے شامل ہو سکتے ہیں۔ ایک جین جو اسے کنٹرول کر رہا ہو اس کی زنجیر میں تقریباً ۱۰۰۰ نیوکلیوٹائیڈز ہو سکتے ہیں۔ ایک ڈی این اے زنجیر میں چونکہ چار قسم

کے نیوکلیوٹائیڈز ہوتے ہیں جن میں سے ایک میں ۱۰۰۰ لڑیاں ہو سکتی ہے، جو ۴۱۰۰۰ شکلوں میں موجود ہو سکتا ہے۔

کسی قدر الجبرا (لوکارتھم: Logarithms) استعمال کر کے ہم دیکھ سکتے ہیں کہ 10^{600} = ۴۱۰۰۰ اگر ۱۰ کو ۶۰۰ مرتبہ ضرب دی جائے تو جو ہندسہ حاصل ہو گا وہ ہے ۱ جس کے بعد ۶۰۰ صفر آئیں گے۔ یہ تعداد ہماری سمجھ سے بالاتر ہے۔

۴۱۰۰۰ برابر ہے 10^{600} کے۔ یہ تعداد ا کے ساتھ ۶۰۰ صفر شامل کر کے حاصل ہوتی ہے۔ جس طرح ۱۰ کے ساتھ گیارہ صفر ہوں تو یہ ایک ٹریلین بن جائے گا۔ ایک ایسا ہندسہ جس کے ساتھ ۶۰۰ صفر آئیں بیشک ایک ایسی تعداد ہے جسے سمجھنا مشکل ہے۔

اس مسئلے پر ارتقاء پسند Prof. Ali Demirsoy درج ذیل اعتراف کے لئے مجبور تھا:

دراصل ایک لحمیے اور ایک نیوکلیائی ترشے (DNA, RNA) کا الل ٹپ متشکل ہو جانا بعید از امکان نظر آتا ہے اور بہت کم ادراک میں آسکتا ہے۔ تاہم ایک خاص لحمیاتی زنجیر کے وجود میں آ جانے کے امکانات بے حد وسیع دکھائی دیتے ہیں۔

ان تمام عدم امکانات کے علاوہ ڈی این اے اپنی دوہری پیچیدہ زنجیری شکل کی وجہ سے کسی ردعمل میں بہت کم ملوث نظر آ سکتا ہے۔ اس سے بھی یہ بات ناممکن نظر آتی ہے کہ یہ زندگی کی بنیاد ہو سکتی ہے۔

مزید یہ کہ ڈی این اے صرف کچھ خامروں کی مدد سے نقش ثانی بنا سکتے ہیں جو واقعی لحمیے ہوں اور ان خامروں کی ترکیب و تالیف صرف ڈی این اے میں بذریعہ کوڈ شامل شدہ معلومات سے ہو سکتی ہے۔ یہ دونوں چونکہ ایک دوسرے پر انحصار کرتے ہیں اس لئے یا تو انہیں بیک وقت نقش ثانی بنانے ہوتے ہیں یا ان میں سے ایک کو دوسرے سے قبل ''تخلیق'' کیا جانا ہوتا ہے۔ ایک امریکی ماہر خورد حیاتیات جیکب سن اس موضوع پر یوں تبصرہ کرتا ہے:

منصوبوں کی تخلیق مکرر کے لئے مکمل ہدایات، توانائی، اور دستیاب ماحول میں کچھ حصوں کو علیحدہ کرنے، نشوونما اور بالیدگی، ترتیب اور موثر میکانکی عمل کے لئے کہ وہ ہدایات کو اس سمت منتقل کر سکیں جہاں سب کی بالیدگی کا سوال ہو، ان سب کو ساتھ ساتھ ایک وقت میں اس لمحے موجود ہونا چاہئے۔ (جب زندگی کی ابتداء ہوئی) واقعات کا یوں یکجا ہونا ناقابل یقین حد تک اتفاقیہ نظر آتا ہے اور اسے اکثر غیبی مداخلت کا نام دیا جاتا ہے۔

جیمز واٹسن اور فرانسس کرک نے جب ڈی این اے کی ساخت کے بارے میں انکشاف کیا تو اس کے دو برس بعد درج بالا حوالہ تحریر میں آیا تھا۔ مگر تمام تر سائنسی ترقی کے باوجود یہ مسئلہ ارتقاء پسندوں کے لئے لاینحل رہا۔ بات کو سمیٹتے ہوئے یہ کہا جائے گا کہ ڈی این اے کے لئے تخلیق مکرر کی ضرورت، اس کے لئے کچھ لحمیات کی موجودگی کی ضرورت اور ڈی این اے میں موجود معلومات کے مطابق ان لحمیات کی تخلیق مکرر ارتقاء پسندوں کے نظریے کو جڑ سے اکھاڑ پھینکتی ہے۔

دو جرمن سائنسدانوں جنکر اور شیرر (Junker and Sherer) نے اس کی وضاحت یوں کی کہ کیمیائی ارتقاء کے لئے جن سالموں کی ضرورت ہوتی ہے ان میں سے ہر ایک کی تالیف و ترکیب جداگانہ حالات کی متقاضی ہوتی ہے اور اس سارے مواد کے ترکیب پانے کا امکان، جس کے لئے نظری طور پر مختلف اکتسابی طریقے ہوتے ہیں، صفر ہے:-

اب تک کوئی بھی ایسا تجربہ ہمارے علم میں نہیں آیا جس میں ہمیں وہ تمام سالمے حاصل ہو سکیں جو کیمیائی ارتقاء کے لئے ضروری ہیں۔ اس لئے بہت موزوں حالات کے تحت مختلف جگہوں میں بہت سے سالمے پیدا کرنا لازمی ہے اور پھر ان کو ردعمل کے لئے ایک دوسری جگہ لے جانا ضروری ہوگا اور اس سارے عمل میں انہیں آب پاشیدگی اور ضیانخزی حرکت (Photolysis) جیسے ضرر رساں عناصر سے محفوظ رکھنا ہوگا۔

مختصر یہ کہ نظریۂ ارتقاء ان ارتقائی مراحل میں سے کسی ایک کو بھی ثابت نہیں کرسکا جو سالمی سطح پر پیش آتے ہیں۔

اب تک ہم نے جو کچھ کہا اس کا خلاصہ یہ ہے کہ نہ امینو ترشے نہ ہی ان کی پیداوار یعنی لحمیات جو جانداروں کے خلیے بناتے ہیں کسی بھی متذکرہ "قدیم کرۂ ہوائی" میں پیدا کئے جا سکتے ہیں۔ مزید یہ کہ وہ عناصر مثلاً ناقابل یقین حد تک پیچیدہ ساخت کے حامل لحمیات، دائیں ہاتھ والے، بائیں ہاتھ والے خدوخال اور "بیپٹائڈ ملاپ" تشکیل دینے کی مشکلات اس استدلال کا ایک حصہ ہیں کہ وہ مستقبل کے کسی بھی تجربے میں کیوں پیدا نہ کئے جاسکیں گے۔

اگر ہم ایک لمحے کے لئے یہ بھی فرض کرلیں کہ لحمیات کسی طرح اتفاقاً وجود میں آجاتے ہیں اس کا بھی کچھ مطلب نہ ہوگا کیونکہ لحمیات اپنے طور پر کچھ بھی نہیں ہوتے: وہ ازخود تخلیق مکرر نہیں کر سکتے۔ لحمیات کی ترکیب وتالیف تو صرف اس معلومات سے ہوتی ہے جو ڈی این اے اور آر این اے سالموں میں بذریعہ کوڈ پہنچائی جاتی ہے۔ یہ ناممکن ہے کہ ڈی این اے اور آر این اے کے بغیر

ایک لحمیہ تخلیق مکرر کر سکے۔

ان بیس امینو ترشوں کی وہ خاص ترتیب جو ڈی این اے میں کوڈ کی شکل میں پہنچائی جاتی ہے، انسانی جسم کے اندر ہر لحمیے کی ساخت کا تعین کرتی ہے۔ تاہم جیسا کہ ان تمام لوگوں کی طرف سے جنھوں نے ان سالموں کا تحقیقی مطالعہ کیا ہے پوری طرح واضح کر دیا گیا ہے کہ ڈی این اے اور آر این اے کے لئے ناممکن ہے کہ وہ اتفاقاً متشکل ہو گئے ہوں۔

تخلیق کی حقیقت

ہر شعبے میں نظریۂ ارتقاء کی موت کے ساتھ، آج شعبہ خورد حیاتیات میں کئی ایسے مشہور نام ہے جو تخلیق کی حقیقت کو تسلیم کرتے ہیں اور انہوں نے اس تصور کا دفاع شروع کر دیا ہے کہ ہر شے ایک خالق کی مرضی و منشا سے ایک اعلیٰ و ارفع تخلیق کے حصے کے طور پر تخلیق کی گئی ہے۔ یہ پہلے سے ہی ایک ایسی حقیقت ہے جسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ایسے سائنسدان جن کی اپنے کام تک کھلے ذہن کے ساتھ رسائی ہے، انہوں نے ایک ایسا نقطہ نظر اپنا لیا ہے جسے ''ذہانت آمیز نمونہ'' کہتے ہیں۔ نتیجہ اس قدر غیر مبہم اور اہم ہے کہ اسے تاریخ سائنس میں ایک اعلیٰ ترین کامیابی کے طور پر درجہ دیا جانا چاہئے۔ سائنس کی یہ کامیابی دس ہزار لوگوں کے حلق سے ''اوریکا'' (پالیا یا مل گیا، جو ارشمیدلیس کا نعرۂ مسرت تھا) کے نعرۂ مسرت کی آوازیں بلند کرے گی۔

مگر نہ تو کسی بوتل کا کارک کھلا ہے نہ ہی کہیں سے تالیاں بجنے کی آواز سنائی دی ہے۔ اس کے برعکس ایک متجسس پریشان کن خاموشی نے خلیے کی بے لچک پیچیدگی کو گھیر رکھا ہے۔ جب یہ موضوع عام لوگوں تک پہنچتا ہے، پاؤں زمین پر تیز حرکت میں آ جاتے ہیں، سانس معمول سے ہٹ کر مشکل سے آنا شروع ہو جاتا ہے، نجی سطح پر لوگ قدرے مطمئن ہو جاتے ہیں، بہت سے ظاہری صورت حال کو تسلیم کر لیتے ہیں اور اپنے سروں کو جنبش دیتے ہیں اور جو ہو رہا ہے اسے ہونے دیتے ہیں۔ سائنسی برادری اپنی حیرت انگیز دریافت کو حریصانہ گلے سے کیوں نہیں لگاتی؟ نمونے کے مشاہدے کو ذہانت کے دستانوں سے کیوں کنٹرول کیا جاتا ہے؟ مخمصہ یہ ہے کہ ہاتھی کے ایک طرف ''ذہانت آمیز نمونہ'' کا لیبل لگا ہوا ہے تو دوسری طرف ''خدا'' کا لیبل لگنا چاہئے۔

آج بہت سے لوگ تو اس بات سے بھی باخبر نہیں ہیں کہ وہ سائنس کے نام پر بجائے اللہ پر یقین کرنے کے، مغالطے کے ایک وجود کو سچ کے طور پر تسلیم کرنے لگ گئے ہیں۔ وہ جنہیں یہ جملہ

نہیں ملتا ''اللہ نے تمہیں عدم سے تخلیق کیا''، وہ سائنسی طور پر یہ یقین کر سکتے ہیں کہ اوّلین جاندار ان بجلی کے کڑکوں سے وجود میں آیا تھا جو کئی بلین برس قبل "Primordial soup" (بنیادی نائٹروگلیسرین) سے ٹکرائے تھے۔

جیسا کہ ہم نے اس کتاب کے کسی اور حصے میں اس بات کا ذکر کیا ہے فطرت یا 'نیچر' (Nature) میں توازنات اس قدر نازک اور نپے تلے ہیں اور تعداد میں اس قدر زیادہ ہیں کہ یہ دعویٰ کرنا کہ وہ ''اتفاقاً'' وجود میں آگئے تھے عقل و دانش کے خلاف محسوس ہوتا ہے۔ خواہ ان لوگوں کی تعداد کچھ بھی ہو جو اس غیر دانشمندانہ بات سے دور رہ سکتے ہیں آسمانوں اور زمین میں اللہ کی نشانیاں پوری طرح عیاں ہیں اور ان سے انکار کیا ہی نہیں جا سکتا۔

اللہ آسمانوں، زمین اور ان کے درمیان موجود ہر شے کا خالق ہے۔ اس کی ہستی کی موجودگی کی نشانیوں نے پوری کائنات کا احاطہ کر رکھا ہے۔

NOTES

1. A. Maton, J. Hopkins, S. Johnson, D. LaHart, M.Quon Warner, J.D. Wright, Human Biology and Health, Prentice Hall, New Jersey, P. 59
2. J.A.C. Brown, Medical and Health Encyclopaedia, Remzi Publishing, Istanbul, p.250
3. H.J. de Blij, M.H. Glantz, S.L. Harris, Restless Earth, The National Geographic Society, 1997, p.8
4. H.J. de Blij, M.H. Glantz, S.L. Harris, Restless Earth, The National Geographic Society, 1997, p.8
5. H.J. de Blij, M.H. Glantz, S.L. Harris, Restless Earth, The National Geographic Society, 1997, p.64
6. H.J. de Blij, M.H. Glantz, S.L. Harris, Restless Earth, The National Geographic Society, 1997, p.18-19
7. H.J. de Blij, M.H. Glantz, S.L. Harris, Restless Earth, The National Geographic Society, 1997, p.64
8. The Guinness Book of Amazing Nature, p.60
9. H.J. de Blij, M.H. Glantz, S.L. Harris, Restless Earth, The National Geographic Society, 1997, p.105
10. National Geographic, July 1988, p.29
11. Mesopotamia and Ancient Near East, Great Civilisations Encyclopaedia, Iletisim Publications, p.92
12. Ana Brittannica, Volume 20, p.592
13. H.J. de Blij, M.H. Glantz, S.L. Harris, Restless Earth, The National Geographic Society, 1997, p.18-19
14. Frederick Vester, Denken, Lernen, Vergessen, vga, 1978, p.6
15. George Politzer, Principes Fondamentaux de Philosophie, Editions Sociales, Paris 1954, pp.38-39-44
16. R.L. Gregory, Eye and Brain: The Psychology of Seeing, Oxford University Press Inc. New York, 1990, p.9
17. Lincoln Barnett, The Universe and Dr. Einstein, William Sloane Associate, New York, 1948, p.20
18. Orhan Hancerlioglu, Dusunce Tarihi (The History of Thought), Istanbul: Remzi Bookstore, 6.3d., 1995 September, p. 447
19. V.I. Lenin, Materialism and Empiriocriticism, Progress Publishers, Moscow, 1970, p.14
20. Bertrand Russell, ABC of Relativity, George Allen and Unwin, London, 1964, p. 161-162
21. R.L. Gregory, Eye and Brain: The Psychology of Seeing, Oxford University Press Inc. New York, 1990, p.9
22. Karl Pribram, David Bohm, Marilyn Ferguson, Fritjof Capra, Holografik Evren (Holographic Universe 1), translated by Ali Cakiroglu, Kuraldisi Publishing, Istanbul: 1996, p. 37
23. George Politzer, Principes Fondamentaux de Philosophie, Editions Sociales, Paris 1954, p.65
24. Orhan Hancerlioglu, Dusunce Tarihi (The History of Thought), Istanbul: Remzi Bookstore, 6.3d., 1995 September, p. 261
25. George Politzer, Principes Fondamentaux de Philosophie, Editions Sociales, Paris 1954, p.65
26. Paul Davies, Tanri ve Yeni Fizik, (God and the New Physics), translated by Murat Temelli, Im publishing, Istanbul 1995, p.180-181

27. Rennan Pekunlu, "Aldatmacanin Evrimsizligi", (Non-Evolution of Deceit), Bilim ve Utopya, December 1998, (V.I. Lenin, Materialism and Empiriocriticism, Progress Publishers, Moscow, 1970, p.334-335)
28. Alaettin Senel, "Evrim Aldatmacasi mi? Devrin Aldatmacasi mi?", (Non-Evolution of Deceit), Bilim ve Utopya, December 1998
29. Mektubat-i-Rabbani (letters of Rabbani), Vol II, 357. Letter, p. 163
30. Mektubat-i-Rabbani (letters of Rabbani), Vol II, 357. Letter, p. 1432
31. Francois jacob, Le Jeu des Possibles, University of Washington Press, 1982, p.111
32. Lincoln Barnett, The Universe and Dr. Einstein, William Sloane Associate, New York, 1948, pp. 39-40
33. Lincoln Barnett, The Universe and Dr. Einstein, p. 12
34. Lincoln Barnett, The Universe and Dr. Einstein, p. 40
35. Paul Strathern, The Big Idea: Einstein and Relativity, Arrow Books, 1997, p.57
36. Lincoln Barnett, The Universe and Dr. Einstein, p. 67
37. Lincoln Barnett, The Universe and Dr. Einstein, p. 12
38. Charles Darwin, The Origin of Species: A Fasimile of the First Edition, Harvard University Press, 1964, p.189
39. Derek A. Ager. "The Nature of the Fossil Record". Proceedings of the British Geological Association, vol. 87, no. 2, (1976), p. 133.
40. T.N. George, "Fossils in Evolutionary Perspective", Science Progress, Vol.48, (January 1960), p.1-3
41. Richard Monestarsky, Mysteries of the Orient, Discover, April 1993, p.40
42. Stefan Bengston, Nature 345:765 (1990)
43. Earnest A. Hooton, Up From The Ape, New York: McMillan, 1931, p.332
44. Stephen Jay Gould, Smith Woodward's Folly, New Scientist, 5 April 1979, p.44
45. Charles E. Oxnard, The Place of Australopithecines in Human Evolution: Grounds for Doubt, Natura, No. 258, p. 389
46. Richard Leakey, The Making of Mankind, London: Sphere Books 1981, p.116
47. Eric Trinkaus, Hard Times Among the Neanderthals, Natural History, No.87, December 1978, p.10. R.L. Holoway, "The Neanderthal Brain: What was Primitive?", American Journal of Physical Anthropology Supplement, No.12, 1991, p.94
48. Ali Demirsoy, Kalitim ve Evrim (inheritance and Evolution), Ankara: Meteksan Yayinlari 1984, p.61
49. Ibid.
50. Fabbri Britannica Science Encyclopaedia, Vol. 2., No.22, p. 519
51. Kevin McKean, No.189, p. 7
52. Frank B. Salisbury, "Doubts about the Modern Synthetic Theory of Evolution", American Biology Teacher, September 1971, p. 336
53. Ali Demirsoy, Kalitim ve Evrim (Inheritance and Evolution), Ankara: Meteksan Publishing Co., 1984, p. 39
54. Homer Jacobson, "Information, Reproduction and the Origin of Life", American Scientist, January 1955, p.121
55. Reinhard Junker & Siefried Scherer, "Entstehung Gesiche Der Lebewesen", Weyel, 1986, p.89
56. Michael J. Behe, Darwin's Black Box, New York: Free Press, 1996, Pp. 232-233.

THE TRUTH OF THE LIFE OF THIS WORLD

ادارہ اسلامیات
پبلشرز، بک سیلرز، ایکسپورٹرز

★ ـــــ دینا ناتھ مینشن، مال روڈ، لاہور
فون ۷۲۴۴۴۱۲، فیکس ۷۲۴۲۷۸۵-۴۲-۹۲

★ ـــــ ۱۹۰، انارکلی، لاہور، پاکستان
فون ـــــ ۷۲۳۳۹۹۱ - ۷۲۵۳۲۵۵

★ ـــــ موہن روڈ
چوک اُردو بازار، کراچی فون ۷۷۲۲۴۰۱

E-mail: islamiat@lcci.org.pk
idara@brain.net.pk